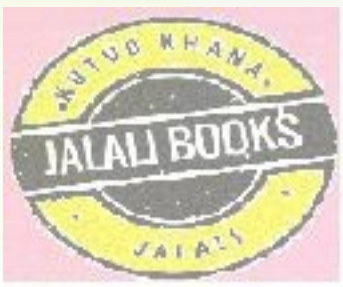


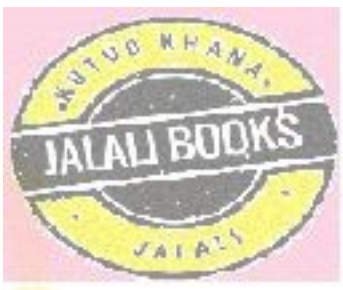


افتقار سے افق تک



افق سے افق تک





کتابیں
قومی
وقار
کی
بنیاد
ہیں

میری
لائبریری

افق سے افق تک

۱ رہپور تاڑ

۳ ڈرامے

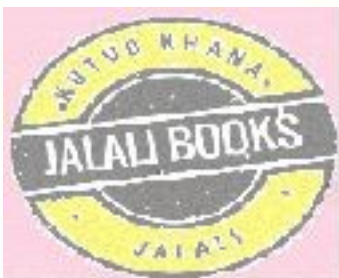
۶ افسانے

۱ ناولٹ

آغا اشرف



چوک مینار انارکلی لاہور - ۸



جملہ حقوق بحق بشیر احمد چودھری محفوظ

پہلی بار میری لائبریری ہی میں

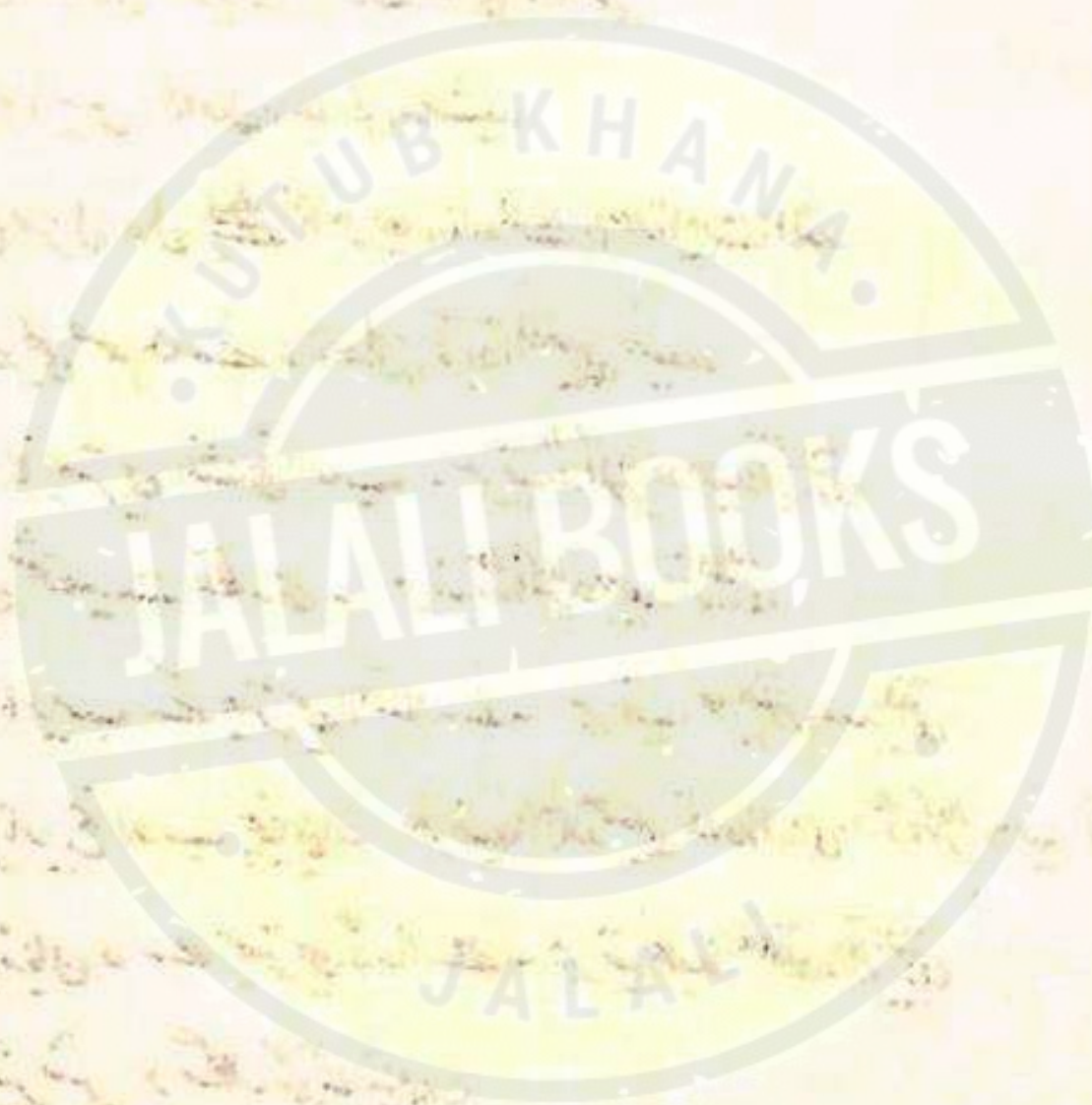
ناشر: بشیر احمد چودھری ڈائریکٹر میری لائبریری لاہور

طابع: پاکستان ٹائمز پریس لاہور

بار اول ————— ۱۹۶۴



ڈیڈ وڈارلنگ، اپنی بیوی کے نام
جس کی موت میری زندگی کا سب سے
بڑا انقلاب ہے۔



میری لائبریری میں ادب و افسانہ کی دوسری کتابیں

دراہ - منشی پریم چند

بابر خاطر - ابوالکلام آزاد

دیوان غالب - مطابق متن عرشی

کلیات غالب - فارسی دیوان مرتبہ وزیرالحسن عابدی

لذتِ آوارگی (دیوان) اسے، ڈی، انظر

پتھر کا دیس (ناول) عادل رشید

منزل منزل دل بھلے لگا (چار ناولٹ) عنایت اللہ

میرے بھی صنم خانے (ناول) قرۃ العین حیدر

اردو کا بہترین انشائی ادب - مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

بہترین شخصیت نگاری - مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی

میرزا ادیب کے بہترین افسانے - مرتبہ عرش صدیقی

مختصر تاریخ ادب پنجابی - مرتبہ احمد حسین قلعدار، ڈاکٹر وحید قریشی

پنجابی زبان دے بہترین ڈرامے - مرتبہ عبدالغفور قریشی

شیر شیر شیر (شکار کی کہانیاں)

ادب کا تنقیدی مطالعہ - ڈاکٹر سلام سندیلوی

اندیشہ شہر - احمد جمال پاشا

روپ مٹی - سید فیاض حسین

سلطانی محلوں کے راز - جمال پاشا - عبدالرزاق علی آبادی

زندگی کے موڑ پر - چالیس سچی کہانیاں

فاصلے - سیدہ عفرانجاری
ندیم کے بہترین افسانے، مرتبہ مظفر علی سید
ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ، سلمیٰ عنایت

جلد ۱۰

۱۲۶ - نیکو نیکو نیکو نیکو - روائت

۱۲۷ - حسنہ حسنہ حسنہ - روائت

۱۲۸ - حسنہ حسنہ

۱۲۹ - حسنہ حسنہ

۱۳۰ - حسنہ حسنہ

ترتیب

رہ پورتناژ

حرف اول - ڈاکٹر وحید قریشی، ۷

دل و یاد داغ نیا، ۹

ڈرامے

حرف اول - سید امتیاز علی تاج، ۱۴۵

۱۴۷ - ربط

۲۰۳ - جادو

۲۳۷ - چھ فنکار

افسانے

حرفِ اول - مولانا صلاح الدین احمد، ۲۶۴

حرفِ اول - عبدالمجید سالک مرحوم، ۲۶۵

آم کی گھٹلی، ۲۶۶

آرک لائٹ، ۲۶۷

ایک کے بعد ایک، ۲۸۶

گل رخ، ۳۰۱

موم بتی، ۳۰۹

دلربا، ۳۱۷

ناولٹ

حرفِ اول - اشفاق احمد، ۳۵۴

ریشم کا کپڑا، ۳۵۵

پرستار - پاکستان ٹائمز پبلیشنگ ہاؤس ★ پبلشرز بشیر احمد چودھری

حرف اول

”افق سے افق تک“ آغا اشرف کے تین ڈراموں، سات افسانوں،

ایک رپورٹ تاثر اور ایک ناولٹ کا مجموعہ ہے۔ آغا صاحب اردو اور پنجابی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ ایک منجھے ہوئے ایکٹر اور سلجھے ہوئے ریڈیو آرٹسٹ ہیں۔ انھوں نے ڈرامے کے فن کو محض علم کتابی کے طور پر حاصل نہیں کیا بلکہ ڈرامے کی تکنیکی ضروریات اور خصائص کو خود برت کر دیکھا ہے۔ اس مجموعے میں ان کے تین ریڈیو ڈرامے ہیں اور تینوں میں انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ریڈیائی ڈرامے کی پابندیوں اور مفاہمتوں کو پیش نظر رکھا ہے۔ ریڈیائی ڈرامے کی کامیابی کا انحصار کرداروں کی حرکات و سکنات پر نہیں بلکہ تمام تر مکالموں پر ہے۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک ان کا سب سے کامیاب ڈرامہ ”چھ فنکار“ ہے۔ ”بربط“ میں انہوں نے یونانی علم الاضنام کی Theme کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور یونانی ڈرامے کی فضا اور خطابت کو محبت کی تمثیلی حیثیت میں اجاگر کرنے کے لئے استعمال کیا ہے عشق و محبت کو وہ رومانی سطح پر لا کر دیکھتے ہیں اور انسانی ترقی کے مختلف مدارج کو انھوں نے آرفیوس کے آسمانی سفر کے استعارے کی شکل میں چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ”جادو“ نسبتاً کمزور ڈرامہ ہے اور اس کی کمزوری کا سبب ڈرامے کے لوازم سے بے اعتنائی نہیں ہے بلکہ شاعر کے کردار کا جذباتیت آمیز اظہار ہے۔ ”جادو“ کا یہی مرکزی کردار ان کے رپورٹ تاثر ”دل ویا داغیا“

میں بھی پایا جاتا ہے۔ جاو میں آغا صاحب نے ایک جیب تراش سوئے ہوئے شاعر کو بیدار کرنے کی کوشش کی تھی وہی ادیب اور شاعر ”دل دیا داغ لیا“ میں زیادہ بہتر روپ میں رونما ہوا ہے لیکن اس کہانی میں بھی اس کی جذباتیت آخر میں آکر ایک وحشتناک رخ اختیار کرنے لگتی ہے لیکن فنکار یہاں اپنے کردار سے مغلوب نہیں ہوتا بلکہ مولسری کے درخت کی تمثیل اس کہانی کو ایمانی شکل دے دیتی ہے۔ آغا اشرف کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ اس رپورٹاژ کو ایک صحافتی رواد نہیں بنا دیتا۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جہاں وعظ و نصیحت کے ذرا طویل ہو کر صحافت بن جانے کا کلی امکان تھا خصوصاً پاکستان کے موجودہ دور کے تجزیے میں اور بعض زندہ امثال کو گرفت میں لینے سے ہر موقع پر اس کا امکان تھا۔ آغا اشرف ایسے مقامات پر دامن بچا کر نکلنے کی کوشش کرتے اور نہایت ہزمندی اور فنکاری کا ثبوت دیتے ہوئے آگے گزر جاتے ہیں۔

”افق سے افق تک“ میں آغا اشرف صاحب کے چھ افسانے بھی شامل ہیں۔ جن میں وہ بہت کچھ منٹو کے قریب ہیں۔ خصوصاً ”موم بتی“ میں ان کی افسانوی صلاحیتیں پوری طرح بروئے کار آئی ہیں۔ وہ افسانوں میں بھی ڈرامائی کیفیتیں پیدا کر کے قاری کے لئے افسانے کے تاثر کو آسانی سے قابل قبول بنا دیتے ہیں۔

آغا اشرف کی ادبی تربیت کا دور میگوں احمد اسکر وائلڈ کے زیر اثر وجود میں آنے والی رومانی تحریک سے لے کر منٹو کی بے رحم حقیقت پسندی تک پھیلا

ہوا ہے۔ اور اس کے نشانات ان کی تحریر میں نظر آتے ہیں۔ آغا صاحب کے اسلوب میں روانی اور مکالموں میں زور ہے۔ ان کے تجربات میں زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا انوکھا شعور رکھتے ہیں۔ جس سے ان کی نگارشات خاصے کی چیز ہو گئی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آغا صاحب فرضی اور مصنوعی ماحول کی بجائے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھتے ہیں۔ دور حاضر کے مسائل پر اس قدرت اور اعتماد سے شاید ہی کسی افسانہ نگار نے لکھا ہو۔ میں آغا صاحب کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتا ہوں۔

ڈاکٹر وحید قریشی

۱۳/۷/۶۴

۲۶۹ - این

سمن آباد - لاہور

JALALI BOOKS

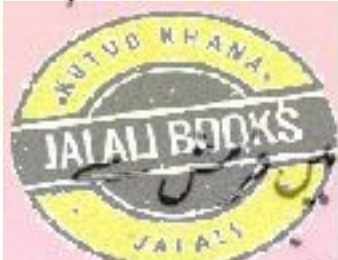
JALALI

”میرمی لا بُریری — کی
کتابوں کی اشاعت و انتخاب میں جو سلیقہ
اور خوبصورتی دکھائی دیتی ہے — وہ
دوسروں کے ہاں خال خال ہے!“
میاں بشیر احمد

دل دیا داغ لیا

میرے دل میں ایک داغ ہے۔

جب میں اُسے دل کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ تو یہ دھرتی، یہ سمندر، یہ آسمان مجھے اس کے مقابلے میں چھوٹے سے نظر آتے ہیں۔ اور وہ ویرانی وہ اداسی جو اس میں ہے۔ شاید ہی دنیا کے کسی ہولناک سے ہولناک ویرانے میں ہو۔ اس داغ کی ایک بڑی ہی دردناک داستان ہے۔ ایک بڑی ہی المناک کہانی ہے۔ جو ایک بستی سے شروع ہوتی ہے اور وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ نئی بستی ہے۔ اس کا نام۔ میرے سطحی اندازے کے مطابق اس بستی میں پانچ چھ ہزار مہاجر بستے ہیں۔ بڑی گنجان ہے اس کی آبادی جسے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی حصہ اور مغربی حصہ مشرقی حصے میں پرانے مکان ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے دھائے ہیں جن میں عیال دار لوگ بھرتی کی طرح کچے ہوئے ہیں۔ کھچا کچھ بھرے ہوئے ہیں۔ پہلی منزل میں اگر نا بنائی رہتا ہے تو دوسری منزل میں منیاری پیچنے والے کا ڈیرہ ہے۔ تیسری منزل میں پنواڑ می گھسٹا ہوا ہے تو چوتھی منزل کھار کے پاس ہے۔ اس کمرے پر موجی کا قبضہ ہے تو اس کمرے میں کوئی چپڑا اسی جھنڈے گاڑے بیٹھا ہے۔ اور زندگی کے سارے دھندلے اسی کمرے میں ہو رہے ہیں۔ وہیں کھانا پکانا وہیں نہانا دھونا۔ ٹیٹی پیشاب کے لئے بھی اس کمرے کے سوا اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ رات کے وقت چار پائیاں ایک دوسری میں ٹھونس



ٹھانس کر وہیں بچھا دی جاتی ہیں۔ اور صبح کو اٹھا کر وہیں کسی کو نے لے کر چھت تک ان کا مینار سا بنا دیا جاتا ہے۔ اگر وہاں کھرا دغیرہ ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر نہیں ہے تو کسی دیوار میں شگاف کر کے نالی بناتے ہوئے چھٹی بڑی اینٹیں جوڑ توڑ کر وہاں کھرا بنا لیا گیا ہے۔ جس کا گندا پانی یا تو اس پاس کی دیواروں میں دھنستے ہوئے سیلن، کھٹل، پتو اور کچھر پیدا کرتا ہے۔ اور یا پھر کسی چھجے یا روئس پر بہہ کر اس کے آنگن میں یا باہر گلی میں آبشار کی طرح گرتے ہوئے راہ گیروں کا ناطقہ تنگ کرتا ہے۔ آنے جانے والے کھپلتے ہیں۔ چھینٹوں سے ان کے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ وہ شور مچاتے ہیں۔ باتیں بناتے ہیں۔

کئی کمرے روشن دان نہ ہونے کی وجہ سے دھوئیں سے کالے ہو رہے ہیں۔ ان کی چھتوں سے دھوئیں اور لکڑی کے جالے لٹک رہے ہیں۔ تازہ ہوا کی آمد و رفت کے لئے دروازے کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہونے کی وجہ سے ان میں گھٹن سی پیدا ہو رہی ہے۔ سانس لینا دشوار ہو رہا ہے۔ مگر وہاں رہنے والے ہیں کہ نہ جانے کیسے سانس لئے جا رہے ہیں۔ کیسے جی رہے ہیں۔ کئی کمروں کی دیواریں برسوں سے مرمت اور سفیدی نہ ہونے کے باعث اپنا آپ چھوڑ رہی ہیں۔ ان کا پیسٹرا کھڑتا جا رہا ہے۔ نیچے سے اینٹیں نکل رہی ہیں۔ کوئی اٹھ رہی ہے۔ جا بجا دریں پڑی ہوئی ہیں۔ چھیکلیوں اور چوہوں نے سوراخ نکالے ہوئے ہیں۔ اور جو فرش دیکھو تو وہ بھی ویسا ہی مٹی سے اٹا ہوا۔ جا بجا پان کی پکیوں کے نشان۔ چکنا ہٹ کے دھبے۔ چوہوں نے اور



کوٹے سے کچھی ہوئی لکیروں کے کیڑی کاڑے۔ کہیں برتن بکھرے ہوئے ہیں۔
 کھانے پینے کی چیزوں پر مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ اڑوس پڑوس کی بلیاں ضیافت
 اڑا رہی ہیں۔ برتنوں میں کبھی منہ کبھی پنچے کبھی دم چلا رہی ہیں۔ کہیں میلے کچیلے
 پارچات کے ڈھیر لگے ہیں۔ کہیں ننھا بیٹھا موت رہا ہے۔ ٹٹی کر رہا ہے۔
 چولہے کی راکھ سے لت پت ہو رہا ہے۔ غل غپاڑہ کر رہا ہے۔ موت میں
 ٹانگیں چلا کر چھینٹیں اڑا رہا ہے۔ کپڑے بس رہے ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں
 لٹھڑ رہی ہیں۔ عجیب ابتری نظر آتی ہے۔ اس کوٹے میں ایندھن پڑا ہے۔
 اُس کوٹے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر لگا ہے جس میں سبز یوں کے پھلکے، بچی
 کچھی باسی روٹیوں کے ٹکڑے، چھان بُرا، ننھے کاگوٹ موت، بلبے چھوڑنا
 باسی سالن، ردی کا غذا، گھاس بھوس اور چیتھڑے دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہیں
 ناک سنکا جاتا ہے۔ وہیں تھوکا جاتا ہے۔ کھانس کھنکار کر بلغم کے تھوبے بھی
 وہیں تھوپے جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں مل جل کر سڑتے گلتے ہوئے بڑی ہی
 بھیانک باس پیدا کر دیتی ہیں۔ جس سے طبیعت خواہ مخواہ الٹا لگتی ہے۔
 ۱۹۴۷ء میں ملک کے بٹوارے پر گڑبڑ ہوئی تو اس لستی کے کافی مکان
 جل جلا کر ٹوٹے پھوٹے ڈھارے بن گئے۔ گھنڈ بن گئے۔ کچھ تو بارشوں،
 آندھنیوں، زلزلوں سے زمین کے ساتھ زمین ہو گئے اور کچھ ابھی تک اسی حالت
 میں موجود ہیں۔ کسی کی اگل دیوار نہیں ہے۔ کسی کی پچھلی دیوار نہیں ہے۔ کسی کی
 دیواریں تو جوں کی توں موجود ہیں مگر چھتیں غائب ہیں۔ دروازے اور کھڑکیاں نہیں
 ہیں۔ سیڑھیاں نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو اب انہیں سیڑھیاں نہیں بلکہ صراط کہا

کہا جاسکتا ہے۔ جہاں سے گزرنے کے لئے اگر دفتر عمل ساتھ نہ ہو تو دل گھول
کا ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ سیڑھیاں اوپر یا نیچے لیجانے کی بجائے
کہیں اور بھی لے جاسکتی ہیں۔ ان پر چڑھنے یا اترنے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے
کہ ان زینوں سے پرے کیا ہے؟ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ زینے کدھر جاتے ہیں؟
ان ڈھاروں میں لکڑی یا اس سے بنی ہوئی کسی شے کا اب کوئی نشان
نظر نہیں آتا۔ کچھ لکڑی تو شعلوں سے جل جلا کر راکھ ہو چکی۔ کچھ انسانوں اور ڈنگر
ڈھاروں کی لاشوں کو جلانے میں مرگھٹ میں کام آئی۔ اور بچی کھچی لکڑی لٹ
پٹ کر آنے والے مسافروں نے ٹھٹھری یخ راتوں میں جلا کر آگے تاپی۔ اب
وہاں لکڑی کہاں۔ البتہ ان شعلوں کے نشان ابھی تک باقی ہیں۔ جو آج سے
پندرہ سال پہلے نہ جانے کیا کیا جلا کر بجھے تھے۔ بجھائے گئے تھے۔

ان ڈھاروں کی کئی چیزیں، کئی حصے تو ایسے ہیں، جو ان میں بسنے والوں
کی زندگی کے لئے مستقل خطرہ ہیں۔ مثلاً لوہے کے ٹیڑھے میڑھے گاڑ در۔ نیچے
کو جھکی ہوئی مٹیاں اور منڈیر۔ آدھی غائب آدھی موجود جھپٹیں۔ اور جھبھولتی جھالتی
وہ دیواریں جو ابھی تک ہوا میں معلق نظر آتی ہیں۔ وہ جہاں تھیں ابھی تک وہیں
کھڑی ہیں۔ مگر بے ستوں۔ بے سہارا۔ انھوں نے ہوا کو پکڑ رکھا ہے یا
ہوا نے ان کو پکڑا ہوا ہے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ان ڈھاروں کے چھوٹے چھوٹے رخنوں میں، شگافوں میں توپیلوں، کبوتروں
اور ابا بیلوں کے گھونسلے ہیں۔ اور بڑے شگافوں میں انسانوں کے گھونسلے۔
ان کھنڈروں میں آسیب اور پرندے ہی نہیں انسان بھی بستے ہیں۔ جن پر کہیں

تو ہوا میں معلق کوئی ٹوٹی پھوٹی منڈیر، مٹی یا چھت موت بن کر لٹک رہی ہے۔
اور کہیں یہ موت سے لٹکتے نظر آتے ہیں۔ بے ستون۔ بے سہارا۔ زندگی
سے بہت دور۔ موت سے بہت قریب۔ مگر زندگی اور موت دونوں
سے بے نیاز۔ بے پردہ۔ بے فکر۔ مینہ آئے یا آندھی۔ چلچلاتی دھوپ
ہو یا کڑکتے جاڑے ہوں۔ یہ کھلے آسمان تلے یونہی پڑے رہتے ہیں۔ اور
اپنے ماضی مستقبل کے سینے دیکھتے ہوئے سوچا کرتے ہیں۔ یہ رات کب
کٹے گی؟ سویرا کب ہوگا؟ کون جانے یہ کس سویرے کا انتظار کر رہے ہیں۔
ان ڈھاروں سے کبھی کسی ساز کسی باجے کی آواز نہیں آتی۔ نہ ان میں کبھی
ڈھولک بجتی ہے۔ نہ گیت گائے جاتے ہیں۔ نہ چوڑیاں جھینکتی ہیں۔ نہ پائس
کے چھناکے سنائی دیتے ہیں۔ نہ کبھی کسی کے بولنے کی آواز آتی ہے نہ ہنسنے
کی۔ البتہ اس سناٹے میں کبھی کبھی رونے اور بین کرنے کی آوازیں ضرور سنائی
دیتی ہیں۔ اور یا پھر برسات کے دنوں میں جب کالے، کالے بادلوں سے سمندر
برستے ہیں تو ان سے یکدم ایک قیامت خیز شور اور مہیب چیخیں اٹھا کرتی
ہیں۔ ڈھارے کا کوئی حصہ دھڑام سے زمین پر آجاتا ہے۔ کنبے کے سارے
لوگ بلے کے نیچے دب جاتے ہیں۔ کچھ تو اسی دقت وہیں سرد ہو جاتے ہیں۔
کچھ زخموں سے سسکتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ نظر ہی نہیں آتے۔ کچھ نہ نہیں
چلتا کہ بلے کے اس پہاڑ تلے کون کون کہاں کہاں پڑا ہے، اور اس پر کیا بیت
گئی ہے۔

اس بستی کے مغربی حصے میں تھوہڑوں کا ایک سمندر ہے۔ جس کے طول و عرض

میں مٹی گارے گھاس پھوس کے جھونپڑے بڑی دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جن میں غریب و مزدور لوگ رہتے ہیں۔ محنت کش لوگ رہتے ہیں۔ یہ جھونپڑے ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ پاس پاس کچھ اس طرح بنے ہوئے ہیں کہ تیز و تند آندھی میں بھی ہوا کا کوئی جھونکا کبھی ان میں سے نہیں گزرا، اور سورج کی روشنی کا بھی یہی حال ہے۔ بے شمار جھونپڑے ایسے ہیں کہ پوری شدت سے چمکتے ہوئے سورج کی کوئی کرن کبھی ان میں داخل نہیں ہوئی۔ ان میں کبھی کوئی سویرا نہیں جاگا۔ کبھی کوئی اجالا نہیں ہوا۔ ہمیشہ گرا اندھیرا چھایا رہتا ہے۔ جس میں ٹٹماتے دیوؤں کی روشنی سک سک کر دم توڑ جاتی ہے۔ خدا کی ایک مخلوق اسی اندھیرے میں جسے جا رہی ہے۔ اس مخلوق کے اندر بھی اندھیرا ہے اور باہر بھی اندھیرا۔ اس مخلوق نے اندھیرے ہی سے جنم لیا ہے۔ اندھیرے ہی میں لہو پھونکتے اور کھانستے ہوئے سوکھ سوکھ کر مر جاتی ہے۔ اس مخلوق نے اندھیرے کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ ایک اندھیرے سے دوسرے اندھیرے تک روشنی کا راستہ بنانے کی کوشش میں دیئے جلاتے اور ان کو بجھاتے ہوئے ہی ان کی عمر گزر جاتی ہے۔ مگر روشنی کا کوئی راستہ نہیں بنتا۔ یہ لوگ اپنے منظر و پس منظر میں خود فریبی کے سراب بنائے چلے جاتے ہیں۔ گزے بیتے لمحوں کی لکیریں پٹیتے رہتے ہیں۔ یہ لکیریں ان کی قسمت کی لکیریں ہیں، ان کی زندگی کا گورکھ دھندا۔

یہ لوگ رات دن کام کرتے ہیں۔ محنت و مزدوری کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی تنگے بھوکے رہتے ہیں۔ کھانے کو انہیں روٹی نہیں ملتی۔ پہننے کو کپڑا نہیں

مٹا۔ آمدنی کم ہے۔ عیال داری زیادہ ہے۔ کئی لوگ ان میں ایسے ہیں جنہیں
بیکاری نے بوکھلایا ہوا ہے۔ وہ کوئی کام کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انہیں کہیں
کوئی کام نہیں ملتا۔ ہنگامی کار زمانہ ہے، کریں تو کیا کریں۔ جائیں تو کدھر جائیں۔
بڑھیا قسم کا آٹھا ایک روپے دو آنے کا دوسیر اور گھٹیا قسم کا آٹھ سائی سیر۔ مگر
ان دونوں قسموں میں ملاوٹ۔ کوئی چیز بھی تو ملاوٹ سے خالی نہیں۔ انسانوں
کی روح اور غمیر میں بھی ملاوٹ ہو چکی ہے۔ اشیائے خورد و پی کے ساتھ انسانی
قدروں کو بھی زندگی کے ترازو میں پائسنگ رکھ کر کھوٹے بٹوں سے تولایا جا رہا
ہے۔ اگر یہ انقلابی حکومت وجود میں نہ آتی تو خدا جانے کیا قیامت آجاتی موجودہ
حکومت نے چیزوں میں ملاوٹ کرنے اور انہیں ہنگامی بیچنے والوں کے لئے
مناسب سزائیں تجویز کرتے ہوئے پانچ کروڑ انسانوں کے جسم پر رستے
ہوئے گھنٹاؤں نے ناسور کا شانی علاج کیا ہے۔ مگر پھر بھی کئی ایسے ہیں جو ابھی
تک چھپ چھپا کر شروع ہیں۔ دودھ میں پانی۔ گھی میں چربی اور تیل۔ آٹے
میں مٹی چوننا اچھی خاصی مقدار میں ملایا جا رہا ہے۔ انسانوں کو کھلایا جا رہا ہے۔
اور چور بانڈاری بھی کسی نہ کسی چھپر میں ابھی تک چل رہی ہے۔ منافع خور اب
بھی ناجائز منافع لینے سے گریز نہیں کرتے۔ دودھ دس آنے سیر۔ گوشت
کبھی ساڑھے تین کبھی چار روپے سیر۔ آلو آٹھ آنے سیر۔ گوہی کا پھول چھوٹے
سے چھوٹا دس بارہ آنے میں۔ اتنا سا ایک پایہ ایک آنے میں کبھی دھنیا پایہ
وغیرہ سبزی خریدنے پر دکاندار سے جھونگے میں مل جاتا تھا۔ ایک آنے کا
کڑوا تیل، مرچیں، ہلدی لینے جاؤ تو کریانے والا مذاق اڑاتا ہے۔ سیدھے مٹے

بات نہیں کرتا۔ ناک سے اس کے بھپو گرتے ہیں۔ کوئی حد ہے ہنگامی کی۔
کمانے والا ایک اور کھانے والی لام ڈوری۔ گھر کی گھاگرا پٹن۔ چکی چولہے کا
مسئلہ ایک بہت بڑی مصیبت بنا ہوا ہے۔ راشن کے ریلے کہیں رکنے نہیں
دیتے۔ ادھر لاؤ ادھر ختم۔ بھوک نہیں مٹتی۔ پیٹ پورے نہیں ہوتے۔ ایک
روٹی نہ جانے کتنے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ایک پاؤ دال اور اس میں دوسرے
پانی۔ پھر بھی دوسرے نہیں نکلتے۔ سالن کی جگہ نمک مرچ پانی میں گھول کر نوالے
لئے جاتے ہیں۔ پیاز اور لہسن کی چٹنی بنا کر روکھی چاٹی جاتی ہے۔ کسی نہ کسی
طرح بھوک کو مٹانا ہے۔ مگر بھوک تو شاید پیٹ کے اندر چھپا ہوا جھلاوا
بن گئی ہے۔ ڈائن بن گئی ہے۔ بس ہر وقت کھانے کو مانگے جاتی ہے۔
بچے خالی ہنڈیا اور چھپے چاٹ کر رہی سہی کسر کو پورا کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ بڑے ایک لقمہ اور اس کے ساتھ دو گھونٹ پانی پی کر بھوک کے
جھلاوے کو چھلنا چاہتے ہیں۔ مگر بھوک انہیں چھل جاتی ہے۔

کوئی حد نہیں ہے ہنگامی کی۔ اور ستم پستم تو یہ ہے کہ چیزیں جتنی ہنگامی
ہیں اتنی ہی ناقص ہیں۔ کئی فنکار تو ایسے ہیں کہ جانوروں کے کھاجے بھاک کو
مرچوں کا رنگ دے کر انسانوں کو کھلا رہے ہیں۔ اپنی فنکاری کے جوہر
دکھا رہے ہیں۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ جراثیم زیادہ خطرناک ہیں یا ایسے انسان؟
کیڑے کا یہ عالم ہے کہ دکانیں ہر قسم کے کیڑے سے بھری ہوئی ہیں۔ ملکی
میں اب اچھے سے اچھا کیڑا لاکھوں گانٹھوں اور تھانوں کی مقدار میں تیار
کر رہی ہیں۔ مگر کیڑا ہے کہ سستا نہیں ہوتا۔ منافع نور آڑھتی اُسے گندل سے

نہیں فٹوں سے ناپ رہے ہیں۔ پیوند لگی اس زندگی میں دن رات اور نئے
پیوند لگاتے ہوئے خود کو فریب دے لینا تو اتنا مشکل نہیں مشکل کا احساس
تو اس وقت ہوتا ہے۔ جبکہ سامنے دھری ہوئی لاش کو ڈھانپنے کے لئے
کم سے کم ایک روپے چار آنے گز بکتے ہوئے لمٹھے کی ضرورت پڑتی ہے۔
یہ لوگ بڑی مشکل میں ہیں۔ بڑی مشکل سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ
پال رہے ہیں۔ تن ڈھانپ رہے ہیں۔ یہ گھاس بھوس مٹی گارے کہ اس رکے
رکے کھتے کھتے سمندر میں غوطے کھاتے ہوئے کبھی ڈوب رہے ہیں کبھی ابھر
رہے ہیں۔ مگر کوئی موج ایسی نہیں آتی جو انہیں اس مردہ سمندر سے اٹھا کر کنارے
تک لے جائے۔ اس سمندر سے کوئی جوار بھاٹا جنم نہیں لیتا۔ اس سمندر کا کوئی
ساحل نہیں ہے۔

ان جھونپڑوں سے بہتا ہوا گندہ پانی نکاس کا کوئی راستہ نہونے کے
سبب ادھر ادھر پھیل کر جا بجا کیچر کی دلدلیں بناتا گرگڑھوں میں اکٹھا ہو جاتا
ہے۔ اور مہینوں ان میں پڑا سڑتا گلتا رہتا ہے۔ سڑا نہ پیدا کرتا ہے۔ وبائی
بیماریوں کے جراثیم پیدا کرتا ہے۔ ہیضہ، چیچک، ڈائریا، پچش اور تپ دق
تو اس بستی کی سوغات ہیں۔ متعدی بیماریاں اس کی مٹی میں ملی ہوئی ہیں۔ اس کی
ہوا میں گھلی ہوئی ہیں۔ ان جھونپڑوں میں رہنے والے پچیس فیصد لوگ مرض دق
میں مبتلا ہیں۔ وہ ہر وقت کھانس رہے ہیں۔ اموقوق رہے ہیں۔ بنجارے
ان کا جسم ہر وقت تپتا رہتا ہے۔ نہ تازہ ہوا نہ سورج کی روشنی۔ اور نہ صاف
سمندر ماحول۔ پچیس فیصد زر و دھیرے۔ کھوکھلے ڈھانچے۔ دیمک لگے پتھر۔

مدقوق ردھیں ان جہانیم آلود اندھیروں اور گندگی کے ڈھیروں میں
مجبور ہیں۔

ان جھونپڑوں میں زیادہ تر گوالے، گھسیارے، چرواہے، کوچیان اور
شتربان رہتے ہیں۔ اور یا پھر حالات و واقعات سے مجبور وہ سفید پوش لوگ
جو مکانوں کی کمی کے باعث مناسب کرائے کا کہیں مکان نہ مل سکنے کی وجہ
سے ایسی ہی کسی شام لاٹ میں چھپرا پھرا بنا کر وقت کاٹنے پر مجبور ہو جاتے
ہیں۔ ان میں کئی لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں باوجود مہاجر ہونے کے کوئی مکان
الاٹ نہ ہو سکا۔ اور وہ بنا بنا یا کوئی جھونپڑا کسی سے خرید کر، گپڑی دے کر،
یا خود اپنا جھونپڑا بنا کر اس میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ جیسے کہ ٹوٹے ہوئے
ڈھاروں کے رہنے والے۔ یہ بستی بڑی گندی ہے۔ گندی و غلیظ بستی۔ اس
میں حد سے زیادہ گندگی ہونے کی وجہ وہ مویشی اور پالتو جانور بھی ہیں۔ جو
اپنے رکھوالوں کے ساتھ ہی ان جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ مرغیاں، کبوتر،
بھڑکریاں، گائیں بھینسیں، گھوڑے گدھے اور اونٹ بھی۔ جن کے گوبر
کے اس بستی میں ہر جگہ ہر وقت ڈھیر لگے رہتے ہیں۔ کوئی جگہ ایسی نظر نہیں
آتی جہاں گوالوں نے گیلے گوبر کے اُپلے نہ لگائے ہوئے ہوں۔ جو اس بستی
کے سارے جسم پر چھپک کے داغ۔ کوڑھ کے داغ۔ دق کے داغ
معلوم ہوتے ہیں۔ مدقوق بستی۔ کوڑھی بستی۔ چھپک کی ماری بستی، جس میں انسانوں
کی کئی نسلیں پرورش پا رہی ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ یہ داغ بھی پرورش پا
رہے ہیں۔ یہ داغ ختم ہونے میں نہیں آتے۔ پہلی کھپیپ کے اتہ تے ہی

دوسری کھیب وہاں پھر لگا دی جاتی ہے۔ بہار کے موسم میں گھاس پھوس
ان گھروندوں پر لکھنیوں اور مچھروں کی نئی پود کے دل بادل منڈلایا کرتے ہیں۔
دور دور تک مار کرتے ہیں۔ لوگوں کو بیمار کرتے ہیں۔ کمپٹی کا صفائی کا عملہ چاہے
کتنی کوشش کرے گزر گئی کے اس سیلاب کو روکا نہیں جاسکتا۔ یہ سیلاب
یونہی بہتا رہے گا۔ اس سیلاب کا رخ بد لسنے کے لئے اس بستی کا۔ ان
جھونپڑوں کا۔ ان انسانوں کا بہت کچھ بدلنا پڑے گا۔

میں بھی اسی بستی میں ایک جھونپڑے میں رہتا ہوں۔ جو دوسرے جھونپڑوں
سے کچھ مختلف ہے۔ ہے تو ویسے وہ بھی جھونپڑا ہی مگر کیٹا گری کا فرق ہے۔
میں نے اس جھونپڑے کا نام رین بسیرا رکھا ہوا ہے۔ اس کی دیواریں اور
چھتیں گھاس پھوس کی نہیں اینٹوں کی ہیں۔ اس میں تین کمرے ہیں۔ جن کے
آگے قدر آدم دیوار کھڑی کر کے چھوٹا سا ایک صحن بنایا ہوا ہے جس میں ایک
طرف فصل خانہ اور اس کے ساتھ ہی باورچی خانہ ہے۔ دوسری طرف گھاس
پھوس مٹی گارے کی بنی ہوئی ٹیٹ ہے جس کی نالی ساتھ کی دیوار سے نکل کر باہر
بہتی ہوئی بڑی نالی سے جا ملتی ہے۔ صحن کے عین وسط میں مولسری کا پیڑ ہے۔
جو میں نے آج سے پندرہ سال پہلے یہاں لگایا تھا۔ جبکہ ہم سرحد پار کر کے
نئے تھے یہاں آئے تھے اور رہتے سمجھنے کو یہ جھونپڑا بنایا تھا۔ اس وقت یہ پیڑ
اتنا سا تھا۔ اور اب کافی اونچا ہو گیا ہے۔ اس کی شاخیں صحن کے اوپر چھتری
کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس میں پھولوں کی پہلی بھرن
اس کو لگانے سے سات سال بعد آئی تھی۔ وہ پھول جو اس میں پہلی بار کھسے تھے

میرے دل میں ابھی تک کھلے ہوئے ہیں اور شاید جنم جنم تک کھلے رہیں گے۔ ان پھولوں سے میری محبت نے جنم لیا تھا۔ میں اس پیڑ کو بڑا ہی مقدس سمجھتا ہوں۔ اس کے پھولوں سے مجھے نجمہ کی مہک آتی ہے۔ یہ پیڑ میرے لئے بڑا ہی مقدس ہے۔ جیسے زرتشت کے لئے وہ شعلہ بڑا مقدس تھا۔ جس میں اس نے خدا کو دیکھا تھا۔ جیسے پاربتی کے لئے مہادیو کے بالوں کی وہ لٹ بڑی مقدس تھی جس سے گنگا کی دھارا بہتی تھی۔ جیسے رادھا کے لئے کنہیا کی مری کی وہ تان بڑی مقدس تھی۔ جس نے بندرا بن کی کوچ گلی میں رنگ رس کی لیلار چائی تھی۔ برسات میں یہ پیڑ مولتا ہے تو اس کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک اس بستی کی بدبوؤں میں اجنبی سی ضرور معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اپنا جادو جگا لئے بغیر نہیں رہتی۔ اس کے سولتے ہی کھانستی، کھنکارتی، لہو تھوکتی اس بستی میں ایک نئی زندگی آجاتی ہے۔ کھنائے ہوئے دماغ بڑا چین پاتے ہیں۔ ادا سے ہوئے دل بہل جاتے ہیں۔ آنکھوں سے دور دور بھاگنے والی نیند مست ہو کر خود بخود چلی آتی ہے۔

ہمارے جھونپڑے کے عقب میں تھوڑی دور برگد کا پیڑ ہے۔ بہت پرانا اور بڑا ہی ڈراؤنا۔ دیوتا مت۔ میں اسے بستی کا دیوتا ہوں۔ جس کی مونچھوں کے اور سر کے بال نیچے لٹک کر زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔ جس کے بھاری بھر کم ڈالوں پر بیٹھے ہوئے گداپنی چوہے پھول کر چنچا کرتے ہیں۔ نیچے جھونپڑوں میں لہو تھوکتے اور کھانستے انسانوں کو رہ رہ کر جھانکا کرتے ہیں۔ گھورا کر دیکھتے ہیں۔ اس دیو کے تانے پیٹے اور قد کاٹھ۔ سے اس کی عمر دو سو سال سے اوپر ہی معلوم ہوتی ہے۔ بڑے انقلاب دیکھے ہوں گے اس پیڑ نے، مگر خود کسی

انقلاب کی زد میں نہیں آیا۔ کئی بستیاں اس کے سامنے اچڑ گئی ہونگیں۔ پھر ایسا
ہوئی ہونگیں۔ پھر اچڑ گئی ہونگیں۔ کئی لوگ آئے اور چلے گئے ہوں گے۔ مگر یہ
جہاں تھا وہیں ہے۔ جیسا تھا ویسا ہی ہے۔ چپ چاپ کھڑا سب کچھ
دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس بستی کا پرہیزگار ہے۔

اس پیر سے ذرا آگے پرانے وقتوں کی ایک بارہ دری ہے۔ کسی
مغلیہ شہنشاہ کی یادگار۔ اس میں تہ خانے ہیں۔ سرنگیں ہیں۔ سانپ ہیں۔
بچھو ہیں، اور کہتے ہیں وہاں بھوت بھی ہیں۔ ہوں گے۔ مگر انسان سب
سے بڑا بھوت ہے۔ بھوتوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ پناہ گزین ان تہ خانوں
اور سرنگوں میں بھی جا گھسے ہیں۔ بھوت انہیں تنگ کرتے ہیں۔ بچھو اور سانپ
انہیں کاٹتے ہیں۔ مگر جو زندگی کے نہرے بیلے ڈنک کھا چکے ہیں کیا پرہیز کرتے
ہیں۔ ایک زخم اور سہی۔ ایک ڈنک اور سہی۔ زہر کا ایک گھونٹ اور سہی۔
جاڑے کی سنسناتی راتوں میں بارہ دری کے کنگوروں میں چھپے ہوئے آلو
باہر نکل کر بولا کرتے ہیں۔ وہ اجاڑ چاہتے ہیں۔ اور انسان اپنی بڑھتی ہوئی
آبادی کے باعث اجاڑوں میں بسنے پر مجبور ہے۔

اس بارہ دری سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر نئی بنی ہوئی ایک
عالمی شان جوہلی ہے، جس کا مالک انیس خاں ہے۔ وہ ہمارے نہیں مقامی ہے۔
۱۹۴۷ء میں لوٹ کھسوٹ کی گنگا بہنے سے پہلے وہ گلی گلی کو چے کو چے
منیاری بیچا کرتا تھا۔ اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ کچھ کر کے ایک مالدار
اسامی بن گیا۔ اس بستی کا چوہدری بن گیا۔ نہ جانے وہ کیا کیا بن گیا۔ اس بستی کی

ہر بچا بیت کا وہی پردھان ہوتا ہے۔ اس بستی میں بسنے والوں کے ہر جھنجھٹ
ہر جھجکڑے کا وہی فیصلہ کرتا ہے۔ تھکانے میں اس کی بڑی عزت بنی ہوئی ہے۔
گتے پالنے اور ٹی پارٹیاں کرنے کا اُسے بڑا شوق ہے۔ اپنی حویلی کا نام اُس نے
رنگ محل رکھا ہوا ہے۔

رنگ محل کے کچھوڑے میں ایک درگاہ ہے۔ ایک مزار ہے۔ جسے گوندی
پیر کا مزار کہتے ہیں۔ کیونکہ مزار پر گوندی کا درخت اُگا ہوا ہے۔ ہر جمعرات کو
قوالی ہوتی ہے۔ بھنڈارہ بٹتا ہے۔ مرادیں اور منتیں مانگی جاتی ہیں۔ چڑھاوے
چڑھتے ہیں بستی کی بچانوں سے فیصد آبادی اس مزار کی معتقد ہے۔ اس درگاہ کے
مجاور کا نام سمندر سائیں ہے۔ سائیں جی واقعی کسی پرسکون سمندر کی طرح اوپر
سے بڑے خاموش مگر اندر سے بڑے گہرے ہیں۔ کوئی پیندا کوئی تہہ نہیں ہے
ان کی۔ اللہ لوگ ہیں اور ہر وقت اللہ لوگوں کی محفل لگائے رکھتے ہیں۔ کوئی
وقت ایسا نہیں ہوتا جبکہ دس پندرہ اللہ لوگ ان کے پاس بیٹھے چرس چاند نہ
پی رہے ہوں۔ وہ سب کلیان سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کے بادلوں کی اوٹ
میں چھپے رہتے ہیں۔ تاکہ دنیا دار انہیں دیکھ نہ لیں۔ بقول ان کے وہ دنیا اور
دنیا کی ہر چیز کو چھوڑ چکے ہیں۔ اپنوں اور پراڈوں سے منہ موڑ چکے ہیں۔ ہر شے
فانی اللہ باقی۔ دنیا کا ہر شخص با عزت طریقے سے زندگی بسر کرنے کے لئے
کوئی نہ کوئی محنت مزدوری کرتا ہے تاکہ وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال
سکے۔ لیکن یہ اللہ لوگ صرف اللہ اللہ کرتے ہیں۔ روٹی انہیں اللہ کے پیار سے
دے جاتے ہیں، اور اگر نہیں تو نہ سہی۔ کیونکہ بال بچوں کو انھوں نے اللہ کے

سپر دیکھا ہوا ہے اور ان کے لئے روحانی غذا چرس چانڈو ہی کافی ہے۔ اس کے بغیر روحانیت نہیں ملتی۔ خدا نہیں ملتا۔ جب تک نشہ نہ آئے خدا نظر نہیں آتا۔ خدا سے لوگ انہ کے لئے چرس چانڈو کا کش لگانا بہت ضروری ہے۔

برسات کی وہ بھگی بھگی ہلکی ہلکی سانولی سی شام مجھے کبھی نہ بھولے گی جبکہ میری محبت نے مولسری کے پھولوں کی مہک سے جنم لیا تھا۔ متواتر دو دن ایک ہی رفتار سے برستے ہوئے بادل اس وقت کھٹم گئے تھے۔ پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹپک رہی تھی اُن سے۔ اور چھتیں تھیں کہ بدستور ٹپک رہی تھیں۔ مضبوط مکانوں کو بھی بنیادوں سے ہلا دیا تھا اُس طوفانی بارش نے۔ ٹوٹے پھوٹے ڈھاروں اور جھونپڑوں کی تو بساط ہی کیا تھی۔ کئی جھونپڑے تنکاتنکا ہو کے بہہ گئے پانی کے ریلوں میں۔ کئی چھپروں کو تیز و تند ہوائیں کاغذ کے پرندوں اور دھبیوں کی طرح اڑا کے لے گئیں۔ کبھی یہاں سے کبھی وہاں سے۔ کبھی ادھر سے کبھی اُدھر سے۔ ڈھاروں کے دھائیں دھائیں گرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لوگ زخمی ہو رہے تھے۔ لوگ مر رہے تھے۔ لوگ بلے تلے دبے ہوئے تھے۔ اک قیامت سی آرہی تھی اس بستی میں۔ فائر بریگیڈ اور کارپوریشن کے عملے کے لوگ بستی کے درد مند نوجوانوں کے تعاون سے مصیبت زدہ لوگوں کے لئے بڑا کام کر رہے تھے۔ ملبہ ہٹا کر نیچے دبے ہوؤں کو نکالا جا رہا تھا۔ زخمیوں کی مرہم پٹی ہو رہی تھی خطرناک مکانوں کے مکینوں کو ان کے ضروری سامان کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر پہنچایا جا رہا تھا۔ عجیب دردناک سماں تھا۔

میرا دل اس ناگہانی آفت کے خیال سے بڑا بوجھل ہو رہا تھا۔ میں بڑا ادا اس تھا۔
میں بڑی تکلیف میں تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے مکمل آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔
زیادہ ہلنے چلنے کی بھی ممانعت تھی۔ مگر میں ایک جذبے کے تحت بستر سے
اٹھ کر چل دیا۔ بستی کے دوسرے دردمند اور حساس نوجوانوں کی طرح میں بھی
مصیبت زدہ لوگوں کی مصیبت میں کام آنا چاہتا تھا، مگر جھونپڑے سے باہر
آتے آتے ہی میرا دم پھول گیا۔ دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ پہچانی کیفیت
میرے لئے اچھی نہ تھی۔ کثرت سگریٹ نوشی سے مجھے اختلاج قلب کا عارضہ
ہو گیا تھا۔ میں اپنا دل پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے دل
پر کسی نے بوجھل پتھر رکھ دیا ہے۔ اور وہ اس کے نیچے ٹپ رہا ہے مجھے
چکر آنے لگے۔ قریب تھا کہ بہوش ہو کر زمین پر گر جاتا۔ مگر دوسری کی مہک
میں بسے ہوئے جھونکوں نے مجھے سنبھال لیا۔ میرے دل کو بڑی تقویت دی۔
میرے الجھے الجھے سانس ذرا درست ہوئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ دل کا بوجھ کم
ہوتا چلا گیا۔ دل اپنی ٹھیک رفتار پر آ گیا، اور میرا سانس بھی بالکل ٹھیک ہو گیا۔
اتنے میں سفید ڈاڑھی والے ایک بزرگ بڑی پریشانی میں میرے پاس آئے۔
کہنے لگے۔

”ہم لوگ وہاں ایک جھونپڑے میں رہتے ہیں۔ جو بارش کی مار سے
بس گرنے ہی والا ہے۔ ہم لوگ خطرے میں ہیں۔ اگر آپ اجازت
دیں تو یہاں آپ کے ڈیرے میں آجائیں۔“
”بڑی خوشی سے“ میں نے جواب دیا۔ ”آپ اس جگہ کو اپنی ہی جگہ سمجھیں۔“

وہ شکریہ ادا کر کے چلے گئے۔ اور کھوڑی ہی دیر میں اپنی مستورات کو ملے اسے
- بولے -

”آپ انہیں اندر بٹھائیں۔ میں جلدی سے چند ضروری چیزیں نکال لاؤں
سارا سامان تو نکالا نہیں جاسکتا۔ جو کچھ نکل آئے غنیمت ہے۔ چھت کا شہتر
کڑک رہا ہے۔ بس گرا کر گرا۔“

اتنا کہہ کر وہ پھر چلے گئے۔ میں نے ان کی عورتوں کو کمرے میں اپنی والدہ
کے پاس بٹھا دیا۔ وہ اندھی ہیں۔ مدت سے اپنی بینائی کھو چکی ہیں۔ مگر ان کے
دل کی آنکھیں مدش ہیں۔ وہ بڑی رحم دل ہیں۔ بڑی خلیق ہیں۔ کسی کو مصیبت میں
دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہیں۔ ان عورتوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان کے ساتھ کھلی
مل کر یوں باتیں کرنے لگیں۔ جیسے وہ کوئی غریبہ تھیں۔ کھوڑی دیر میں وہ بزرگ
ایک صندوق اور اس کے اوپر گھڑی سر پر رکھے ہوئے آ گئے۔ اور بارش پھر
شروع ہو گئی۔ پہلے سے بھی تیز۔ برستے پانی کی پھنکار سن کر رونگٹے کھڑے
ہونے لگے۔ بڑے میاں نے بیڑی جلائی اور میرے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر
کی باتیں کرنے لگے۔ اور پھر انہوں نے اپنی باتیں شروع کر دیں۔ وہ اپنی آپ
بیتی سناتے لگے۔ اپنی زندگی کی کہانی۔ اور میں بڑے غور سے سننے لگا۔ میں ہر
کہانی کو بڑے غور سے سنتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے اچھی کہانیوں کی ہمیشہ تلاش
رہتی ہے۔ میں دھرتی پر بہتے ہوئے انسانوں کے سمندر کے ساحل پر کھڑا ان کے
دکھ سکھ کے جوار بھاٹوں کا انتظار کیا کرتا ہوں۔ جوار بھاٹے آتے ہیں تو بہت
سی کہانیاں ان کے ساتھ ساحل پر آتی ہیں۔ میں ان کہانیوں کو سیدھ سمجھ کر موتی

سمجھ کر چن لیتا ہوں۔ ریت سے کھیلتی ہوئی جھاگ کو ٹھٹھاکرتا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی بڑا ہی عجیب عنوان مجھے مل جایا کرتا ہے اپنی کسی کہانی کے لئے ریت اور جھاگ سے۔ سمندر اور ساحل دونوں بڑے پراسرار ہیں۔

میں ایک فلمکار ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔ کہانیاں بچتا ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے۔ صبح ہوتے ہی میں اپنی کہانیوں کو اپنی زندگی کے ٹوکرے میں، شوکیں میں رکھ کر گھر سے نکل جاتا ہوں۔ گلیوں اور بازاروں میں ہانکے دیتا پھرتا ہوں۔ ”کہانیاں لے لو۔ کہانیاں لے لو۔“ میں اپنی کہانیوں کے خریدار ڈھونڈتا ہوں۔ مگر مجھے میری مرضی کے خریدار نہیں ملتے۔ ان کی پوری قیمت ادا کرنے والے گاہک مجھے کہیں نظر نہیں آتے۔ میری زندگی کے ٹوکرے میں، شوکیں میں نئی کہانیاں بھی ہیں اور پرانی کہانیاں بھی۔ تازہ کہانیاں بھی ہیں اور باسی بھی۔ میرے نزدیک باسی کہانیاں وہ ہیں جو میں نے بڑی مدت سے لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن ابھی تک نہیں بکیں۔ وہ انمول کہانیاں ہیں۔ خریدار ان کی قیمت سن کر ڈر جاتے ہیں۔ اور مجھے میرا افلاس، میری غربت، میری بھوک ڈراتی رہتی ہے۔ میں ان بازاروں کے دورا ہوں، چوراہوں اور موڑوں پر رک کر ذرا دم لیتے ہوئے سوچا کرتا ہوں۔ میں فلمکار کیوں بن گیا؟ برف میں لگے ہوئے رستے اور آئس کریم بیچنے والے کیوں نہ بنا؟ موزے، دستانے، ٹوپیاں اور بوٹے بیچنے والا کیوں نہ بنا؟ کہانیاں لوگ کم خریدتے ہیں اس لئے کہ انہیں دکھایا، پیا اور پینا نہیں جاسکتا۔ یہ تو محض مطالعہ کی چیزیں ہیں۔ انہیں صرف پڑھا جاسکتا ہے اور پڑھنے کے لئے یہاں اور بھی بہت کچھ ہے۔ انسان۔ حیوان۔ درخت۔ پھتر جنہیں مفت پڑھا جا

دل دیا دل دیا

سکتا ہے۔ مگر ہر شخص انسانوں، حیوانوں، درختوں اور پتھروں کو نہیں پڑھ سکتا۔ اور یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ ہر شخص فطرتاً داستان گو ہے۔ ہر شخص کہانیاں لکھ سکتا ہے۔ کہانیاں سنا سکتا ہے۔ کہانیاں بنا سکتا ہے۔ یہ سب سے آسان فن ہے۔ کہانی کہانی ہی تو ہے۔ ہر چیز کو کہانی بنایا جاسکتا ہے۔ ہر چیز کی کہانی بن سکتی ہے۔ ہر چیز ایک کہانی ہے۔ آنکھیں موندے چوک کے پیچ دھرتا مار کر بیٹھا جگائی کرتا، کان ہلاتا بوڑھا ساند بھی ایک کہانی ہے۔ گندے پانی سے پیاس بجھانے والا زبان باہر لٹکائے، ہانپتا، ہونکتا، بھونکتا نالی کی طرف بھاگتا خارش زدہ کتا بھی ایک کہانی ہے۔ اپنے پیرے اور چھاتیوں کو لالبنے لالبنے چمکٹ بالوں سے چھپائے، اپنے ننگے بدن کو اکٹھا کئے، کوڑے کی ڈھیری پر ٹھیک ٹھیک کر خالی ڈونے اور پتر چاٹتی پاگل عورت بھی ایک کہانی ہے۔ کتابیں اٹھائے، ٹیڈی لباس میں بس سٹاپ پریس کے انتظار میں کھڑی سیب کے رخساروں اور نیلے ریشم کی آنکھوں والی کوئی لڑکی بھی ایک کہانی ہے۔ سڑک کو لکڑی کی ٹانگ سے ٹھکورتے ہوئے، آتے جاتے راہ گیروں سے بھیک مانگنے والا مبروص بھکاری بھی اک کہانی ہے۔ کسی ادبچی عمارت کی چوٹی پر ادولٹین اور خاندانی منصوبہ بندی کا جلتا بھٹا سائیکو سائن جہاز می سائیز کا بوڑھا بھی اک کہانی ہے۔ دونوں ہاتھ پھیلائے فٹ پاٹھ پر چیت بیٹھے ہوئے کوڑھی کے پیپ سے بھرے ہوئے متعفن زخم اور ان پر بھنجناتی مکھیاں بھی ایک کہانی ہیں۔ بوڑے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے یہ بہت سے لوگ کفن میں لپیٹی ہوئی ایک کہانی ہی چارپائی پر اٹھائے لئے آتے ہیں۔ باجوں کے شور اور براتیوں کے

ہجوم میں گھوڑے پر یہ ایک کہانی ہی سہرا باندھے بیٹھی ہے۔ نعمت کدہ کی دیوار سے لگتا ہوا مرغ مسلم کا بورڈ۔ اس کے سامنے شوکیس کے اندر لمبی سی سیخ میں پروئے ہوئے مرغ بریاں۔ چینی کے خوشنما برتن۔ خانسارے۔ قورہ و بریانی کی بھوک کو تیز کرنے والی خوشبو۔ ٹاور میں لگا ہوا لاؤڈ سپیکر اور کھلاک بھی ایک کہانی ہے۔ اس کے ہندسے۔ گھنٹے۔ منٹ۔ سکینڈ۔ سوئیاں۔ سارے۔ وقت کا یہ جنت منتر۔ اندھیرے اجالے۔ دن رات۔ یہ سب سالوں۔ صدیوں۔ آتی جاتی رتوں اور بدلتے زمانوں کے چکر میں گھومتی ہوئی کہانیاں ہی تو ہیں۔ صبح سے شام تک انسان جو کچھ کرتا ہے اس میں ایک نہیں کئی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اگر کوئی کہانی پڑھنے کو دل چاہے تو انسان جو کچھ کرے اُسے کہانی سمجھ کر پڑھ لیا کرے۔ مول لے کر کہانیاں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور میری کہانیوں کے کاغذی کردار۔ میری غربت، میری بھوک میں چھپا ہوا نقاد کتنا ہے۔ ان کاغذی کردار ہی میں گھوم پھر کر، بول چال کر، ہنس رو کر سو جاتے ہیں۔ یہ جاگتے کم ہیں اور سوتے زیادہ ہیں۔ یہ نیند کے ماتے ہیں۔ یہ لوٹس ایٹر ہیں۔ بالکل ٹھس ہیں۔ بیکار ہیں۔ مردہ ہیں۔ مجھے انہیں زندہ کرنا چاہئے۔ میرے افلاس، میری غربت میں چھپا ہوا نقاد مجھ پر کڑی تنقید کیا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ایک تم ہی نہیں کہانیاں لکھنے والے اور بھی ہیں۔ تم کہتے ہو میں ایک کہانی ایک افسانہ نہیں لکھتا اپنے خیالوں کے رنگوں سے ایک تصویر کھینچتا ہوں تمہیں اپنی نقاشی مصوری پر بڑا ناز ہے۔ تم اپنے آپ کو ایس مہاتا۔ جو رہ جو سنے۔ تنہا تو۔ آندرے بوشاں۔ ریمبرائن۔ برڈ گھنل۔ دوناتیلو۔ فراچیا۔

دل دیا داغ

آندرے دوغیس - پیٹر بلوم - مودی لیانی - راول ڈوئی - سیورا - مایو آن -
 پبلو پکا سو - یوجین برمن - بوٹی چلی - پال ملنار - نیورا اور لیونارڈ ڈراچی سمجھتے
 ہو - ٹگر تم بغلول ہو - بدھ سو ہو - ایک بہت بڑے چغند ہو - زندگی کے خون سے
 کہانیاں اور افسانے لکھنے کی کیا ضرورت ہے - یہ کام لال سیاہی سے بھی لیا
 جاسکتا ہے - ایسی تصویریں بنانے کے لئے ریویز اور ڈریکو کے واٹر کالر اور
 آئل کالر استعمال کرو - امپریشن ازم - رئیل ازم - تکنیک - آرٹ یہ سب یکو اس
 ہے - اس گول مارکیٹ میں سب کچھ چلتا ہے - کھوٹا کھرا سب کچھ چلتا ہے -
 تم جس سویرے کا انتظار کر رہے ہو اک چھل ہے - فریب ہے - دھوکہ ہے -
 دھرتی پر اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں - زندہ رہنا چاہتے ہو تو ان اندھیروں میں
 چلنا سیکھو - میری غربت، میرے افلاس میں چھپا ہوا نقاد مجھ پر کڑی نکتہ چینی کرتا
 ہے - بڑے کمزور ہیں تمہاری کہانیوں کے کاغذی کردار - اعصاب زدہ ہیں -
 سرطان زدہ ہیں - ان کے اندر بھی سرطان کی بستیاں آباد ہیں - ان کے چہروں پر
 بھی چھوٹا اور کوڑھ کے داغ ہیں - وہ کہتا ہے - تمہاری کہانیوں کے کاغذی
 کردار کھا نستے ہیں - لہو کھو کھتے ہیں - انیمیا کے مریض ہیں - دق کے مریض ہیں انہیں
 صحت مند بناؤ - ٹانگیں کھلا کر ان میں طاقت پیدا کرو تا کہ یہ اپنا کاغذی کفن بھاڑ
 کر اتنی بڑی دنیا کے استنے بڑے دائرے میں کود پڑیں - اگر کوہ نے کی حرات
 نہیں رکھتے تو ان کاغذوں کے پیراشوٹ بنا کر نیچے اتر آئیں - اور دیکھیں کہ
 کس زادے میں ان کی زندگی نہ رہیں ہو سکتی ہے - کن فریموں میں ان کی خواہشوں
 کی تصویریں قسٹ آتی ہیں - کاغذ کے ان پتلیوں میں کوئی تحریک، کوئی ہلچل، کوئی حرکت

کوئی جنبش پیدا کرو۔ دن رات بت بنے بیٹھے سوچتے سوچتے کیا پاگل ہو جائے گا؟
اتنا نہ سوچا کرو۔ کہانیاں لکھنے کے لئے اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں۔ پیگودا کی شکل
کی ایک کوکھی میں رہتے ہوئے ہری چھال۔ کے کیلے کھانے اور موسمیوں
کا جو س پینے والے بلڈ پریشر کے مریض ادھیڑ عمر کے اُس عورت نما شخص کو
دیکھو جس کے متعلق تمہارے ایک دوست نے تمہیں یہ کہانی سنائی تھی کہ بیک
وقت وہ بہت سے کام کرتا ہے۔ بیک وقت وہ مصور بھی ہے، موسیقار
بھی ہے۔ ریڈیو اور موٹر میکینک بھی ہے۔ کچھ لوگ اُسے مکی ماؤس ٹکنی کھر
فلم سمجھتے ہیں۔ وہ مصنف بھی ہے۔ ملٹی مین ہے وہ۔ بیک وقت وہ
بہت سے کام کرتا ہے۔ اور ان میں ایک کام کہانیاں لکھنا بھی ہے۔ کہانیاں
لکھتے وقت وہ بالکل نہیں سوچتا۔ بس دھڑا دھڑا تیز کام کی رفتار سے لکھتا چلا
جاتا ہے۔ کہانیاں۔ افسانے۔ ڈرامے۔ اور نہ جانے کیا کچھ یعنی سب کچھ۔
وہ اگر ایک افسانے میں دو سو جملے لکھتا ہے تو سو جملے ان میں بالکل غلط، بے
معنی، بے ربط ہوتے ہیں۔ ان میں املا کی بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ مگر چھاپنے
والے اُسے چھاپتے چلے جاتے ہیں۔ پڑھنے والے اُسے پڑھتے چلے جاتے
ہیں۔ کیونکہ وہ سوچ کر کہانیاں نہیں لکھتا۔ بس لکھتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ سب
کچھ کسی فن کے تحت نہیں فارمولے کے تحت لکھتا ہے۔ کیونکہ اس نے یہ سمجھ
لیا ہے کہ زندگی میں فن سے زیادہ فارمولوں کی ضرورت ہے۔ کہانیاں لکھنے
اور انہیں بیچنے کے لئے سوچنے سے کہیں زیادہ ان کے سناریو کو سمجھنے کی
ضرورت ہے۔ مرنے چاندی کے چکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ روٹی پانی کے

چکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس زندگی میں بس چکر ہی چکر ہیں چین نہیں ہے۔ یہ زندگی علی بابا کے چالیس چوروں کا غار ہے۔ بند سمس ہے۔ اس سمس کو کھولنے کے لئے سوچنے سے کچھ ہوگا۔ سوچنے سے یہ سمس نہیں کھلے گا۔ اسے کھولنے کے لئے سراغ لگانا پڑے گا۔ سرنگ لگانا پڑے گی زندگی کی اس دیوار چین میں جسے میں اور میری طرح کے کئی جوج دما جوج رات ہوتے ہی چاٹنا شروع کرتے ہیں لیکن صبح ہونے تک وہ جوں کی توں موجود ہوتی ہے۔ تم بھی کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری غربت۔ میرے افلاس میں چھپا ہوا نقاد کتاب ہے۔ اپنی کہانیوں کے کاغذی کرداروں کو بلیکے، سمگلر اور سکینڈل ساز بناؤ۔ پھر تمہارے لئے بنگلو، بنک بیلنس، تمہاری زندگی اور مستقبل خود بخود بن جائے گا۔ زندگی بنانے کے لئے اس چکر میں کہانیاں نہیں چلتیں سکینڈل چلتے ہیں۔ اگر تم کوئی سکینڈل نہیں چلا سکتے تو بس سمجھ لو کہ تم کسی ٹوٹی پھوٹی موٹر کا ہینڈل ہو جو کہ جام ہو چکا ہے۔ بیکار ہے۔ بالکل کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اور میں اس چپاک منہ پھٹ نقاد کی کڑی تنقید سے بوکھلا جاتا ہوں۔ گھپلا جاتا ہوں۔ کیونکہ میری کہانیوں کے کردار تو ریقار مر ہیں۔ ریضو جی ہیں۔ ناہموار راستوں پر انہیں چلنا نہیں آتا۔ وہ کسی شخصیت کا کوئی ریڈی میڈ بہروپ بدلنے کو تیار نہیں۔ وہ کوئی سوانگ بھرنا نہیں چاہتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میری کہانیاں پسند نہیں کی جاتیں۔ ان میں برف میں لگے ہوئے رسکوں اور آئس کریم کا مزہ نہیں ہے۔ ان میں دستانوں اور موزوں کی نرمابٹ اور گریابٹ نہیں ہے۔ ان سے سراور پاؤں کی وہ آرائش نہیں ہو سکتی جو ٹوپی اور بوٹ سے ہو سکتی ہے۔ میری غربت، میری بھوک میں چھپا ہوا نقاد

مجھ سے کہتا ہے۔ کہ تم ان کاغذوں کے کپڑے اور مونے سے دستانے بناؤ۔
ایک کنٹوپ بناؤ۔ اُسے اپنے سر پر رکھ لو۔ کاغذ کے کپڑے اور مونے سے دستانے
پس کر اس چوراہے میں چورن بیچا کرو۔ مینگو سکویس بیچا کرو۔ پھر شاید ان
راہ گیروں میں تمہیں دیکھ کر کوئی بچل پیدا ہو جائے۔ اور تمہاری زندگی کی رُکی
ہوئی مشین پر سے غربت و افلاس کا رنگ اُتر جائے۔ اور وہ چلنے لگے۔
کرنسی نوٹ چھاپنے لگے۔ اس تیز نقاد کی تنقید میرے مزاج کو بڑا تیز کر دیا
کرتی ہے۔ سارا دن ٹانگیں بے فائدہ چلاتے چلاتے تھک کر، مایوس
ہو کر جب میں گھر لوٹتا ہوں تو سودا بیچ کر کب سے فارغ بیٹھے ہنستے اور
ماہیا گاتے ہوئے چھا بڑی فروشوں کو دیکھ کر میرا دل رونے لگتا ہے۔ اور مجھے
یہی مشورہ دیتا ہے کہ کہانیوں کے اس ٹوکری کو بیس چوراہے میں رکھ کر جلا دو۔
اور جب شعلے اٹھیں تو ان میں کود کر تم بھی خودکشی کر لو اور میں ایسا کرنے پر
تیار ہو جاتا ہوں۔ مگر ایک ان دیکھی۔ انجانی۔ میرے اندر چھپی ہوئی کوئی چیز مجھے
آواز دیتی ہے۔ للکارتی ہے۔

دو ایسا نہ کرنا۔ ان اندھیروں میں سویرا ہو چکا ہے۔ اب تم اندھیرے
میں نہ رہو گے۔ کوئی بھی اندھیرے میں نہ رہے گا۔ غربت و افلاس کا
سالوں پرانا روگ یکدم تو نہیں جائے گا۔ کچھ دقت لگے گا۔ اس روگ
کا مناسب علاج شروع ہو چکا ہے۔ ہوا سے لہماتے گندم کے
کھیتوں، دھان کے کھیتوں کا لاکھوں ٹن اناج اب زمین دوز خیلوں
پس نہیں جائے گا۔ رات کے سناٹوں میں سرحدوں سے پار نہیں پہنچے گا۔

اس ملک کی منڈیوں میں آٹے لگا۔ اور بڑا استناجکے گا۔ اناج سے
بھرنے ہوئے یہ سنہری خوشے، یہ سنہری بالیاں اب کال نہیں خوشحالی
پیدا کریں گی۔ اس کا مناسب انتظام ہو رہا ہے۔ ہر فنکار، ہر دستکار
ہر صنعت کار، ہر انسان کی خوشحالی کے لئے بڑے اونچے پلان
سوچے جا رہے ہیں۔ منصوبے عمل میں آ رہے ہیں۔ تمہارے
اچھے دن آ رہے ہیں۔ اپنے ماضی سے منہ موڑ کر اپنے مستقبل
کو دیکھو۔ تمہارا مستقبل بڑا درخشاں ہے۔ مطمئن رہو۔ تمہیں تمہاری
محنت کا صلہ ملے گا۔ ضرور ملے گا۔ تمہارے شاہکار، تمہارے
شہ پارے، تمہاری کہانیاں جن میں تم نے ان اندھیروں میں روشنی
کرنے کے لئے اپنے لہو کے چراغ جلائے ہیں، بڑی عزت و احترام
سے رکھی جائیں گی۔ تمہاری کہانیاں مردہ نہیں زندہ ہیں۔ انہیں ٹیس
ایئر نہ کہو یہ لوح و قلم پر تحریر ہو چکی ہیں۔ انہیں شعلوں میں جلاسنے کی
کوشش نہ کرو۔ ان کا ایک ایک لفظ بڑا مقدس ہے۔ انہیں زندہ
رہنے دو۔ اور خود بھی زندہ رہو۔ آنے والا وقت تمہارے اعزاز میں
ایک اعلان کرنے والا ہے۔

یہ آواز مجھے ہر بار روک لیتی ہے۔ مجھے اپنی کہانیوں اور ان کے کاغذی کڑاؤں
کا قتل عام نہیں کرنے دیتی۔ مجھے اپنی کہانیوں کے کاغذی کڑوں کو آگ نہیں لگانے
دیتی۔ مجھے کچھ نہیں کرنے دیتی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اپنے درخشاں مستقبل کے
سپنے دیکھنے لگتا ہوں۔ کیونکہ میں ڈریمر (DREAMER) ہوں۔ ڈریمر۔

سپینوں کا متوالا - دن کے اُجالے میں بھی اور رات کے اندھیرے میں بھی
سپینے دیکھنے والا - میری کہانیاں میرے سپینوں ہی سے جنم لیتی ہیں - اور میرے
سپینے اُس ماحول سے اور ان انسانوں سے جنم لیتے ہیں جن میں مجھے رہنا ہے -
میں اپنے سپینوں کی عکاسی کرتا ہوں - اپنے ماحول کی عکاسی کرتا ہوں - اُس میں
بسنے والے انسانوں کی عکاسی کرتا ہوں - فرصت کے وقت میں اپنی گہری
سوچوں کو ساتھ لئے اپنے سپینوں کے پیچھے آوارہ پھرا کرتا ہوں - سب سے
اگک تھلک چپ چاپ کچھ سوچتے ہوئے اپنے سپینوں کے ساتھ ساتھ
اندھیروں اور اجالوں میں بہت دور نکل جانا میری ہابی ہے -

سپینوں کی بستی ہے میری زندگی - میری زندگی - میری ڈیم لینڈ ہیں یہ
میری سوچوں کے بادل چھائے رہتے ہیں - جس کی ہر چیز گہری لپٹی ہوئی ہے -
جس میں ہر وقت دھندلی دھندلی دھواں سی سلگتی شام کا سماں ہوتا
ہے - جس میں سورج اور ستارے بہت کم چمکتے ہیں - جس میں اجالاکم اور
اندھیرا زیادہ ہے - اگر ان اندھیروں میں میرے سپینوں کے جگنو نہ جگمگائیں
تو میں اور میری کہانیاں شاید ایک پل بھی نہ جی سکیں - ان سپینوں کا جگمگانا ہی
میری اور میری کہانیوں کی زندگی ہے - جب میں نے پہلے پل تجہ کو دیکھا تھا
تو وہ بھی مجھے ایک سپنا ہی معلوم ہوئی تھی -
تجہ - تجہ

یہ بڑے میاں کی بیٹی کا نام تھا - وہ اُس دن باتوں ہی باتوں میں میرے
ساتھ اتنے باتوں ہو گئے - اتنے گھل مل گئے کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی

کو میرے سامنے ایکسپوز کر دیا۔ نبی بخش تھا ان کا نام۔ وہ رنگ سار۔ ان کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹے مرچکے تھے۔ بیٹیاں زندہ تھیں۔ نجمہ اور رخسانہ۔ نجمہ دسویں جماعت پاس تھی۔ اور رخسانہ نے پانچویں جماعت پاس کر کے سکول چھوڑ دیا تھا۔ وہ عمر میں نجمہ سے چھوٹی تھی۔ دونوں بہنیں جوان ہو چکی تھیں۔ بڑے میاں اپنی زندگی کے سب سے بڑے فرض سے فارغ ہونے کی بڑی کوشش کر رہے تھے۔ بڑھاپے میں بھی دن رات کام میں لگے رہتے تھے۔ دن کو رنگساز می کرتے اور رات کو فرصت میں تصویریں بناتے۔ انہیں بیچتے۔ یہ ان کا سائیڈ بزنس تھا۔ انہیں اپنی دونوں بیٹیوں کا بھیڑنا تھا۔ شاید اسی احساس فرض نے اُن میں اتنی توانائی پیدا کر دی تھی کہ دن رات کام کرتے نہ تھکتے تھے۔

اس لہجے میں آنے سے پہلے بڑے میاں شہر سے بڑی دور ایک لہجے میں رہتے تھے۔ اپنے کام کاج پر شہر آنے کے لئے انہیں ہر روز بس پر بڑا لمبا سفر کرنا پڑتا۔ ساٹھ ستر پیسے آنے جانے میں کرائے میں اٹھ جاتے۔ اسی دُکھ سے اکھنوں نے کاروباری سلسلے میں اس شہر کو چھوڑ کر جاتے ہوئے شہر اتی کباٹیئے سے یہ جھونپڑا سوراہے میں مول لے لیا۔ جان پہچان ہونے کی وجہ سے شہر اتی نے اُن سے لاگت ہی لی تھی کیڑی نہ لی تھی۔ اچھا سودا ہو گیا۔ وہ ہر روز اتنی دور سے آنے جانے کے بھنچھٹ سے چھٹ گئے۔ شہر کے بالکل قریب ہی جیسا کہ وہ چاہتے تھے انہیں رہنے سہنے کو جگہ مل گئی۔ ورنہ مکانوں کی قلت کی وجہ سے شہر میں کہیں کوئی خالی مکان کوئی کوٹھری، کوئی کھولی

مل جانے کا مسئلہ تو ایک مدت سے ایک بہت بڑی مصیبت بنا ہوا ہے۔
جوا بھی تک حل ہونے ہی میں نہیں آتا۔ اور پھر لکڑی لینے دینے کا رواج تو
ایسا چل نکلا ہے کہ ہم لوگوں کا تو ذکر ہی کیا پتے والے لوگوں کی پچھار لکڑی
بھی ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ سینکڑوں کی بات نہیں لکڑی لینے والے ہزاروں کی
بات کرتے ہیں۔

وہ رات ہم نے باتیں کرتے ہوئے ہی گزار دی۔ صبح ہوئی۔ طوفانی
بارش بند ہو چکی تھی۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ سورج نکلا تو بڑے میاں اپنا
جھونپڑا دیکھنے نکلے۔ واپس لوٹے تو بہت پریشان نظر آئے۔ ان کا جھونپڑا
گر گیا تھا۔ سامان ملبہ پڑنے سے کچھ تو ٹوٹ پھوٹ کر بالکل بیکار ہو گیا تھا
اور کچھ پانی میں بہہ کر نہ جانے کدھر نکل گیا۔ بڑی پریشانی کی بات تھی۔ بڑے
میاں سر کپڑے بیٹھ گئے۔ ان کا بڑا نقصان ہو گیا تھا۔ کل چار دن اس جھونپڑے
میں انہیں رہنا ملا۔ اور پھر بارش کا طوفان آگیا۔ روپیہ بھی گیا اور جھونپڑا بھی گیا۔
ان کی پریشانی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگے۔

”سلیم صاحب جب تک ہمارے رہنے سہنے کا کوئی بندوبست نہیں
ہوتا ایک کمرہ ہمیں دے دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ ہم کرایہ
دیں گے۔“

”کرائے کی کوئی بات نہ کریں آپ۔“ میں نے کہا۔ ”میں اماں جی سے
بات کرتا ہوں۔ اگر وہ ہاں کر دیں تو بس ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات
اور ہے۔“

”جی کیا بات؟“ بڑے میاں یکدم چونکے اور بیڑی سلگاتے ہوئے بولے
 ”ہمارے پاس صرف تین کمرے ہیں۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے
 کہا۔ ”ایک کمرے میں تو سامان کچھا کچھ بھرا ہوا ہے۔ تل دھرنے کو جگہ
 نہیں ہے۔ دوسرے کمرے میں ہم لوگ سوتے ہیں۔ کل دو چار پائیوں کی جگہ
 ہے اس میں تیسری نہیں بچھ سکتی۔ رہا تیسرا کمرہ تو یہ میرے مطالعے کا کمرہ ہے۔
 میرا شانسی نکتہ۔ اس کمرے میں بیٹھ کر میں کہانیاں لکھا کرتا ہوں۔ اپنے پسینوں
 کی تصویریں بنایا کرتا ہوں۔ مگر یہ کمرہ کچھ چھوٹا ہے۔ تنگ ہے۔ کیا آپ
 کے لئے کافی ہوگا؟“

”جی ہاں کافی ہوگا اگر آپ کا دل تنگ نہ ہو۔“ بڑے میاں نے مسکراتے
 کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”جی نہیں۔ میرا دل بڑا وسیع ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب

دیا۔

”بس تو پھر ہمارا سامان ہی کیا ہے۔ اور ہم کتنے ہیں۔ کل چار بندے۔ بھئی
 گزارہ ہو جائے گا۔ وقت ہی گزارنا ہے گزر جائے گا۔“

”میں اپنے پڑھنے لکھنے کا سامان اٹھا کر سونے والے کمرے میں سے
 جاؤں گا۔ آپ کے لئے اور جگہ خالی ہو جائے گی۔ میرا مطلب ہے آپ کی
 چار پائی کے لئے بھی جگہ نکل آئے گی۔“ میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

”اجی کیا ضرورت ہے اتنی تکلیف کرنے کی۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔
 میں آپ کو اپنا بیٹا سمجھتا ہوں۔ بیشک ہم ہیں بیٹھ کے اپنا کام کیجئے۔ کیا ضرورت

ہے اپنے پڑھنے لکھنے کا سامان اٹھانے کی۔ میری چار پائی کے لئے جگہ کا
آپ کچھ خیال نہ کریں۔ درویشوں کا کیا ہے۔ زمین پر ہی بوریہ بچھالیں گے۔
آخر کو اس زمین میں ہی سمانا ہے۔ اور سینے“

”جی فرمائیے؟“

”میں بھی تصویریں بنایا کرتا ہوں۔“

”اچھا۔“

”جی ہاں۔ خوب گذرے گی بومل بیٹھیں گے دو مصور۔“

”جی ہاں خوب گذرے گی۔“

”جلدی جانیے اب اپنی والدہ سے پوچھیں کیا کہتی ہیں۔“ بڑے میاں
نے نئی بیٹری سلگاتے ہوئے کہا۔

میں نے ساتھ والے کمرے میں جا کر اپنی والدہ سے بات کی تو وہ بہت
خوش ہوئیں۔ بولیں۔۔

”تم کام پر چلے جاتے ہو تو میں یہاں اکیلی بیٹھی رہتی ہوں۔ میرے

پاس رونق ہو جائے گی۔ اور دیکھو ان سے کرایہ نہیں لینا۔ جیت تک

ان کا جی چاہے گزر بسر کریں۔ ہمیں کرایہ نہیں چاہیے۔ خراوتیسا ہے

کھاتے ہیں۔ ان کے پیسوں سے ہم نے کونسا رنگ محل بنالینا

ہے۔ اس کی دی ہوئی یہ کٹیا ہی کافی ہے۔“

مگر اس کٹیا میں ایک رنگ محل ایک تاج محل بن کر ہی رہنا تھا۔ اور بن گیا۔
جس کی بنیاد نجمہ نے رکھی۔ اور پہلی اینٹ بھی اسی نے لگائی۔ پیار کی ابتدا اسی نے

کی -

نجمہ

اکیس بائیس سال کی نازک بدن ایک خوب دلڑکی - جس کی رنگت موسمری کے پھول سی تھی - خدو خال ترشتے ہوئے - میڈو نافیس - جب وہ گردن جھکائے کشیدہ کاڑھنے یا روٹی پکانے میں لگی ہوتی تو یہی معلوم ہوتا کہ سائیکلی آسمان سے زمین پر اتر آئی ہے - گھریلو مشرو فیتیں اس کے خدو خال میں ایک عجیب سی کشش پیدا کر دیتی تھیں - اس کی محمور آنکھیں عمر خیام کی دور باعیاں تھیں، جن کو دیکھتے ہی مجھے سرور ہو گیا - اور میں بن پئے جھوٹے لگا - اُس نے مجھے ایک نیا جنم نیا وجود دیا - اس کے شاعرانہ حسن میں جادو تھا - اس نے میرے اندر چھپے ہوئے برفانی آدروں میں آگ لگا دی - اس سے پہلے میں نے کبھی کسی لڑکی سے محبت نہ کی تھی - میرا غنسی وجود لکڑی کا، لوہے کا، پتھر کا، برون کا بت تھا - حرکت و حرارت سے خالی - ایک بہت بڑا گلیشر جو صنوبر کے سایوں میں گھری ہوئی کسی جھیل کی سطح پر جما ہوا ہو - اور پھسلنے یا پگھلنے کا نام ہی نہ لیتا ہو - کئی اچھی لڑکیاں خود بخود میرے راستے میں آئیں - اور اس جھیل میں جھانک جھانک کر کھلے ہوئے کنول تلاش کرتی رہیں - مگر کچھ نظر نہ آیا انہیں - گلیشر سے سطح تڑکی ہوئی تھی - مگر جب نجمہ نے جھانک کر دیکھا تو گلیشر پگھل گیا - پارہ پارہ ہو گیا اور اس کے نیچے چھپے ہوئے کنول اوپر ابھر آئے - ممکنے لگے - مجھے نجمہ کے ساتھ محبت ہو گئی - میں نے اس کی محبت میں کئی افسانے - کئی کہانیاں لکھیں - اس کے نام کو اپنے ہر سانس کا وظیفہ بنا لیا - بڑی ذہین تھی وہ -

تعلیم تو کوئی خاص نہ تھی اس کی مگر مطالعہ اس کا بڑا وسیع تھا۔ پنجابی ہونے
ہوئے اردو اس کی مادری زبان معلوم ہوتی تھی۔ انگریزی میں بھی کسی حد تک بات
چسیت کر لیتی تھی۔ اور اس دن تو میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جبکہ اس نے
مجھے اپنی ایک رباعی دکھائی۔

وہ چولے کے قریب چاند بنی بیٹھی تھی۔ چادر پکا رہی تھی۔ رخسانہ اپنے
دوپٹے میں لچکا لگا رہی تھی۔ بڑے میاں سلگتی بیڑی ہونٹوں میں دبائے جنگل میں
ناچتے مور کی تصویر بنا رہے تھے۔ اور ان کی بیوی ساتھ دانے کمرے میں
میری والدہ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ بچہ مجھے دیکھ رہی تھی مگر یوں
جیسے مجھے نہیں دیکھ رہی۔ نہ جانے کسے دیکھ رہی ہے۔ نہ جانے کہاں
دیکھ رہی ہے۔ میری نظروں نے بھی اس کی نظروں کے وہ اندازہ وہ زائے
چڑا لیے۔ میں بھی اُسے یوں دیکھنے لگا۔ جیسے اُسے نہیں دیکھ رہا۔ نہ جانے
کسے دیکھ رہا ہوں۔ نہ جانے کہاں دیکھ رہا ہوں۔ ٹیلی پھٹی اندر ہی اندر کام
کو رہی تھی۔ دل گو دل سے راہ ہوتی ہے۔ محبت کی مقدس آگ دونوں طرف
بھڑک رہی تھی۔ مگر نجمہ میں اس کی آئین زیادہ تھی۔ اُسے میرے ساتھ بے انتہا
پیار تھا۔ یہ اندازہ مجھے اس کی اُس نظر سے ہوا جو اچانک اس کا دوپٹہ رخسار
سے سرکتے ہی مجھے جھونکے کی طرح چھو کر آگے نکل گئی۔ اور گنگنا تے ہوئے
میرے کانوں میں کچھ کہہ گئی۔ جسے میں نے نہیں میری روح نے سنا اور وہ بھی
گنگنا اٹھی۔ اتنے میں نجمہ کی ماں بھی آگئی۔ بڑے میاں کی باچھیں خوشی سے کھل
گئیں۔ بڑا پیار کرتے تھے اپنی بیگم سے۔ بیڑی منہ سے نکال کر باتوں کے

پتنگ اڑاتے ہوئے اپنی بیگم کے ساتھ بیچ لڑانے لگے۔ اسی اثنا میں مجھ
نے جانے کس جذبہ کے تحت اپنی جگہ سے اٹھ کر سہمی سہمی جھکی جھکی میرے
پاس آئی۔ نظریں جھکا کر چپکے سے بولی۔

”یہ رباعی میں نے آج ہی کہی ہے۔ اصلاح چاہتی ہوں۔“
وہ کاغذ کا ایک پرزہ میرے سامنے میز پر چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ جیسے
بہار کا ایک نہکا نہکا جھونکا آئے اور چلا جائے۔ کسی نے دیکھا کسی نے
نہ دیکھا۔ سانس لینے سے سانس لینے تک۔ آنکھ جھپکنے کے ایک مختصر
لمحے میں وہ آئی اور چلی بھی گئی۔ اور کاغذ کا وہ پرزہ میری نظروں میں پھیلنے
لگا۔ پھیلتے پھیلتے زمین سے لوح و قلم تک پھیل گیا۔ میں نے کاغذ کے
اُس پرزے کو کھولا۔ اس پر یہ رباعی لکھی تھی۔

جنوں اپنا ہی دلدادہ ہے اب تک

یہ مستی تشنہ بادہ ہے اب تک

اجازت ہے تمہارا نام لکھ لوں

میرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک (ماخوذ)

اس رباعی کا ہر مصرعہ، ہر شعر، ہر لفظ، ہر نقطہ میرے اندر عمر خیام
اور غالب بن کر جھولنے لگا۔ اور فقط چند لمحوں میں نہ جانے کتنے دیوان
کتنی رباعیاں، کتنی غزلیں، کتنے قطعے، کتنے قصیدے، کتنی مناجاتیں،
میں نے کہہ ڈالیں۔ مگر مجھے صرف چند شعر یاد رہے جو میں نے کاغذ کے
اس پرزے کے پیچھے اصلاح کے طور پر لکھ دیئے۔ اور پھر ایک شعر تو بیاختہ

میرے منہ سے نکل ہی گیا۔

اک نظر دور سے دیکھوں گا درو یا م ترے

حسرت شوق کو ترپا کے چلا جاؤں گا (ماخوذ)

اور فوراً ہی اس کو تے سے بڑے میاں کی آوازیوں چمکی جیسے دھوپ میں
شیٹے کا چمکارا سا پرٹے۔

”واہ سلیم صاحب واہ۔ کیا اچھا شعر سنایا۔ پھر سنائیے۔ پوری غزل

سنائیے۔ جی ہاں۔ ہم تو پوری غزل سنیں گے۔“

میں ذرا جھینپ سا گیا۔ انہیں ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ کب ٹپنے والے
تھے۔ اُچھل اُچھل کر اصرار کرنے لگے۔

”سنیں گے۔ ضرور سنیں گے۔ نہیں چھوڑیں گے۔ آپ پوری غزل

سنائیں۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ عنایت ہوگی۔“

”غزل نہیں جناب یہ سائنٹ کا زمانہ ہے۔“ میں نے کہا۔

”سائنٹ کس چیستان کو کہتے ہیں؟“ بڑے میاں بولے۔

”ہمارے ابا مرحوم بھی شاعر تھے۔ غزلیں کہا کرتے تھے۔ یہ نیا نام آج

ہی سنا ہے۔“

”جناب غزل کو انگریزی میں سائنٹ ہی کہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا اچھا ہم انگریزی نہیں سمجھتے شعروں کو سمجھتے ہیں۔ آپ غزل شروع

کریں۔“ بڑے میاں نے کہا اور اچک کر پائنتی پر رکھے ہوئے بند بستر پر

ہو گئے۔ میں نے سائنٹ شروع کی۔

”ایسے نہیں جناب ایسے نہیں۔“ بڑے میاں سر جھٹکتے ہوئے بولے۔
”اور کیسے جناب؟“ میں نے پوچھا۔

”جیسے شاعر پڑھتے ہیں۔ گا کر۔ گا کر۔“ بڑے میاں نے کہا۔ اور
مجھے ان کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ میں دھیمی آواز میں پکھنے لگا۔

پھر خیالوں کے ریگزاروں میں
آتش سوز غم جلائی ہے
سہمی سہمی سی نامتسام سی یاد
دور تک تم کو دیکھ آئی ہے
غم کے ربا یوں میں داغ حسرت دل
یوں تھرکتا ہے کپکپاتا ہے
جیسے مفلس کی جھونپڑی کا چراغ
تند جھونکوں سے ٹٹٹاتا ہے

ہر شعر پر بڑے میاں مکر مکر کا شور مچاتے رہے۔ وہ کوئی خاص پڑھے
لکھے تو نہ کھتے مگر ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا زندگی کے کسی حصے میں یا تو
کسی شاعر کے ساتھ رہے، اور یا مشاعرے سننے کا انہیں شوق رہا۔
مجھے جی بھر کر داد دی۔ ان کی بیوی اور بیٹیاں بھی ان کی پیروی کر رہی تھیں معلوم
ہوتا تھا سارا کنبہ ہی شاعرانہ ذوق رکھتا ہے۔ اچھیل اچھیل کر تڑپ تڑپ کر
داد دینے والوں میں نجمہ بھی تھی۔

اور پھر گری خاموشی چھا گئی۔ جیسے اُس مکرے میں کوئی نہ ہو۔ ایسی خاموشی میں

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی لمحے میں صدیاں گزار دیتے ہیں۔ نہ جانے کہاں تک ہو کر ایک ہی لمحے میں ہم واپس لوٹ آتے ہیں۔ جب میں نہ جانے کہاں سے واپس لوٹا تو اس گہری خاموشی میں سوچنے لگا کہ میں تو افسانے لکھا کرتا ہوں۔ کہاں کہاں لکھا کرتا ہوں۔ کبھی ایک شعر بھی تو نہیں کہا۔ نہیں کہہ سکتا۔ یہ اتنے شعر کیسے ہو گئے؟ کیسے کہہ گیا؟ یہ سوچ میرے ذہن میں اک معتمہ بنتی جا رہی تھی۔ جسے نجمہ نے فوراً ہی سلجھا دیا۔ وہ مسکرائی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں جی نہیں رہا کوئی صحیفہ پڑھ رہا ہوں۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی پھول ہوئی شفق میرے ذہن سے اچھے ہوئے معتمہ کو سلجھا گئی۔

”محبت سب کچھ کر سکتی ہے۔ یہ محبت کی سحر کا دی ہے۔“

میں اپنی نظروں سے اس کی مسکراہٹ میں کھلے ہوئے پھول چھیننے لگا میں اس کی پلکوں کی سانولی شام میں طلوع ہوتے ہوئے ستاروں کی روشنی میں گنگنا تا چلا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نشیلے ڈورے میری زندگی کے راستے بنتے جا رہے تھے۔ معاً میرے ذہن میں ایک سوچ ابھری۔ آخر میرے قدم مجھے کہاں لئے جا رہے ہیں؟ میں کدھر جا رہا ہوں؟ مگر میں نے اس سوچ کو وہیں سلا دیا۔ میں اپنے متعلق اس وقت کچھ بھی سوچنے کو تیار نہ تھا۔ میں ان راستوں ہی میں کھوجانا چاہتا تھا۔ بڑے میاں اس وقت موڈ میں تھے۔ مجھ سے ابھی کچھ اور سنتا چاہتے تھے۔ کوئی افسانہ کوئی کہانی۔ نجمہ نے انہیں لقمہ دیا۔

”ان سے ان کا افسانہ خلا سنیے۔ بڑا اچھا افسانہ ہے۔ میں نے ان کی

میز پر رکھے ہوئے رسالے میں پڑھا ہے۔“

لقمہ بڑا لذیذ تھا۔ اور بڑے میاں کو کچھ سنفنے کی بھوک لگی ہوئی تھی۔ وقت کسی کے لئے کوئی مشغلہ دیکھ رہے تھے۔ انہیں اس وقت افسانہ سنایا جاتا یا پورا رسالہ پڑھ کر سنا دیا جاتا۔ وہ تو اس وقت کچھ سننا چاہتے تھے۔ ”غلا۔ غلا“ کا شور بچانے لگے۔ مگر میں ان کی اس فرمائش کو پورا نہ کر سکا۔ کیونکہ میری زندگی میں اس وقت کوئی غلانہ تھا۔ وہ میرے سامنے تھی۔ وہ میرے پاس تھی۔ اس وقت مجھے میری زندگی تاروں بھری ایک ایسی رات معلوم ہو رہی تھی۔ جس میں آسمان کا کوئی کنارہ خالی نظر نہیں آتا۔ میں سردرد کا بہانہ کر کے کھڑکی میں آگیا۔ اور پیپل کے پیر کو دیکھنے لگا۔ پتے سرگم کر رہے تھے۔ برکھا بہار کا کوئی گیت گائے ہوئے تھے۔ پچھم کی طرف سے کالے کالے بادل آرہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے سورج اُن میں چھپ گیا۔ کوندا لپکا۔ بادل گر جا۔ بارش کا پہلا چھینٹا ایک عجیب سی جھنکار کے ساتھ دھرتی پر آیا۔ پھر ایک اور۔ ایک اور۔ اور اس کے ساتھ ہی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی پھواروں میں بھینگنے میں اس وقت مجھے کچھ عجیب سا طفت آ رہا تھا۔ میں کھڑکی میں ذرا اور آگے کو سرک گیا۔ ادب پانی پر تاپتے ہوئے بلبوں کا تماشہ دیکھنے لگا۔

زندگی بلبلا ہے پانی کا

اور وہاں کسی زندگیاں آنکھ جھپکنے میں ختم ہو رہی تھیں۔ پانی سے ابھر کر پانی ہی میں سمار ہی تھیں۔ اور پانی تھا کہ اس سے بے خبر شور مچاتا چلا جا رہا تھا۔ اُسے کچھ معلوم نہ تھا اس کی سطح پر کیا ہو رہا ہے۔ اور مجھے بھی معلوم نہ تھا بہتے وقت کی تہ میں کیا ہو رہا ہے۔ انیس خاں کی بیوی مدت ہوئی مریحکی تھی۔ وہ نہی شادی

کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے لئے ایک خوبصورت اور کمسن لڑکی کی ضرورت تھی۔ اسی سلسلے میں بندو گوالے کی لڑکی گورنی کے ساتھ اس کا رومانس کئی دنوں سے چل رہا تھا۔ دودھ میں پانی ملا کر پیچنے میں بندو کا چالان ہوا تو بستی کے چوہدری نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے چالان کو آگے نہ چلنے دیا۔ بندو کو ہرمانہ سے بچا لیا۔ وہ اسی خوشی میں دوسرے دن کی پیو سی کا نذرانہ لیکے آیا۔ اس کی بھوری بھینس نے پھڑا دیا تھا۔ انیس خاں نے اسے اپنے پاس ہی بٹھالیا۔ اور اس دن اس سے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

”بندو میاں میری بیوی کی موت سے گھر کی بربادی ہو گئی ہے۔ میں اپنا گھر لسانا چاہتا ہوں۔ بس آگے کچھ نہ کہوں گا۔ بڑے سمجھدار ہو میری بات تم سمجھ گئے ہو گے۔“

بندو واقعی سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس نے حامی بھر لی۔ مگر رکاوٹ تو گودی کے بھائی کے نہ آنے کی وجہ سے ہوتی رہی۔ وہ کراچی میں کسی مل میں لگا ہوا تھا۔ اُسے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ اسی اثنا میں انیس خاں کو اپنا گھر لسانے کے نقشوں میں اتفاقاً ایک اور گڑیا بھی نظر آ گئی۔ اس نے نجمہ کو دیکھ لیا۔ بڑے میاں کو جھونپڑے میں آئے دوسرا دن تھا۔ وہ نجمہ کے ساتھ کھڑکی میں کھڑے اس نئے ماحول کا منظر دیکھ رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ جھونپڑے کے پھوپھو اڑے میں مدت سے بند گنویں کے اوپر جھکی ہوئی پیری پر چڑیاں شور مچا رہی تھیں۔ پاس ہی ایک غیر آباد کھیرے میں جوار کی بیٹھے جوا کھیل رہے تھے۔ گھمسانا چل رہی تھی۔ کبھی چھکا کبھی تین کاٹے۔ پانچ چھ سور و پیہ مکاری

میں گھوم رہا تھا۔ لکنتھی ہاتھی دانت کے پانسہ پر نایاب رہی تھی۔ اوپر سے انیس
 خاں نے چھاپہ مارا۔ ہارے ہوئے جوارے گھسیٹے کدو چبانے سے ہرے ہوئے
 مال کی گہنی سردی میں ان کی مخبری کر دی تھی پولیس کے خیر کے آگے۔ بلی کے
 بھاگوں چھیکا ٹوٹا۔ انیس خاں لب جھپ موقع پر جا پہنچا۔ جوارے اُسے
 دیکھتے ہی اٹھ بھاگے۔ مگر کچھ جوارے جو تیز نہ بھاگ سکے پکڑے گئے۔ ہاتھ
 جوڑنے لگے۔ قدموں میں سر دھرنے لگے۔ مگر چوہدری ان چوہلیوں سے
 ماننے والا نہ تھا۔ وہ تو چاندی چاہتا تھا۔ وہ بڑی لاپرواہی سے آسمان کو
 خالی خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈال کر چوہرے کھنکانے
 لگا۔ اسی اثنا میں اچانک اس کی نظر جھوٹ پڑے کی کھڑکی میں اس وقت تنہا کھڑی
 نجمہ پر جا پڑی۔ چاندی طبع روشن ہو گئے چوہدری کے۔ اس کی نظریں جہاں
 تھیں وہیں چپک کر رہ گئیں۔

چوہدری کا ہاتھ جیب میں جاتا دیکھ کر جواروں کے ہاتھ بھی اپنی اپنی
 جیب کی طرف، نیپے کی طرف سرک گئے۔ کسی نے پانچ، کسی نے دس، کسی
 نے پندرہ، کسی نے بیس دیئے۔ خوشی سے چوہدری کی بیسی باہر نکل آئی جیب
 اس کی چاندی سے بھر گئی۔ مگر کھڑکی خالی ہو گئی۔ نجمہ ایک اجنبی مرد کو اپنے
 سامنے کھڑا دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ مگر انیس خاں اب پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔
 وہ اُسے اپنے گھر کی مانی بنانے کی کھٹان چکا تھا۔ اور ایک چکر چلانے ہی والا
 تھا کہ اچانک گاؤں سے ایک قریبی رشتہ دار کی موت کی خبر آگئی۔ اور وہ
 چند دنوں کے لئے وہاں چلا گیا۔ واپس آیا تو نجمہ کو ہمارے گھر میں دیکھ کر

بڑا حیران ہوا۔ مگر اس نے اپنی حیرانی کو زیادہ نہ بڑھنے دیا۔ ہمارا پردہ فیکر و نانبائی اپنے گھاس پھوس کے کوٹھے کی چھت پر کبوتروں کا کباب کھولے بیٹھا تھا۔ حقہ گڑ کا رہا تھا۔ نظریں اس کی خلاء میں قلا بازیاں لگاتے ہوئے اپنے خمرے پر جمی تھیں۔ انیس خاں لپک کر آگے ہوا اور بانس کی سیڑھیوں پر جلدی جلدی چڑھتے ہوئے کوٹھے پہنچ گیا۔ چیونٹی کے گھر اوتار چلا آیا تھا۔ فیکر و سلام کرتے ہوئے ایک دم سپاٹ کھڑا ہو گیا۔ انیس خاں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھالیا۔ حقہ گڑ کا تے ہوئے باتیں کرنے لگا۔ دیر تک وہیں بیٹھا اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اور اپنا مطلب حل کر لیا۔

فیکر و نانبائی اس بستی کا چلتا پھرتا روزنامہ ہے۔ ڈے بک ہے۔ صبح سے شام تک اس بستی میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے سینے پر لکھا ہوتا ہے۔ اس نے انیس خاں کو بتایا۔

”یہ لوگ جیونپڑا دھونڈتال بارش میں گر جانے سے یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ مکان ڈھونڈ رہے ہیں۔ مل جائے گا چلے جائیں گے۔“

”مکان ڈھونڈ رہے ہیں۔“ یہ ایک جملہ انیس خاں کے ذہن میں فوراً ہی ایک سکندل بن گیا۔ اور اس نے فوراً ہی اس سکندل کو چالو کر دیا۔ شام کو میں گھر آیا تو اس نے مجھے راستے ہی میں روک لیا۔ کہنے لگا۔

”سلیم صاحب اگر آپ بڑا نہ منائیں تو ایک بات کروں۔“

”ضرور کریں۔“ میں نے کہا۔

”آپ خاندانی آدمی ہیں۔ بڑے شریف ہیں۔ آپ کے باپ دادا سنا ہے

بڑے نامور لوگ تھے۔ دنیا اب بھی بڑی عزت سے ان کا نام لیتی ہے۔ ایس
خاں نے کہا۔

”آپ کے شہر کے رہنے والوں سے بڑی تعریف سنی ہے آپ کی اور
آپ کے گھرانے کی۔“

”جی جی آپ جلدی سے بات کریں مجھے ایک ضروری کام ہے۔“ میں نے
مصرفیت ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

”یہ لوگ جنہیں آپ نے گھر میں پناہ دی ہے خانہ بدوش لوگ ہیں۔“ انیس
خاں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”بدنام لوگ۔ خانہ خراب لوگ۔ جو ان کے ساتھ مل بیٹھے اس کا بھی
خانہ خراب کر دیتے ہیں۔ میں انہیں دیر سے جانتا ہوں۔ انہیں کئی
بستیوں سے نکالا جا چکا ہے۔ عزت والے لوگ ایسے لوگوں
کو کب پاس آنے دیتے ہیں۔ اپنی ہو بیٹیوں کی عزت کا ہر شریف
آدمی کو خیال ہوتا ہے۔“

”جی یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”میں کہنا چاہتا ہوں یہ دونوں لڑکیاں خراب ہیں۔ آپ کو کچھ خبر نہیں۔
آپ اپنے کام پر ہوتے ہیں۔ یہ جب دیکھو کھڑکی میں ہوتی ہیں۔“
انیس خاں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ان کا کیا جائے گا گھر تو آپ کا بدنام ہوگا۔ سارا دن مشنڈول اور
لوفروں کا تانتا لگا رہتا ہے آپ کے گھر کے سامنے۔ نکالنے ان

گندی مچھلیوں کو یہاں سے کہیں سارا جل گدا نہ کر دیں۔“

میں اس شخص کی فطرت و خصلت سے خوب واقف تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ بستی کے اس بگلا بھگت کو خوب سمجھتا تھا۔ ایکشن میں غریبوں کے ووٹ لینے کے لئے رات کے اندھیرے میں چپکے سے ان کے جھونپڑوں کو آگ لگوا کر ان کی راکھ کے ڈھیر پر سر رکھتے ہوئے جب یہ رویا تھا تو میں نے اس کے آنسوؤں کو مگر چھ کے آنسو کھا تھا۔ مصنوعی آنسو۔ موم کے آنسو۔ اسی ہنگامے میں اس نے ایک اور ڈھونگ بھی رچایا تھا غریبوں کے لئے نئے جھونپڑے بنانے کے لئے اس نے پانچ سو روپیہ دیا۔ اور دوسرے غیر لوگوں سے بھی چندہ لیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق چندے میں اس نے دو ہزار روپیہ اکٹھا کیا۔ جس میں سے سات سو روپیہ یہ بڑی استادی سے بغیر ڈکار کے ہضم کر گیا۔ پانچ سو روپیہ تو وہ جو اس نے اپنی جیب سے دیا تھا اور دو سو روپیہ اس کے سود میں سمجھ لیجئے۔ اور بقایا رقم کی غریبوں میں بندوبست کی۔ جہاں کوئی دلچسپی، کوئی دل لگی دیکھی وہاں زیادہ دے دیا، اور جہاں کچھ نہ دیکھا وہاں بھی دیا مگر نہ دینے کے برابر۔ مجھ سے اس خبیث کی کوئی شناخت چھپی نہ تھی۔ بڑے سکون سے اس کی باتیں سن کر میں نے چلتے ہوئے کہا۔

”یہ لوگ اپنا جھونپڑا درست کرنے والے ہیں۔ پیسوں کا بندوبست کر رہے ہیں۔ خود ہی چلے جائیں گے۔ میں کسی کو کسی کی پریشانی میں اور زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔“

میری یہ بات اسے بڑی ناگوار گزری مگر خاموش رہا اور اندر ہی اندر اس نے

ایک اور سکندڑ چلا دیا۔ نجمہ سے پوشیدہ بڑے میاں سے دوستی کا سہمہ لے کر ان کے کان بھرنے لگا۔ میرے خلاف ان کے ذہن میں نہ ہر بھرنے لگا۔

”سلیم کا چال چلن ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لئے تو ابھی تک کنوارا بیٹھا ہے۔ یہ شراب پیتا ہے۔ جو اکیلے ہوتا ہے۔ بدنام عورتوں کو لیکے ہوٹلوں میں جاتا ہے۔ اگر اس کو آپ کے اس خادم کا خوف نہ ہو تو اس بستی میں بھی نہ جانے کیا کیا کھلائے۔ یہ کوئی کام نہیں کرتا کہیں ملازم نہیں ہے۔ یونہی دکھاوے کے لئے چمڑے کا بستہ سا بغل میں دبائے صبح کے وقت گھر سے نکل جاتا ہے۔ اور سہرا پھیری کر کے شام کو آ جاتا ہے۔ کہتا ہے میں کہانیاں لکھتا ہوں۔ کہانیاں بیچتا ہوں۔ اب آپ ہی بتائیے یہ بھی کوئی کام ہے۔ یہ بڑا جھوٹا ہے۔ بڑا جھوٹ بولتا ہے۔ وہ تو آپ کے خادم کو اس کی اندھی ماں پر ترس آگیا اسے بچالیا۔ ورنہ اب تک جیل میں جوتے کھا رہا ہوتا۔ یہ بدوہ فروش ہے۔ عورتیں بیچتا ہے۔ خدا کے لئے اس سے اپنی بیٹیوں کو بچا لیے۔ اگر آپ کو مکان کی نجوری ہے تو میرے اس بستی میں دو مکان ہیں۔ کل شام تک میں آپ کو حویلی میں جگہ خالی کرادوں گا۔ آپ کی خاطر کسی کرائے دار کو نکال دوں گا۔ اور اگر آپ اپنا جھونپڑا بنانا چاہتے ہیں تو میں آپ کی ہر طرح سے مدد کرنے کو تیار ہوں۔ میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ آپ کی شرافت نے مجھے آپ کا گرویدہ کر لیا ہے۔ میں آپ کو اپنے پاس حویلی میں رکھوں گا۔ آپ کسی قسم کا فکر نہ کریں۔“

نہ صرف یہ بلکہ ایسی ہی بے شمار باتیں جو انیس خاں نے بڑے میاں سے کہیں انہوں نے اپنی بیگم سے کہہ دیں۔ بیگم نے اپنی بیٹیوں کو بتائیں اور ان کی بیٹی نجمہ نے مجھے بتا دیں۔ بڑے میاں کی بیگم نے ایک دن اشارتاً میری ماں سے نجمہ کی شادی کی بات کی تھی۔ اور میری بڑی تعریف کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا تھا کہ سلیم سے اچھا لڑکا ہمیں نہ مل سکے گا۔ مگر انیس خاں کی باتیں سن کر میرے متعلق اُن کے نظریے ہی بدل گئے۔ اس کی بناوٹی باتیں سن کر بڑے میاں بن گئے۔ سکنڈل ساز مکڑی نے ایک سیدھی سا دھمی بھولی بھالی مکھی کو اپنے جال میں بڑی آسانی سے پھانس لیا۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت وہ اپنا ساز و سامان اکٹھا کرنے لگے۔ میری والدہ نے ان کی بیگم کو اور میں نے ان کو بڑا سمجھایا۔ انیس خاں کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ شام کے وقت اپنا سامان اٹھا کر اپنے کنبہ کے ہمراہ چل دیئے۔ وہ بڑا حسرتناک منظر تھا۔ نجمہ کی آنکھوں میں آنسو جھلکا رہے تھے۔ سب کی نظروں سے بچ بچا کر کاہنیتے ہاتھوں سے اس نے مجھے جاتے ہوئے سلام کیا۔ اور آنسوؤں سے کھلکی ہوئی اپنی اک نظر میرے پاس چھوڑ کر چلی گئی۔

اک نظر دور سے دیکھوں گا دروہام ترے

حسرت شوق کو ترپا کے چلا جاؤں گا

اُس نظر میں کیا کچھ نہ تھا۔ اس نظریں سب کچھ تھا۔ حوصلہ، تسلی، عزم، آنے والی مشترکہ زندگی کے وعدے، منصوبے، مسکراہٹ۔ اس کی اُس نظریں وہی جادو تھا جو رگ وید اور یجر وید کے منتروں میں ہے۔ اُس نظر میں وہی

مٹھاس تھی جو گیتا کے ہر شوک میں ہے۔ اس نظر میں وہی معصومیت وہی تقدس تھا جو تو ریت و انجیل کی ہر آیت میں ہے۔ اُس نظر میں محبت کے وہی گیت تھے جو بیگور کی گیتا بجلی میں ہیں۔ اس کی وہ نظر میری زندگی کے اندھیروں میں اجالا کر گئی۔

گو تم کو برگد کے پیڑ سے گیان ملا تھا۔ مجھے نجمہ سے گیان ملا۔ گو تم نے پر ماتا کو ایک روشنی میں دیکھا تھا۔ میں نے خدا کو پہلے نجمہ میں اور اس کے بعد ہر انسان میں دیکھا۔ وہ نظر مجھے انسان بنا گئی۔ میرے اندر بڑی سوچیں جگا گئی۔ وہ رات میں نے سوچتے ہی سوچتے گزار دی۔ میں ساری رات سوچتا رہا۔ اپنے متعلق۔ نجمہ کے متعلق سکندل ساز لوگوں کے متعلق جو ہر معاشرے ہر ماحول میں شرافت و ہمدردی کے سائن بورڈ پھرے پر لگائے اپنی روح اور ضمیر میں ساری کائنات کی گندگی اور غلطی سمیٹے ہر گلی، ہر بازار، ہر علاقے ہر شہر میں موجود ہیں۔ جنگی روح میں رستے ہوئے ناسور ہو چکے ہوتے ہیں۔ جن کا ضمیر کا رنیکل پھوٹا بن چکا ہوتا ہے۔ جس کے ہر لمحہ خالی ہوتے اور بھرتے ہوئے زخم کی پیپ کی بھر اس ان کے اندر ایک ایسا کوڑھ پیدا کر دیتی ہے جسے وہ دوسرے انسانوں میں پھیلا کر خوش ہوتے ہیں جو دوسروں کی پرسکون زندگی کی گہرائیوں میں سکندلوں کے بڑے بڑے پتھر پھینک کر بے چینوں کے بھنور پیدا کرتے ہیں۔ اس رات میں نے ایسے لوگوں کے متعلق بہت کچھ سوچا۔ اور اب بھی سوچا کرتا ہوں۔ کیونکہ میں نے ان کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ کئی کہانیاں۔ کئی افسانے۔ کئی نئے تجربے، تجزیے کرنے

ہیں۔ مجھے اپنے افسانوں اور کہانیوں سے ان کی روح کے رستے ہوئے
نا سورا اور ضمیر کے کاربنکل کا علاج کرنا ہے۔ مجھے ان کو نجمہ سے حاصل کیا
ہوا گیان دینا ہے۔ ان کے دل کی بند آنکھیں کھولنی ہیں۔ تاکہ یہ خدا کو دیکھ
سکیں۔ پہچان سکیں۔ جو ہر جگہ موجود ہے۔ ہر چیز میں موجود ہے۔ جو سب کچھ
دیکھتا ہے۔ سب کچھ سنتا ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں اپنی سوچوں
کی چھتری تانے ٹھنڈی سرک پر اپنے سینوں کے پیچھے آوارہ پھر رہا تھا۔ ٹھنڈی
ٹھنڈی ہوا اور بوندا باندی سے موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ خوب چہل پھل
ہو رہی تھی۔ میں کیسیٹوں سے ذرا آگے نکلا تو سرک کے اوپر دو درختوں کے
درمیان کپڑے کا ایک لمبا سا پنیل لٹکتے دیکھا۔ جس پر بڑے بڑے حروف میں
یہ جملے لکھے تھے۔

”تپ دق کے خلاف جہاد کرو۔“

”تپ دق کے خلاف محاذ قائم کرو۔“

”ٹی ٹی ٹی ٹی خرید کر دق میں مبتلا پنڈرہ لاکھ افسانوں کی امداد کرو۔“

ان جملوں نے میری تیز تیز چلتی ٹانگوں میں بریک سی لگا دی۔ تپ دق اور
جہاد۔ فلم کار ہونے کی حیثیت سے میں نے ان جملوں کا فنی جائزہ لیا۔ جہاد
تو بڑی مقدس چیز ہے۔ اور تپ دق ایک بڑی ہی نفس بیماری ہے۔ اور
دوسرے جملے میں تپ دق اور محاذ کے الفاظ مجھے بے محل معلوم ہوئے۔ محاذ

تو اس وقت قائم کئے جاتے ہیں۔ جب ایک قوم دوسری قوم کو پامال کرنے کے لئے۔ غلام بنانے کے لئے۔ اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے کے لئے میدان جنگ میں اترتی ہے۔ جب ایک ملک غاصبانہ قبضہ جمانے کے لئے دوسرے ملک پر یلغار کرتا ہے۔ مگر دق تو ایک مرض ہے۔ اس کا ملک اور قوم سے کیا تعلق۔ بظاہر تو یہ حملے مجھے خود بھی مدقوق سے معلوم ہوئے۔ کھانٹتے اور لہو کھتوکتے بیمار جملے، جیسے ابھی ابھی آپریشن ٹھیڑ سے نکلے ہوں اور ان سے کلوروفارم کی بو آرہی ہو۔ کبھی کبھی انسان کا ذہن یوں بھی سوچا کرتا ہے۔ یوں بھی محسوس کیا کرتا ہے۔ مجھے نیند سی آنے لگی۔ میں جاگ رہا تھا مگر یوں جیسے نہیں جاگ رہا۔ اسی آشنا میں بادلوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ایک بوند میری کنپٹی پر گدی تو میں چونک گیا۔ میرے ذہن نے ایک کر دٹ سی لی۔ غیر ارادی طور پر میری نظریں ایک بار پھر اُس کی طرف اٹھ گئیں۔ میں نے ان حملوں کو ایک بار پھر اپنے ذہن میں دہرایا۔ اور عبارت آرائی سے ہٹ کر ان کے مفہوم پر غور کیا تو بس گرم کاغذ کاغذ کے ایک بربز فحان کا سرور آگیا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میرا دل خوشی سے بلبوں اچھلنے لگا۔ انسان بیدار ہو گیا ہے۔ انسان چاند میں پہنچ گیا ہے۔ انسان نے زمان و مکان کو تسخیر کر لیا ہے۔ انسان نے اپنے اصلی دشمن کا پتہ لگا لیا ہے۔ انسان اب انسانوں سے نہیں بیماریوں سے لڑے گا۔ انسان اب ملکوں اور قوموں کو نہیں بیکر اں خلا کو جیتے گا۔ موت کو جیتے گا۔ وباؤں اور ان کو پھیلانے والے جراثیم کے خلاف محاذ قائم کرے گا۔ ان کے خلاف جہاد کرے گا۔

انسان اب طوفانوں اور زلزلوں کے خلاف سینہ سپر ہو گا۔ انسان اب جنگی ہتھیار نہیں بنائے گا ٹریکٹر بنائے گا۔ غلام اور دراکٹ بنائے گا۔ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے غذائی بحران کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ اناج اگاے گا۔ اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کو چاند تاروں میں منتقل کرے گا۔ وقت کا یہی تقاضا ہے۔ ہر ملک ہر قوم اس وقت اسی سطح پر سوچ رہی ہے۔ اسے پیچھے نہیں آگے بڑھنا ہے۔ اسے باتوں کے بیلون نہیں اڑانے عملی طور پر کچھ کرنا ہے۔ افقی یہ ایک جہاد ہے۔ ایک مقدس نہم ہے۔ جس کے صرف خیال ہی سے انسان کی آدھی مصیبتوں اور پریشانیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

میں نے انسان کے ماضی پر ایک بیساختہ قہقہہ لگایا۔ کیسی کیسی خطرناک باتوں سے نکلا ہے انسان۔ کیسے کیسے ریگستان عبور کئے ہیں انسان نے جیسے کیسے جنگلوں میں ابتدائی زندگی گزاری ہے انسان نے اور نہ جانے کتنی بول کے بعد اس مقام پر پہنچا ہے جہاں اب اسے اپنی منزل کے نشان سرانے لگے ہیں۔ اسی خوشی میں ایک اور قہقہہ میرے حلق سے چھوٹ گیا۔ بچے سے ایک اور اچھڑا ہوا تھا۔ لیکن وہ حلق میں پہنچتے ہی بھاپ بن کر نکل گیا۔ بن کر خارج ہو گیا۔ جیسے پتھر ہو جانے سے ٹائیٹر کی پھونک نکل جائے یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ میرے آس پاس کچھ ہو رہا تھا۔ آتے جاتے لوگ۔ بیڈیز۔ قہقہے اور ان کے ہنسنے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سنا رہے تھے۔ مگر میرے یکدم سنجیدہ ہو جانے سے وہ بھی سب سنجیدہ گئے۔ جیسے انہوں نے میرے متعلق اپنے کسی اندازے کو فوراً ہی بدل دیا

ہو اور میں اپنی حماقت کو حیرت کے عاشیوں میں چھپائے آگے کو حرکت کرنے لگا۔ حرکت میں برکت ہے۔ اب جو میں نے حرکت کی تو میرے گیان دھیان کی آٹومیک مشین بھی حرکت میں آگئی۔ اور میری آنکھوں میں روحانیت کے حمارے بھی حرکت کرنے لگے۔ جس سے میں اور زیادہ حساس ہو گیا۔

ایک جگہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑے تناور درخت کے تنے سے آدھا چپکا ہوا آدھا لٹکا ہوا ایک پوسٹر راہ گیروں سے ملتی تھا کہ اس کے لٹکے ہوئے حصے کو سیدھا کر کے اُسے بڑے غور کے ساتھ اوپر سے نیچے تک پڑھا جائے۔

انسان کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔ جبکہ اس کا سویا ہوا احساس جاگتا ہے۔ اور کائنات کی ہر چیز اُسے اپنے ساتھ ہم کلام ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بڑا ہی مقدس وقت ہوتا ہے۔ اس وقت انسان اپنی انا کے بہت قریب ہوتا ہے۔ ایک عجیب سی کیفیت اس پر طاری رہتی ہے۔ اور اُس کیفیت کا دوسرا نام محبت ہے۔ اپنے آپ سے محبت۔ دوسروں سے محبت۔ تمام کائنات سے محبت۔ محبت ایک لازوال قوت ہے جب انسان محبت کے اس بھید کو پالیتا ہے۔ تو لازوال ہو جاتا ہے۔ باکمال ہو جاتا ہے۔ پھر اُسے چاند تاروں میں اترنے کے لئے خلا میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چاند تارے اس کی تلاش میں زمین پر اترتے ہیں۔ میں نے پوسٹر کو سیدھا کر کے پڑھنا شروع کیا۔ دق کے مریضوں کے لئے ایک چسپٹ کلینک بنانے کے لئے امدادی مشاعرہ ہو رہا تھا۔ داخدا بذریعہ ٹکٹ تھا۔

مشاعرہ کی ساری آمدنی ٹی بی فنڈ میں جانی تھی۔ ملک کے نامور شاعر اور شاعرات

اُس مشاعرے میں شرکت کر رہی تھیں۔ طرح مصرعہ تھا۔

صبح سے شام ہوئی ایک جہاں گزرا ہے

اور میرے گمان دھیان کی اُس وقت خدا کے عرش سے لگی ہوئی سیڑھی خود بخود
ہلنے لگی۔ جیسے زلزلے کے جھٹکے آ رہے ہوں۔ پندرہ لاکھ انسان زندگی اور
موت کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ پندرہ لاکھ مدقوق انسان۔ پندرہ لاکھ زرد چہروں
والے کھانستے لہو کھتوکتے ڈھانچے۔ اور میں نے اپنے دل سے فیصلہ کر لیا
کہ اس مشاعرے کے لئے ضرور کوئی سائینٹ، کوئی غزل، کوئی نظم کہوں گا۔
شاعر بنوتے ہوئے اگر میں تجہ کی محبت میں ایک سائینٹ کہہ سکتا ہوں تو پندرہ
لاکھ زندہ لاشوں کے لئے بھی مجھے کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہو گا۔ مجھے ان کے ساتھ
بھی محبت ہے۔ ہم سب انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے
جدا نہیں ہیں۔ میں اس مشاعرے میں ضرور کچھ نہ کچھ پڑھوں گا۔ میں نے اپنے
دل کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ اگر راک فیلر، ہینری فورڈ، آدم جی، واؤد جی اپنی
دولت میں سے بہترین ذہنی تخلیق پیش کرنے والوں کو ہزاروں ڈالر ہزاروں
روپے دان میں دے سکتے ہیں۔ تو کیا میں اپنے پندرہ لاکھ دکھیا بھائی بہنوں
کو ایک غزل کا دان نہیں دے سکتا؟ ضرور دوں گا۔ ضرور دینا چاہئے، یہ
میرے دل کی۔ میری روح کی۔ میرے گمان دھیان کے گوتم کی آواز تھی۔
مجھے ان کے متعلق۔ ان کے لئے بہت کچھ لکھنا ہے۔ کئی افسانے۔ کئی
کہانیاں۔ اور اُس عرصہ تک لکھتے رہنا ہے۔ جب تک کہ دق میں مبتلا یہ
پندرہ لاکھ انسان صحت یاب نہ ہو جائیں۔ اس عرصہ تک لکھتے رہنا ہے۔

جب تک یہ قومی خطرہ، یہ متعدی بیماری اس ملک سے دور نہیں ہو جاتی۔
پندرہ لاکھ مدقوق انسانوں کے لئے میری محبت کا سمندر اس وقت کھول
اٹھا تھا۔ میرے جذبات کے موتی اچھل اچھل کر باہر آ رہے تھے۔ چند اشعار
تو وہیں کھڑے کھڑے ہو گئے۔

صبح سے شام ہوئی ایک جہاں گزرا ہے
ہر حسین سائے پہ تیرا ہی گماں گزرا ہے
وائے دار فتگی شوق کہ ہر آبٹ پر
تیری پائل کے چھنا کے کاگماں گزرا ہے (ماخوذ)

میں ابھی ان اشعار کو چاکلیٹ بار کی طرح چسکے لے لے کر چوس رہا تھا کہ
ادھر سے ٹی بی ٹکٹ بیچنے والے کا لجنیٹ لڑکے لڑکیوں کی ایک ٹولی آگئی۔
ایک نے ایک بازو تھام لیا۔ دوسرے نے دوسرا بازو۔ دونازک سے،
شبنم سے ہاتھ میرے سینے پر دونوں طرف دونوں پھیپھڑوں کے اوپر ٹی بی
ٹکٹ چسپاں کرتے ہوئے ہنسنے لگے۔ دور و پے میں پیسے تھتے بندے
کی جیب میں۔ نکال کر فوراً پیش کر دیئے۔ اس وقت اگر میرے پاس دوارب
روپیہ بھی ہوتا تو انسانیت کے دکھ دور کرنے کے لئے پیش کر دیتا۔ اس کے
نتیجے میں چاہے مجھے ساری عمر قلاش و دیوالیہ ہو کر ہی کیوں نہ جینا پڑتا۔ انسانیت
بڑی مہنگی اور قیمتی شے ہے۔ امنول ہے۔

دوسرے دن میری ایک کہانی کا سودا ہوا۔ اچھے داموں بک گئی۔ گاہک
مستحق ٹیشن قسم کا پلہشر تھا۔ کہانی کا گوشت اور چربی ٹوٹنے والا۔ جھبوں اور

مرکالموں کا قہ کاٹھ دیکھنے والا۔ مسودے کا وزن جانچنے والا۔ کہ کیا کیا چیزیں
کتنی ہے۔ اور مجموعی وزن کتنا ہے۔ مسودہ ہاتھوں میں لے کر پہلے اُس نے
صفحات گنے۔ پھر سطریں گنیں۔ الفاظ گنے۔ ہر باب پر نظر ماری۔ بولا۔
”مسودہ چھوٹا ہے۔“

میں نے کہا۔

”یہ الفٹ لیلے نہیں ہے۔ طلسم ہو شر یا نہیں ہے۔ چار پانچ سو
صفحات کا ناول ہے اور بس ٹھیک ہے۔ مناسب غنماست ہے۔
آئرنی قائم رکھنے کے لئے اس قسم کے ناول کو بس اتنا ہی لمبا ہونا
چاہیئے۔ شیطان کی آنت نہ ہونا چاہیئے۔ دریائے نیل نہ ہونا چاہیئے
مسودے کا حدود اور بعد نہ دیکھیئے۔ یہ دیکھیئے کہ اس میں لکھا کیا ہے۔“

اور میں نے پلشر کو پورا ایک باب پڑھ کر سنایا جو اُسے بڑا پسند آیا۔ مسودہ
اس کی بغل میں اور نوٹ میری جیب میں۔ وہ ادھر میں ادھر۔ اپنی اپنی زندگی
کے الگ الگ راستے ہیں۔ رقم کا آدھا حصہ میں نے اُسی دن ٹی بی فنڈ میں
دے دیا۔ جاڑے کا موسم آرہا تھا۔ اس رقم سے میں نے ایک چمڑا گرم کوٹ
مفلا اور سوئیٹر خریدنا تھا مگر ملتوی کر دیا اس ارادے کو۔ میں نے سوچا۔ زندگی
اور موت کے درمیان پڑے ہوئے پندرہ لاکھ انسانوں کا پہلے کچھ بن جائے۔
چمڑا گرم کوٹ تو پھر بھی بن سکتے ہیں۔ جسم اگر جاڑے سے ٹھہرتا ہے تو
ٹھہر جائے مگر انسان کی روح کو نہ ٹھہرنا چاہیئے۔ روح کی وادیوں میں برت
کے تو دے نہ جتنے چاہئیں۔ گرم کپڑے صرف جسم کو گرمی پہنچا سکتے ہیں۔ روح

کو گرم یا ٹھنڈے کپڑوں کی ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال میں نے اپنی روح کو تو نہ ٹھنڈے دیا مگر میرا جسم پورے چھ مہینے جاڑے سے ٹھنڈے تار ہا پرانا گرم کوٹ گھس گھسا کر بیکار ہو چکا تھا۔ شدید سردی کو نہیں روک سکتا تھا۔ ایک دن ادھے پڑے تو بندے نے روحانیت کے بڑے ہی نظارے دیکھے۔ میں روحانیت کے اتنے اونچے زنیوں تک ہو آیا کہ دوسرے دن زکام ہو گیا اور مجھے دوائی لینے کا رپوریشن کی فری ڈسپنری میں جانا پڑا۔ داپسی پر راستے میں چند دوست مل گئے۔ وہ کافی ہاؤس جا رہے تھے۔ غپ شپ اڑانے میں بھی ان کے ساتھ ہو گیا۔ سنڈے ٹکنی کھر پر وگرام تھا۔ کافی ہاؤس کھچا کھچا ہوا تھا۔ کیمرے اور ڈانس۔ رمبا۔ فاکس ٹراٹ۔ ٹینجو۔ ہلکی پھلکی موسیقی۔ آرکسٹری کے سازوں میں سیکسوفون کی آوازیں ٹیپ کے سروں میں سنائی دے رہی تھیں۔ کافی اور کوکو کی بھیتی بھیتی فلیور سلگتے ہوئے سگریٹوں کی فلیور کے ساتھ گھل مل کر مانٹی کارلو کے کسی کارنوال کا ماحول پیدا کر رہی تھی۔ مگر میرے گیان و صیوان میں سمادھی لگا کر بیٹھا ہوا گوتم اس ماحول سے کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی جنم بھومی، اس کی راج بھومی کے پندرہ لاکھ انسان زندگی اور موت کے خلا میں پڑے سمک رہے تھے۔ پندرہ لاکھ لہو تھوکتی کھانستی زرد زندہ لاشوں کی آرتیاں، جنازے مرگھٹ کی طرف چلے جا رہے تھے۔

کیل دستو کے گوتم نے صرف ایک لاش، ایک آر تھی، ایک جنازہ دیکھ کر راج پاٹ بیوی بچے چھوڑ دیئے تھے۔ اپنا سکھ چین چھوڑ کر انسانوں کے

لئے ملکتی اور نروان حاصل کرنے بستیوں سے دور، محل ناٹریوں سے دور
 بگھڑوں میں نکل گیا تھا۔ وہ سب کچھ تیار کیا تھا۔ سب کچھ چھوڑ گیا تھا۔ میرے
 گیان دھیان کا گوتم کیا کیبرے اور ڈانس نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کافی کے گھونٹ
 نے میرے حلق میں کوئین کا ذائقہ اختیار کر لیا۔ کپ میز پر رکھتے ہوئے میں
 خاموشی سے دروازے کی طرف سرک گیا۔ میرے دوست مجھے آوازیں
 دیتے رہے۔ بلاتے رہے۔ مگر میں نے ان کی کسی آواز کا کوئی جواب نہ
 دیا۔ پندرہ لاکھ سسکتی ہوئی روحوں کی دردناک آوازیں مجھے اپنی طرف بلا رہی
 تھیں۔ میں نے ان کے لئے ملکتی اور نروان حاصل کرنا تھا۔ ملکتی و نروان۔
 جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے پہلا قدم اپنی بستی سے اٹھانا تھا۔ گیان
 دھیان کے اُس اونچے درجے کی پہلی میٹر بھی میری بستی میں تھی۔ جھوٹوں اور
 ڈھاروں میں بچپن فی صد انسان لہو کھوک رہے تھے۔ کھانس رہے تھے یہ
 پیراستہ جنت کو جاتا ہے۔ وہ راستہ جہنم کو جاتا ہے۔ یہ نیکی کا راستہ ہے۔
 وہ بدی کا راستہ ہے۔ یہاں بے شمار راستے ہیں۔ راہی بدھ چاہے چلا
 جائے۔ مگر مجھے ملکتی و نروان کا راستہ دیکھنا تھا۔ کیبرے اور ڈانس۔ ہلکی پھلکی
 موسیقی۔ سنڈے ٹکنی کلر پر دگام۔ یہ سب بعد کی چیزیں ہیں۔ انسانیت
 سب سے پہلے ہے۔ کافی، کوکو اور سگریٹوں کے فلیور کی گھٹی گھٹی فصحا سے
 نکل کر میں اپنے گیان دھیان کی فضا میں آگیا جس میں پرانی بستی میں خاموش بکٹری
 ہوئی مولسری کے پھولوں کی مہک ٹھلی ہوئی تھی۔ وہ مہک گوندی پیر کے تکیے
 کے الٹے لوگوں اور بستی کے سکندراں سازوں کو اپنی طرف بلا رہی تھی میری غروت

آؤ۔ یہ مہک ہی تمہاری منزل ہے۔ اس مہک کو اپنی ساری زندگی میں بسالو۔
چرس چاٹو نہ پیو اس مہک کو پیو۔ تمہارا ہر سانس مہک جائے گا۔ تہلے
لہو کی ہر لہو مہک جائے گی۔ تم ملتی و نروان پاؤ گے۔ گیان پاؤ گے۔ وہ
رودھنی پاؤ گے جس کا ہر انسان کی زندگی میں ہونا بہت ضروری ہے۔ اندھیروں
کے مسافرو۔ الجھے الجھے راستوں کے راہیو۔ یہ کھٹن منزلیں، یہ راستے اسی
رودھنی میں طے ہوں گے۔

میں گیان دھیان کی فضا میں ملتی و نروان کے گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔
دکھیا رہے انسانوں کے دکھ درد کی کہانیاں لکھنے والے گیانی گوتم کے دل
کا کنول کھل رہا تھا۔ ہر طرف سے خوشبو کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس
ہو رہا تھا۔ جیسے میرے قدم آسمان کی طرف اٹھ رہے ہیں۔ کاکشاؤں کی
طرف اٹھ رہے ہیں۔ میں اپنی کہانی کی قیمت کا ادھاحصہ ٹی بی فنڈ میں دے کر
بڑی خوشی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ایک عظیم کہانی لکھی تھی۔

ادھر نجمہ نے بھی بڑا عظیم کام کیا تھا۔ اس نے انیس خاں کے ساتھ
شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لالچ کا پتلا ہے انسان۔ انیس خاں نے
بڑے میاں کو لالچ دیا۔

”میں نجمہ کو اس بستی میں ایک نیا مکان بنا دوں گا۔ پانچ ہزار روپیہ
حق نہر ہو گا۔ دس تولے سونا اور پچاس بڑے ہی نفیس جوڑے۔
اور آپ کے لئے بڑے میاں میں نے یہ سوچا ہے کہ آپ کو اس
بستی میں منیاری کی ایک دکان کھول دوں۔ دس بارہ ہزار روپے کا

اس میں مال ڈال دوں۔ اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں محنت مشقت
نہیں کر سکتے۔“

دس بارہ ہزار کا مال۔ منیاری کی دکان۔ مکان۔ پانچزار روپیہ حق مهر۔ سونا
چاندی۔ بڑے میاں دولت کے چکر میں آ گئے۔ وہ اپنی بیٹیوں کا ہمسر بنانے
کے لئے مدت سے محنت مزدوری کرتے کرتے تھک چکے تھے لیکن ابھی
تک بڑی مشکل سے چھ جوڑے، دو تولے سونا، بارہ تولے چاندی اور کچھ
برتن بن سکے تھے۔ اونچے اونچے دو پہاڑ کھڑے تھے ان کے کندھوں پر۔
مگر اب ایک پہاڑ کا بوجھ تو انہیں خاں اپنے کندھوں پر اٹھانے کو تیار تھا۔
اس نے بڑے میاں سے کہہ دیا تھا۔

”آپ کچھ فکر نہ کریں۔ میں سب کچھ کر لوں گا۔ جتنی جلدی ہو سکے
آپ ہمارے دو کلمے پڑھانے کی بات کریں۔“

اور بڑے میاں اس سے زیادہ جلدی میں تھے۔ وہ اپنے فرض کے بوجھ
کو جتنی جلدی ہو سکے سر سے اتارنا چاہتے تھے اور ہر چیز مکمل ہو چکی تھی۔
انہیں خاں نے سب کچھ دنوں ہی میں تیار کر لیا تھا۔ مگر نجمہ اس کے ساتھ نکاح
پڑھانے کو تیار نہ ہوئی۔ اس دروازے سے مولوی اندر آیا اس دروازے
سے نجمہ چپکے سے گھر سے باہر گئی اور بھگدڑ مچ گئی۔ نجمہ سیدھی میرے پاس
آئی۔ مجھے ہر بات سے آگاہ کیا۔ کہنے لگی۔

”اب میں واپس نہیں جاؤں گی۔ سلیم بابو تم نے اگر میرا ساتھ نہ دیا
تو خود کشی کر لوں گی۔ دریا میں کود جاؤں گی۔“

دل ریاداع کیا

میں اس کا سچا سا بھتی تھا۔ میں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور پھر وہ سب کچھ
ہوا جو اکثر ہوا کرتا ہے۔ کچھ اپنے اور پرے ہمارے موافق تھے کچھ مخالف، ایسے معاملے
میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کچھ لوگ محبت کرنے والوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ کچھ
لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہیں بدنام کرتے ہیں۔ بری نظر سے دیکھتے
ہیں۔ ان کی محبت کو بھول بھلیاں بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ وہ الجھ کر
اپنا راستہ بھول جائیں۔ اور ایک دوسرے کو تلاش کرتے کرتے پاگل ہو جائیں
یا خودکشی کر لیں۔ ان کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ کہ وہ اپنی
منزل کی طرف قدم نہ اٹھا سکیں۔ کوئی نہ کوئی سکندڑ کھڑا کر دیا جاتا ہے
ان کے خلاف تاکہ وہ اس کے جال میں پھنس کر یا تو دم توڑ دیں اور یا ایک
دوسرے کا ساتھ چھوڑ جائیں ہمیں ایک دوسرے سے جدا کرنے کی بڑی کوشش
کی گئی۔ انیس خاں نے بڑے میاں کو ڈھال بنا کر ہم پر بڑے وار کئے۔ بڑے
ہنگامے ہوئے۔ کئی ٹوفان اٹھے۔ مگر ہم چٹان کی طرح ڈٹے رہے ہم نے
ہمت نہ ہاری۔ ترمو جوں کے پتھر پڑے کھاتے رہے مسکراتے رہے۔ محبت
فاتح اعظم ہے۔ محبت شکست نہیں کھا سکتی۔ پولیس نے ہمارا کیس عدالت
میں پیش کیا تو حاکم نے نجمہ کے بیان پر اس کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ جہاں
اس کا جی چاہے جا سکتی ہے۔ جس سے اس کا جی چاہے شادی کر سکتی ہے۔
قانونی طور پر اسے ایسا کرنے کا حق حاصل ہے۔ کیونکہ وہ بالغ ہے۔ میاں
بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ ہمارے مخالف جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔
خاص کر انیس خاں تو زخمی سانپ کی طرح بل کھا کے رہ گیا۔ دونوں پارٹیاں

صلالت سے باہر نکلیں تو بستی کے چند معززین نے ہمارا آپس میں جھوٹا کہنا چاہا۔ ان میں سے ایک نے بڑے میاں سے کہا۔

”اب غصہ کھوک دیکھئے بڑے صاحب۔ جو کچھ ہوتا تھا ہو چکا۔ آجکل لڑکے لڑکیاں اپنی مرضی ہی سے شادی کرتے ہیں۔ نئی روشنی ہے نئی پود ہے۔ درگزر کیجئے۔ یہ لڑکا یہ لڑکی آپ سے معافی چاہتے ہیں۔ ان کا قصور معاف کر دیجئے۔ ان کی خوشی میں شامل ہو جائیئے۔ انہیں پھیننے پھولنے کی دعا دیجئے۔“

کہنے والے نے یہ الفاظ کچھ اس طرح کہے کہ بڑے میاں کا دل گھٹلا۔ ادھر جھکنے کے لئے گوت کھائی۔ مگر انیس خاں نے راستے ہی میں پیٹا کاٹ لیا۔ بڑے میاں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا اور نہ جانے کیا کچھ کہا سنا کہ بڑے میاں بڑبڑاتے اور ہمیں گھورتے ہوئے ادھر چلے گئے۔ اور ہم دونوں کان پیٹ کر ادھر سرک آئے۔

اسی دن شام کو میرے چند رشتہ داروں اور دوستوں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ہو گیا۔ نجمہ میری ڈریم لینڈ کی مونا لہزا بن گئی۔ میرے سپنوں کی بستی کی بیاطرس بن گئی۔ نہ کسی نے ڈھولک بجائی۔ نہ کسی نے سہاگ کے گیت گائے۔ نہ چوڑیاں چھنکیں۔ نہ کسی کی پائل کے گھنگھرو چھنکے۔ بس ایک کمرے میں چند گھنٹوں کے لئے ذرا سی چیل پہل رہی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ مٹھانی تقسیم ہو چکی تو اس تقریب میں شامل ہونے والے چلے گئے۔ اس دن میں نے زندگی میں پہلی بار اپنا کوئی سگا بھائی اپنی کوئی سگی بہن نہ ہونے کی کمی کو محسوس کیا۔ میرے

دل میں اک ہوک سی اٹھی۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میرے درمیان بیٹھی ہوئی نجمہ مجھے دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ اس کے اور میرے درمیان دو آنسو حائل ہو گئے۔ جن کو میں نے فوراً ہی جھٹک دیا۔ جھوپڑوں کے سمندر سے آتی ہوئی کسی گوالے کی بانسری کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ یہ رونے کا نہیں خوش ہونے کا وقت ہے۔ گوالے کے گیت نے مجھے جھنجھوڑا۔ کوئی گیت گاؤ۔ اپنا گراموفون بجاؤ۔ معاً مجھے خیال آیا۔ میں اپنی دلہن کو اس وقت سونے چاندی کے زیورات اور اطلس و کمخواب کے ملبوسات تو نہیں دے سکا۔ اسے کوئی گیت ہی پیش کرنا چاہئے۔ گیت اور پھول بہترین تحفہ ہیں۔ اگر گیت اور پھول نہ ہوتے تو ہماری زندگی بڑی ہی ادا اس ہوتی۔

تیز تیز لہروں میں کنارے کی طرف بہتی ہوئی کشتی کا مابھی بادبان کے بانس سے ٹیک لگائے نیلے نیلے آسمان میں اڑتے نمولوں اور سون چڑیوں کی ڈاروں کو دیکھتے ہوئے جب بانسری بجاتا ہے تو کتنا مسرور نظر آتا ہے۔ اپنے بیلوں کے پیچھے پیچھے دھان کے کھیتوں میں جاتا ہوا کسان جب اپنے الغوزے میں رنگ رس کی پھونکیں مارتا ہے تو کتنا خوش خوش رکھائی دیتا ہے۔ وہ اس وقت کسی ماحول میں نہیں اپنے گیتوں میں بس رہا ہوتا ہے۔ کتنی پیاری ہے گیتوں کی دنیا۔ جنم جنم کے گیتوں کی دنیا۔ جس میں ہر چیز گیتوں کی بنی ہے۔ گیتوں کی زمین۔ گیتوں کا آسمان۔ گیتوں کے گاؤں اور شہر۔ گیتوں کی گلیاں اور بازار۔ گیتوں کے گھر وندے اور ان میں گیت ہی بستے ہیں۔ جن کی زندگی بس گیت سی ہے۔ موت نہیں ہے گیتوں کی بستی میں۔ نہ غم ہے نہ ادا سی خزاں

بھی نہیں ہے۔ ہمیشہ بس ایک ہی رت رہتی ہے۔ گیتوں کی بہار کی رت۔ جس میں گیتوں کے سدا بہار پھول کھلتے ہیں۔ گیتوں کی دنیا میں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام ہوتی ہے۔ ہمیشہ اور ہر وقت چٹکی ہوئی چاندنی کا سماں ہوتا ہے جس میں سرگم والا پ کرتے ہوئے گیت سپنوں کی طرح سرسراتے ہیں۔ دکھوں سے بھری ہوئی ہمارے زندگی کو جو مسکھ گیتوں کے شانتی نکیتیں میں ملتا ہے اور کہیں نہیں مل سکتا۔

میں الماری سے گراموفون اٹھا لایا۔ اور اس پر ایک ریکارڈ لگا دیا۔ نجمہ گاؤں تکیے سے پیٹھ لگا کر گیتوں کی چلتی پھرتی گیت سنگیتا تا منگیشتر کا گایا ہوا ایک ریکارڈ سننے لگی۔

برکھا بہار آئی رس کی پھوار لائی

گر گراموفون پر ریکارڈ نہیں آواز کا جادو چل رہا تھا۔ اور جب آواز کا جادو چلتا ہے تو زمانے بدل جاتے ہیں۔ رتیں بدل جاتی ہیں۔ ماحول بدل جاتے ہیں۔ مہاکات بدل جاتے ہیں۔ وہ برکھا بہار کی رت تو نہ تھی۔ پرنتا کی آواز کے میگھ ملہار نے رم جھم کا سماں باندھ دیا۔ نعموں کی پھوار پڑنے لگی جس میں بھگینے کا مزا مجھ سے زیادہ نجمہ لے رہی تھی۔ اور پھر ایک ایکی جھونپڑوں کے سمندر سے رونے پیٹنے کی ڈراؤنی آوازوں کا ایک سائیکلون سا اٹھا۔ میں نے گراموفون جلدی سے بند کر دیا۔ میرا خیال تھا جھونپڑوں میں شاید پھر آگ لگ گئی ہے۔ کھر کی کھول کر میں نے اندھیرے میں جھانکا۔ کچھ سائے سے ادھر بھاگے جا رہے تھے۔ کچھ سائے ادھر بھاگے آ رہے تھے۔ رونے پیٹنے کی ڈراؤنی آوازوں نے

آس پاس رہنے والوں کو ہراساں کر دیا تھا۔ اب جو ایک سایہ اُدھر سے اُدھر آیا تو
میں نے اوپر سے آواز دی۔

”کیا تھو نیڑوں میں آگ لگ گئی؟“

”نہیں۔ سنتو شتر بان کی زندگی کا جنگل جل گیا۔“ نشیب سے آواز آئی۔

”اس کی بیوی مر گئی۔“

سنتو شتر بان گرہستی بھی تھا اور بیراگی بھی۔ گرہست اس کے جسم میں تھا
اور بیراگ اس کی روح میں۔ کبیر جی کے کبت پڑھنے کی اُسے ہر دقت لگن لگی
رہتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو کبیر جی کا کبت ہی سمجھتا تھا۔ بیراگ کی نظر سے اسے
اپنی ذات البسی ہی نظر آتی تھی۔ ایک گرہستی کی نظر سے اس نے زندگی اور اپنی
ذات کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ گرہستی کم اور بیراگی زیادہ تھا۔ اور اب تو
اس کا بیراگ اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس کی زندگی کے جنگل کو آگ لگ گئی تھی۔
اس کی بیوی مر گئی تھی۔ تین ننھے ننھے بچوں کی ماں مر گئی تھی۔ پندرہ لاکھ لہو تھوکتی
کھانستی لاشوں میں سے ایک لاش کم ہو گئی تھی اور میرے گیان دھیان کا گوتم
اداس ہو گیا۔ گہری سوچوں کے سناٹے میں چلا گیا۔

”سلیم بالو کیا سوچ رہے ہو؟“ مجھے چپ چاپ دیکھ کر نجمہ نے پوچھا۔

”میں سوچ رہا ہوں اگر اس بیماری کے خلاف زبردست محاذ قائم نہ

کیا گیا تو یہ بڑا کرام چائے گئی۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بیماری بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ پچھلی سرکاری رپورٹ میں

اعداد و شمار دیکھے تو معلوم ہوا کہ ہر سال ایک لاکھ انسان اس مرضی

مرض سے مر جاتے ہیں۔ اور دو لاکھ انسان اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر یہ بیماری اسی رفتار سے پھیلتی چلی گئی تو دس بارہ سال میں اس ملک کی زمین میں مٹی کے ذروں سے کہیں زیادہ لوہے کے دھبے، لوہے کے داغ نظر آئیں گے۔ جن میں کروڑوں کی تعداد میں کیڑے کلبلا تے ہوں گے، جنہیں پھینک دینے کو کوئی ثابت پھینچرانا ملے گا۔“

”اس بیماری کے اتنی تیزی سے پھیلنے کا سبب کیا ہے؟“ نجمہ نے پوچھا۔
”صحت کے اصولوں سے عوام کی لاعلمی و لاپرواہی۔ چھوٹ چھوٹ۔ گندی غذا۔ گنداما حول۔ تازہ ہوا اور سورج کی روشنی کا فقدان۔ بیکاری و بیروزگاری۔ بھوک و افلاس۔ غم کھانا غم اور ٹھنا۔ جس میں غم جاناں کم اور غم روزگار زیادہ۔ اقتصادی بد حالی و بے چینی۔ ایک نہیں اس کے پھیلنے کے کئی اسباب ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔
”اس بیماری کے خلاف محاذ کیسے قائم ہو سکتا ہے؟“ نجمہ نے پوچھا۔
”عوام کے معیار زندگی کو بلند کیا جائے۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کی اصلاح کی جائے۔ انہیں حفظانِ صحت کے اصولوں سے آگاہ کیا جائے۔ ان کے اقتصادی حالات بہتر بنائے جائیں۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس مرض کے مریض کو فوراً کسی ہسپتال میں داخل کر لیا جائے۔ اس کا مناسب اور لگاتار علاج کیا جائے۔ اس کی بدک بتھام کے لئے

لوگوں میں حفاظتی ٹیکے لگائے جائیں۔“
مگر یہاں تو ہسپتال میں نفسا نفسی کا عالم ہے۔“ نجمہ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس مرض میں مبتلا اس بستی کی کئی عورتوں سے میں نے سنا ہے کہ جن مریضوں کا کوئی وسیلہ نہیں ہوتا ہسپتال میں داخل نہیں ہو سکتے۔ داخلہ لینے کے لئے انہیں بڑے پاڑے پلٹے پڑتے ہیں۔ کئی مہینے ان کو اسی انتظار میں گزر جاتے ہیں کہ جلدی سے کوئی بیڈ خالی ہو تو ان کی باری آئے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟“

”مریض زیادہ ہیں۔ بیڈ کم ہیں۔ ہسپتال کم ہیں۔ نرسیں اور ڈاکٹر کم ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تو پھر اس کمی کو پورا کیوں نہیں کیا جاتا۔ آئے دن ٹی بی کے مریضوں کے لئے چندہ اکٹھا کیا جاتا ہے۔ ٹی بی ٹسٹ نیچے جاتے ہیں۔ امدادی مشاعرے ہوتے ہیں۔ رنگل ہوتے ہیں۔ ویراٹھی شو ہوتے ہیں۔ مینا بازار لگائے جاتے ہیں۔ ریڈ کراس کے میڈے پھیلے کافی روپیہ اکٹھا کرتے ہیں۔ کیا اس سے ہسپتال نہیں بن سکتے؟ وہ روپیہ کہاں جاتا ہے؟“ نجمہ نے پوچھا۔

”کیا معلوم کہاں جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”بہر حال اس قومی کام میں اُن لاکھوں تپتی لوگوں کو بھی حصہ لینا چاہئے، جو اپنے لئے لاکھوں روپے کے نیگلے اور بلڈنگیں بناتے ہیں۔ ان میں گلاب دیوی، جہانگیر دیوی

اور سرگزنگا رام ایسا کوئی دانی پیدا ہونا چاہئے۔ جو موت کے قریب
پندہ لاکھ انسانوں کو زندگی کا دان دے۔ ملتی و نروان دے۔ ایک
ہسپتال کا دان دے۔ دھرم دان دینے سے دھن ٹھٹھا نہیں بڑھتا
ہے۔ نیکی کا بدلہ ملتا ہے اور ضرور ملتا ہے۔ مگر لاکھوں پتی لوگ معلوم
نہیں کیوں اس طرف توجہ نہیں دیتے۔“ میں نے کہا۔

”اور ڈاکٹر لوگ بھی مریضوں کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ کئی ڈاکٹر تو
اتنے جلال میں ہوتے ہیں کہ ان سے بات کرنا گویا خدا سے بات کرنا
ہے۔ ان سے بات کرنے کی باضابطہ پرمٹ لینا پڑتی ہے۔ ان کے
کیوڈر یا اسٹنٹ سے چیٹ لینا پڑتی ہے۔ ان کے کمرے
کے دروازے پر گھنٹوں اٹنشن رہنا پڑتا ہے۔ ذرا بھی ریلیکس ہونے
تو گئے ردی کی ٹوکری میں۔ ڈاکٹر صاحب ریفر سمٹ روم کے اندر
اور مریض اپنے لواحقین کے ساتھ ڈسپنری یا ہسپتال سے باہر کسی
بس سٹاپ پر۔ گھر جاتے ہوئے راستے میں اگر اس کی نبض سٹاپ
ہو جائے تو اسے خدا کی مرضی یا اتفاق کہا جائے گا۔ زندگی اور موت
کی مشینری کے مکینک اپنے اوپر کوئی بات نہیں لیتے۔“ نجمہ نے کہا۔
”معلوم ہوتا ہے اس موضوع پر تمہارے پاس دافر مواد موجود ہے۔“ نجمہ۔
ایسا کوئی ناول تو نہیں پڑھا تم نے؟“ میں نے پوچھا۔
”ناول نہیں۔ ایک جیتی جاگتی لہو تھوکتی کھانستی کہانی پڑھی تھی میں نے۔“ نجمہ
نے کہا۔

”کیا مطلب ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”بلقیس نے مجھے بڑی باتیں بتائی تھیں۔“ نجمہ نے کہا۔

”کوئی بلقیس ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”دادو کنجڑے کی بیوی۔“ نجمہ نے جواب دیا۔

”اچھا وہ دادو۔ انیس خاں کا پڑوسی۔“
”ہاں وہی۔ وق تھی اس کی بیوی کو بھی۔“
”سنا تھا مرگئی اللہ کی بندی۔“

”ہاں مر گئی۔“

”کیا باتیں سنائیں تھیں اس نے تمہیں؟“

”بیچارہ بڑی لاچار ہو گئی تو دادو اُسے کمیٹی کے ہسپتال میں لے گیا۔ کسی نے اُسے بتایا تھا وہاں علاج مفت ہوتا ہے۔ بڑا ڈاکٹر بڑا رحمدل ہے۔ غریبوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیکے، دوائیاں، سوکھا دودھ بسکٹ وغیرہ مفت ملتے ہیں۔ مگر یہ تو اُسے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ مفت تو آجکل موت بھی نہیں ملتی۔ پیسے بنا کوئی کام نہیں چلتا۔“ نجمہ نے کہا۔
”کیوں کیا تکلیف پیش آئی اُسے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اپنی بیوی کی پرچی بنوا چکا تو ترس نے پرچی کے بیس پیسے مانگے۔ اس کی جیب میں اس وقت پانچ پیسے بھی نہ تھے۔ شرمندہ ہو کر بغلیں جھانکنے لگا۔“
”دیکھ کر کیا ہوا؟“

”پاس ہی کوئی شریف آدمی کھڑا تھا۔ اس نے چپکے سے اس کی مٹھی میں چوہنی

دے دی۔ یہ پرچی لے کے آگے گیا تو ایک اور مصیبت میں پھنس گیا۔ ایک سڑیل سی ڈاکٹرانی گھومنے والی کرسی میں بیٹھی سب کو گھور رہی تھی۔ اس نے سلام کیا تو کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر سلام کیا تو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔
”وہ کیوں؟“

”وہاں تو سانس لینے کی اجازت نہ تھی سلام کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی تھی۔ صرف سلام کرنے سے کمرے سے باہر ہونا پڑا۔ اور جو وہ کیوں کیا کرنے لگتا تو شاید کرسی بنا کر کہیں بچھا دیا جاتا۔“
”اور اس کی بیوی؟“

”اسے کمرے ہی میں کھڑا لیا گیا تھا۔ اس کی سکرین ہونی تھی۔“
”کمرے سے باہر ہو کر دادو کا کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔
”یوں اسٹیشن کھڑا رہا۔ یوں کھمبے کی طرح پورے دو گھنٹے کھڑا رہا۔ دونوں ٹانگیں جواب دے گئیں تو وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔“ نجمہ نے جواب دیا۔
”کیا وہاں کوئی پنچ نہ تھا بیٹھنے کو؟“ میں نے سوال کیا۔
”تھا مگر اس پر انتظار کی گھڑیاں گننے والے مریض یوں بیٹھے تھے جیسے کیوں پر بیٹھے ہوں۔“ نجمہ نے جواب دیا۔

”کیا وہ تکلیف میں تھے؟“ میں نے پوچھا
”سب کے سب جانکنی کے عالم میں تھے۔“ نجمہ نے جواب دیا۔
”کیوں ایسی کیا تکلیف تھی؟“ میں نے پوچھا
”اب کوئی ایک تکلیف ہوتی تو کچھ پتہ چلتا وہاں نہ جانے کتنی تکلیفیں

ایک ساتھ چل رہی تھیں۔“ بخم نے کہا۔

”پھر کیا ہوا؟“

”جو اُس ہسپتال میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ دادو کی اور شامت آئی مہمانی سے بھنگی گیلی بوری سے فرش صاف کرتے ہوئے آگیا۔ اس کے مزاج کا پارہ بھی چڑھا ہوا تھا۔ جلی کٹی سنا کر دادو کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر گیا۔ نگاہ ادب رو برو۔“

”کیا مطلب؟“

”بڑے ڈاکٹر صاحب آرہے تھے۔ چپڑا سی، اہلکار، مریض سب ہٹو بچو کا شور مچا رہے تھے۔ دادو اُس دھاندلی میں دل کو پکڑے کوئی نہیں دھنس گیا۔ مگر سرکار تو نہ آئی اندر سے چپڑا سی آگیا۔ دادو کو بلا یا گیا تھا۔ وہ ڈرتا ڈرتا حاضر حضور ہوا تو یہ سنتے ہی اس کا بھرکس نکل گیا کہ اُسے پیسے جمع کرانے ہوں گے۔“

”کیسے پیسے؟“

”دواؤں کے۔ ٹیکوں کے۔“

”خیراتی ہسپتال میں تو پیسے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اب کیا معلوم کیا چکر ہے۔ بیچارہ دادو تو اس وقت حکیم بن کر رہ گیا۔ اس کی ہر چیز حکیم کھانے لگی۔ بڑا المبا چکر تھا۔ تین مہینے کا کورس۔ ہر روز اس کی بیوی کو ٹیکہ لگنا تھا۔ ہر روز اُسے ہسپتال میں آنا تھا۔ ہوا کے بند ہوتے ہوئے بھی دادو کے پھیپھڑے سپلیوں میں یوں پھولنے لگے۔ جیسے دھرتی کی

ساری ہو ایک دم ان کے اندر گھس گئی ہے۔ وہ اپنا کام کاج چھوڑ چھوڑ کر پڑوسی کے چھکڑے میں اپنی بیوی کو لا دلا کر وہاں لایا تھا۔ ہر روز آنے جانے کا جھنجھٹ اور پیسے جمع کرانے کی پینا اس کے بس کا روگ نہ تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر رٹنے لگا۔
”رونے لگا؟“

”اور کیا کرتا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ کہنے لگا۔ مائی باپ میں بڑا غریب ہوں۔ کنگال ہوں۔“
”پھر کیا جواب ملا؟“

”ڈاکٹر نے کوئی جواب نہیں دیا اُسے کمرے سے دھکیل دیا گیا۔ دونوں میاں بیوی باہر اور دروازہ بند۔ وہ سوچتا ہی رہ گیا۔ مگر اُسے زیادہ دیر سوچنا نہ پڑا۔ ایک مریض نے اُسے بڑے ڈاکٹر کے پاس جانے کا مشورہ دیا۔ وہ جلدی وہاں پہنچا مگر پتھر اسی نے دروازے پر ہی روک لیا۔“
”کیوں روک لیا؟“

”ڈاکٹر صاحب مصروف تھے۔“

”کسی مریض کو دیکھ رہے ہوں گے۔“

”معلوم نہیں اب وہ کسے دیکھ رہے تھے۔ کیا دیکھ رہے تھے۔ باہر سے

گرما گرم چائے، سمو سے اور پھل جا رہے تھے۔ اندر سے ڈاکٹر صاحب کے گونجدار ہفتے آرہے تھے۔ اور ان میں دبی دبی ہنسی کی سرلی گھنٹی کی سی آواز رہ کر یوں مچل جاتی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔“
”پھر کیا ہوا؟“

”ڈاکٹر صاحب ایسے مصروف ہوئے۔ ایسے مصروف ہوئے کہ دادو اور بیوی بیٹھے بیٹھے بیچ رہی سو گئے۔ اور پھر جب اچانک ان کی آنکھ کھلی تو ڈاکٹر صاحب کی مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ اور مریضوں کو دیکھنے کا وقت بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ اپنی کار میں انگوری رنگ کی ساری میں لپٹی ہوئی سریلی گھنٹی کے ساتھ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ دادو انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر ہڈیوں کی گھڑی کو کندھے پر اٹھایا اور چھکڑے میں لاد کر اپنی راہ لی۔“

”کیا عجیب باتیں سنائیں تم نے۔“

”میں پوچھتی ہوں۔ یہ جو ہزاروں اور لاکھوں روپے چندے میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان میں دادو کی بیوی کا کوئی حصہ نہ تھا۔“

”میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں جو چندہ اکٹھا کرتے ہیں۔“

”سلیم بابو بلقیس کی باتیں سن کر مجھے فلورنس نائیٹ انگیل اور ڈاکٹر الیگزینڈر فلمنگ کا خیال آگیا۔ میں نے ایک رسالے میں ان سے متعلق ایک مضمون دیکھا تھا۔ ڈاکٹر فلمنگ نے نیپلین ایسی دوا ایجاد کر کے انسانیت پر ایک بہت بڑا احسان کیا۔ فلورنس نائیٹ انگیل بیماروں کی تیمارداری میں وہ کرشمے دکھائیں جن کی مثال نہیں ملتی۔ کیا ہماری دھرتی ایسے انسانوں کو جہنم دینے کے معاملے میں بانجھ ہو گئی ہے؟ کیا اس دھرتی سے اس مٹی سے ایسے انسان پیدا نہ ہوں گے؟“ نجمہ نے سوال کیا۔

”ہوں گے۔ ضرور ہوں گے۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
درتہ تہی و تعمیر کے اس ارتقا میں بہت کچھ بدل چکا ہے۔ بہت کچھ
بدل رہا ہے۔ بہت کچھ بدل جائے گا۔ بہت کچھ ہو چکا ہے۔
بہت کچھ ہو رہا ہے۔ بہت کچھ ہو کر رہے گا۔ ارتقا کو روکا نہیں
جاسکتا۔ ارتقا جاری ہے۔ ارتقا جاری رہے گا۔ اُس عرصہ تک جاری
رہے گا جب تک کہ اس معاشرے کا ہر انسان ایک مکمل اور مثالی
انسان نہیں بن جاتا۔ رفتہ رفتہ بہت سی چیزوں کی اصلاح خود بخود
ہو جائے گی۔ بہت سی چیزوں کی اصلاح کرنا پڑے گی۔ مہاتما کنفیوشس
نے اس ارتقا کی بڑے ہی لطیف پیرائے میں تصویر کھینچی ہے۔
”کیا تصویر کھینچی ہے انھوں نے؟“

”وہ کہتے ہیں اخلاقی ہم آہنگی کے لئے سب سے پہلے ہمیں خود اپنی
قومی زندگی کی تنظیم کرنا چاہئے۔ قومی زندگی کی تنظیم کرنے والے سب
سے پہلے گھریلو زندگی کو باقاعدہ بنائیں۔ جو لوگ گھریلو زندگی کو منظم
بنانا چاہیں۔ وہ سب سے پہلے ذاتی زندگی کی تربیت کریں۔ اور جو
لوگ اپنی ذاتی زندگی کی تربیت کرنا چاہیں۔ وہ سب سے پہلے
اپنے دلوں کو پاک و صاف کریں۔ دلوں کو پاک و صاف کرنے کی
خواہش کرنے والے سب سے پہلے نیتوں کو مضبوط بنائیں۔ نیتوں کو
مخلص بنانے والے سب سے پہلے سمجھ اور مفاہمت پیدا کریں۔ اور
سمجھ اشیا کے علم کی چھان بین سے پیدا ہوتی ہے۔ اور سمجھ پیدا

ہو جائے تو نیت و ارادہ مخلص ہو جاتا ہے۔ اور جب نیت صاف

اور ارادہ مخلص ہو جائے تو دل صاف ہو جاتا ہے۔ جب دل صاف ہو جائے تو ذاتی زندگی کی تربیت پوری ہو جاتی ہے۔ اور جب ذاتی زندگی کی تربیت ہو جائے تو گھریلو زندگی منظم اور باقاعدہ ہو جاتی ہے۔ اور جب گھریلو زندگی منظم ہوگی تو قومی زندگی بھی منظم ہو جائے گی۔ اور جب قومی زندگی منظم ہوگی تو ملک و قوم میں خوشحالی ہی خوشحالی ہوگی۔“

”بڑی اچھی باتیں کہی ہیں مہاتما کنفیوشس نے۔“

”میں ان اچھی باتوں کو عملی جامہ پہنا کر ملک و قوم کو خوشحال بنانے کا۔

پانچ کروڑ انسانوں کو خوشحال بنانے کا عزم کر چکا ہوں۔ میں چاہتا ہوں پندرہ لاکھ لہو بھٹو کتے کھانستے موت کے قریب انسانوں کو زندگی کے قریب لانے کے لئے کوئی ٹھوس کام کیا جائے۔ ٹوٹے

ہوئے ڈھاروں اور گھاس پھوس کے ان تنگ و تاریک بھوپنڈروں میں پڑے ہوئے بھوکے ننگے انسانوں کی غربت دور کرنے کے لئے

ان کے دل سے زندگی کا یوس ہو جانے کے احساس کو مٹانے

کے لئے کوئی تحریک شروع کی جائے۔ جس سے دوسرے لوگ بھی

متاثر ہوں۔ ترقی و تعمیر کا جذبہ ان کے اندر بھی بیدار ہو جائے۔ اور

یہ بیداری ملک کے اس کونے سے لے کر اُس کونے تک پھیل جائے۔

اور ہماری اجتماعی زندگی کے نظام کی مشینری کے جو کل پُرزے غلط

کام کر رہے ہیں صحیح کام کرنے لگیں۔ غلط اقدامات۔ غلط رجحانات اور غلط نظریے بالکل ختم کر دیے جائیں۔ اور وہ کام شروع کر دیا جائے جسے اب شروع کر دینا چاہئے۔“
”وہ تحریک کیا ہوگی؟“ نجمہ نے پوچھا۔

”ابتدا تھوڑے سے سرمائے کے ساتھ کسی گھریلو صنعت سے کی جائے۔ اس بستی کے بیکار لوگوں کو کسی کام پر لگایا جائے۔ عورتیں بھی فرصت کے وقت میں کام کریں۔ اپنے کنبے کی خوشحالی کے لئے محنت کریں۔ ترقی و تعمیر کے کام میں مردوں کے ساتھ وہ بھی حصہ لیں۔ ہم ان کے لئے کام مہیا کریں گے۔ وہ محنت کریں۔ دولت کمائیں۔ ہم آمدنی میں سے ان کو ان کی محنت کا معقول معاوضہ دیں گے۔ اور اپنی محنت اور وقت کا معاوضہ بھی اس میں سے لیں گے۔ اور منافع کو اصلاحی و تعمیری کاموں میں لگائیں گے۔ کیوں کیسا پلان ہے؟“
”پلان تو بہت اچھا ہے۔“

”ایسا کرنے سے ہم پندرہ لاکھ لہو حقوکتے کھانستے انسانوں کی مکتی و تروان کے لئے واقعی کوئی کام کر سکیں گے۔ جھونپڑوں کے اس تاریک سمندر میں سویرے کی کوئی کیرن پیدا کر سکیں گے۔ ان بھوکے ننھے انسانوں کی زندگی میں کوئی تعمیری انقلاب لاسکیں گے۔ ان کی زندگی ابھی تک کسی تعمیری انقلاب کی راہ دیکھ رہی ہے۔ اور میں بڑی الجھن میں ہوں۔“

”درا لکھن کیسی؟“

”میں سوچ رہا ہوں۔ دن رات سوچ رہا ہوں۔ مگر کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ فقط کہانیاں اور افسانے لکھنے سے اس کام کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔ ان کے ذریعے تو فقط پیغام دیا جاسکتا ہے۔ سوئے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑا جاسکتا ہے۔ مردہ دلوں میں زندگی کی آگ بھڑکائی جاسکتی ہے۔ قوت عمل سے خالی جسموں میں قوت عمل پیدا کی جاسکتی ہے۔ عمل کی مشینری کو متحرک کیا جاسکتا ہے مگر اُس مشینری نے کیا کرنا ہے۔ کیا بنانا ہے، یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ کونسی ایسی گھریلو صنعت شروع کی جائے جو بہت جلدی ترقی کر کے ہمیں اپنے ارادوں میں کامیاب کر دے۔ میں قلمکار ہوں۔ کہانیاں لکھنا جانتا ہوں۔ صنعت کار نہیں ہوں۔ صنعت کے متعلق کچھ نہیں جانتا مجھے اس وقت ایک صنعت کار ذہن کی ضرورت ہے۔ جو میرے ساتھ تعاون کرے۔ میری رہنمائی کرے۔“

”اس ضرورت کو میں پورا کروں گی۔“ نجمہ نے بڑے اطمینان یقین کے ساتھ کہا۔

”میں بتاتی ہوں تمہیں کیا کرنا چاہئے سلیم بابو۔“

”ضرور بتاؤ۔ دیر نہ کرو بجھی۔“ میں نے کہا۔

”میں اون کے موزے، درتے، سوئیٹر، کوٹیاں، مفلر، ٹوپیاں بہت اچھی بنا سکتی ہوں۔ کشیدہ کاری بھی جانتی ہوں۔ یہ کام میں نے

ایک انڈسٹریل سکول میں سیکھا تھا۔ اور پھر وہیں مجھے استانی کی اسامی مل گئی تھی۔ انہی پیسوں سے میں نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ان جھونپڑوں اور دھاروں میں بسنے والی عورتوں کو میں یہ کام دنوں میں سکھا دوں گی۔ سلیم بابو تم مارکیٹ سے آرڈر لایا کرنا۔ ہم سب عورتیں مل جل کر کام کیا کریں گی۔ فی الحال تم یہ کام عورتوں تک ہی رہنے دو۔ چل نکلتے گا تو پھر سوچ سمجھ کر اس کے ساتھ کوئی اور صنعت وسیع پیمانے پر شروع کر دیں گے۔ اُس میں تم اپنے ساتھ مردوں کو لگا لینا۔“

مجھ کی یہ سکیم سن کر میں خوشی سے اچھل گیا۔ بہترین سکیم تھی۔ اور میں ڈرہیر ہوں سکیم اور ڈرہیر دونوں نے مل کر کام شروع کر دیا۔ سکیمیں اور پسینے ہماری زندگی کے مشترکہ فریم میں اپنے سنہری دھاگوں سے گل بوٹے بنانے لگے۔ مجھ پر دھار سے میں گئی۔ ہر جھونپڑے میں گئی اور پختور سہمی دنوں میں اس نے خواہشمند عورتوں کو کام سکھا کر ادنیٰ اشیاء بنانے والی بہت سی انسانی مشینیں تیار کر لیں اور پھر ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت باضابطہ کام شروع ہوا۔ مجھے ٹنگ کے مختلف نمونے دیئے گئے۔ جنہیں میں اپنی کہانیوں کے ساتھ ہی اپنی زندگی کے ٹوکرے میں شوکیں میں رکھ کر آرڈر لینے مارکیٹ میں نکلا۔ میری بھوک، میرے افلاس میں چھپا ہوا نقاد اس دن بڑا خوش تھا۔ وہ اس دن مجھ پر تنقید نہیں کر رہا تھا۔ بس وہ خاموش تھا اور بڑا خوش جیسے کہہ رہا ہو۔ اب آئے میدان سے راستے پر۔ بڑھے پلو۔ بڑھے پلو۔ اب تم اپنے لیے سب کے لیے مکتی و زروان حاصل کر سکو گے۔

ابتدا میں کئی دشواریاں کئی رکاوٹیں راستوں میں آئیں مگر ہم نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے کام میں لگے رہے۔ اور کام چل نکلا۔ آرڈر پر آرڈر آنے لگے۔ ہماری اشیا نفیس، پائدار اور خوشنما ہونے کی وجہ سے بے حد پسند کی گئیں۔ سب اخراجات نکال کر ایک سال میں ہم نے پانچ ہزار روپیہ کمایا۔ جس میں سے ایک ہزار روپیہ بستی کی بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم کیا۔ ایک ہزار روپیہ نادان بچوں کی تعلیم پر صرف کیا۔ ایک ہزار روپیہ کام کو اور بڑھانے میں لگا دیا۔ بقیہ دو ہزار روپیہ ٹی بی فنڈ میں دے دیا۔ اور میرے گیان و صیانت گوتم نے اپنی موٹر میں اُس دن کچھ ایسے بھجن گائے کہ میری زندگی کے ٹوکرے میں، شوکیں میں سب سے سجائے اور فی مقرر موزے اور کہانیاں مجھے یوں معلوم ہوا جیسے ٹپ ڈانس کر رہی ہیں۔ جلتے رنگ بجا رہی ہیں۔ اور پھر ایک ایک نہ جانے کیوں اور کس بات پر ان میں احساس برتری پیدا ہو گیا کہ ان کی آپس میں بوکسنگ ہونے لگی۔ جوا جھٹسو ہونے لگی۔ موزے اور مقرر پھٹنے لگے۔ کتابیں پھٹنے لگیں۔ ورق تیز تیز ہوا میں اڑنے لگے۔ اُون کے دھاگے جھینکا مچھلی کی مونچھوں کی غرت میرے چہرے پر لٹکنے لگے اور میں کر فیوٹکا دیا۔ مارشل لا نافذ کر دیا۔ اور پھر میں نے ایک آنکھ والے یونانی دیوی دیوی سس کی طرح اپنا ایک ہاتھ اپنی زندگی کے ٹوکرے میں ڈال کر انگلیوں سے کاغذ اور ادن کی مخلوق کے منکے دیوچ لئے۔ مفلروں مفلروں کو ہٹا کر ادھر کیا۔ کتابوں کو ہٹا کر ادھر کیا۔ اور ہدایت کی۔ خبردار آپس میں لڑنا نہیں۔ تم میں سے کوئی بھی اس سکیم میں ایک دوسرے سے بہتر نہیں ہے۔ بڑا نہیں ہے۔ تم سب اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے کام میں ایک سے ہو۔ جو کام

کہانیاں کر سکتی ہیں موزے اور مفرد نہیں کر سکتے۔ اور جو کام موزوں مفردوں سے لیا جاسکتا ہے کہانیوں سے نہیں لیا جاسکتا۔ تمہارا آپس میں لڑنا حماقت ہے۔ مل جل کر رہو۔ اپنا اپنا کام کر دو۔ ہسپ ہسپ ہرے۔ کاغذ اور اُدن کی مخلوق نے تالیاں بجائیں۔ اور میں نے اُسی دن ایک بہت بڑے کام کا بونگ بجا دیا۔ بوٹ بنانے کا کارخانہ کھولنے کی سکیم تیار ہو چکی تھی۔ ضروری سامان بھی خریدا جا چکا تھا۔ اب میں نے گوندی پیر کے تیکے کے اُن لوگوں سے رجوع کیا۔ ان کی زندگی میں مولسری کی مہک پیدا کرنے کا وقت آگیا تھا۔ میں نے بستی کے بیکار لوگوں کو اپنی طرف بلایا۔ میرے پاس ان کے لئے ایک پیغام تھا۔ ایک کام تھا۔ ان کی مکتی و نردان کا ایک روشن ماسٹہ۔ ان کی زندگی کے بند دروازے کی کنجی کھتی اُس کام میں۔ مگر اسی اٹھائیس خاں پیچ میں کھلبلا اٹھا۔ اب اُس سے صبر نہیں ہو سکتا تھا۔ ہمارا ہر کام اس کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔ ہماری ترقی و کامیابی کا ایک لمحہ اُس کو گراں گز رہا تھا۔ ہمارے کام کو سر د کرنے کے لئے اس نے ایک سکندل چلا دیا۔ اپنی قسم کے بستی کے دوسرے لوگوں کو اُس نے بہکایا میرے خلاف اکسایا کہ الیکشن کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔ یہ کل کا چھو کر اہمارے مقابلے میں کھڑا ہونا چاہتا ہے ہمیں جیتنا چاہتا ہے۔ یہ ہمارے اقتدار ہماری عزت کو مٹی میں ملانے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اسی لئے اس نے یہ ڈھونگ بچایا ہے۔ یہ کھڑاگ کھڑا کیا ہے کہ ہمیں آسانی سے بیٹھا دے۔ بیکار کر دے۔ ہمیں گمنامی کے گرٹھے میں دبا دے۔ جیسے بھی ہوا سے ہیں دبا دینا چاہئے۔

یہ دن بدن اونچا ہوتا جا رہا ہے۔ اس بستی میں اس کی ہر دلعزیزی بڑھ رہی ہے۔ لوگ اس سے بڑے مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ اسے اچھا سمجھنے والوں کی فہمی بڑھتی جا رہی ہے۔ جلدی سے اس کا بھرتہ کر دے۔ اور وہ سب ایک ہی ذہن کے اور ایک ہی سطح پر سوچنے والے لوگ میرے خلاف ہو گئے۔ میرے منصوبوں کے قلعوں کو اڑانے کے لئے اندر ہی اندر بارودی سرنگیں بچھانے لگے۔

میں اپنی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق گوندی پیر کے اللہ لوگوں کے پاس گیا تو وہاں ان سے ہلا غلا ہو گیا۔ وہ سب چرس چاند کے کش لگا کر حسب معمول اس وقت اللہ سے لو لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے جسم زمین پر تھے اور وہ آپ اللہ کے پاس تھے آسمان پر۔ میری آواز ان تک نہ پہنچ سکی مگر ان کے مرشد کامل سمندر سائیں نے میری آواز کو سنا تو چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کی طرح سائیں سائیں کرنے لگے۔

”درد لیشوں، ملنگوں، اللہ لوگوں سے بوٹ بنواتے ہو“ وہ مجھے لال انکارہ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولے۔

”انہیں جوتوں میں کھینچو گے“

”سائیں جی کیا ہرج ہے۔ بیکار بیٹھے رہنے سے جوتیاں بنانا کیا بُرا

کام ہے۔“ میں نے بڑی انکساری سے کہا۔

”دو بیکار نہیں بیٹھے رہتے۔ یہ سب اللہ اللہ کرتے ہیں۔ عاقبت سنوارتے

ہیں اپنی۔ دنیا کے دھندوں میں کیا دھرا ہے۔“ سائیں جی بولے۔

”اور محنت مزدوری کرنا بھی ایک عبادت ہے۔“ میں نے عرض کیا۔
”ارے بابو یہ دنیا کو چھوڑ چکے ہیں۔ ان کی عبادت دنیا داروں کی عبادت سے الگ ہے۔“

”مگر یہ رہتے تو اسی دنیا میں ہیں جہاں دوسرے دنیا دار رہتے ہیں۔“
”ارے بابو دوسری دنیا میں تو انسان مرنے کے بعد جاتا ہے۔ یہ ابھی زندہ ہیں۔“

”جی میں تو انہیں مردہ سمجھتا ہوں۔“
”کیا کہا مردہ؟“ جلال کے زلزلے کی ان میں ایک لہر اٹھی۔
”جی بالکل مردہ۔ بیکار آدمی کو مردہ ہی سمجھنا چاہئے۔ اور اس کے دماغ کو شیطان کا کارخانہ۔“

”کیا کہا شیطان؟“ وہ جلال کی تیز رو سے کانپ گئے۔
”جی بیکار آدمی کے دماغ میں شیطانی باتیں ہی جنم لیتی ہیں۔ وہ بڑے اٹھے سیدھے کام کرتا ہے۔“

”اوپر نعمت نہ لگاؤ بابو یہ بیچارے تو اللہ اللہ کرتے ہیں۔“
”ان کے یوں اللہ اللہ کرنے کا فائدہ؟“
”اور بوٹ بنانے کا فائدہ؟“

”بوٹ بنانا ایک کام ہے۔ پیشہ ہے۔ انسان کوئی کام کرتا ہے تو روزی کماتا ہے۔ باعزت طریقے سے زندگی بسر کرتا ہے۔“
”انہیں روزی کمانے کی کیا ضرورت ہے۔ روزی انہیں اللہ کے ہاں سے

آتی ہے۔“

”اچھا تو من و سلوئے اترتا ہے ان پر۔“

”تم دنیا دار کیا جانو کیا کیا اترتا ہے ان پر۔“

”جی دنیا کی اتر نہیں ادرٹھنے والوں پر کچھ نہیں اتر سکتا آسمان سے“ میں

نے کہا۔

”یوں کہئے کہ ہر دو گھنٹے کے بعد ان کا نشہ اتر جاتا ہے۔“

”مذاق اڑاتے ہو درویشوں کا۔“

”جی مذاق نہیں میں ایک مقصد کی بات کر رہا ہوں۔“

”آخر تم چاہتے کیا ہو؟“ سائیں جی آستین چڑھاتے ہوئے بولے۔

”میں اپنے لئے تو کچھ نہیں چاہتا۔ ان کے لئے ہی کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ

کوئی کام کریں۔ با عزت طریقے سے زندگی گزاریں۔ اس سوسائٹی اس سماج

میں یہ بیکار نہیں ہیں۔ یہ اپنے آپ کو بیکار نہ سمجھیں۔ اپنے آپ کو بیکار نہ کہیں۔

بیکار نہ رہیں۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ انہیں کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے پیدا

کیا گیا ہے۔“

”ارے بابو یہ کیا جانیں بوٹ بنانے۔ کیا بیکار باتیں کر رہے ہو۔“

”ہم انہیں بوٹ بنانا سکھائیں گے۔ دو مہترمی اسی کام کے لئے ملازم

رکھے ہیں۔ ہم انہیں دنوں میں کاری گر بنادیں گے۔“

”وہ ارے بابو تم کیا بنا سکو گے۔ اور کوئی کیا بنا سکے گا۔ سب کو بنانے والا

تو اللہ ہے۔“

”جی یہ تو ٹھیک ہے مگر اللہ چرسی چاندو باز نہیں بناتا۔“
 ”کیا کفر بول رہے ہو بابو۔ سب کچھ اللہ کے حکم ہی سے ہوتا ہے۔“
 ”یہ غلط ہے جناب۔ اللہ چرس چاندو پینے کا حکم نہیں دیتا۔ میں چرسی اور
 چاندو باز بنانے والے خدا کو نہیں مانتا۔“

یہ سنتے ہی سائیں جی آگ بگولہ ہو گئے۔ کڑکنے لگے۔
 ”تم مشرک ہو۔ ملحد ہو۔ کافر ہو۔ قتل بوٹ ہو۔ تم اللہ کو نہیں مانتے۔
 پیروں فیقروں کو نہیں مانتے۔ تمہاری بات کون مانے گا۔“

اتنی سی بات تھی جسے سائیں جی نے تنگڑ بنا دیا۔ اور پھر جو انھوں نے
 جوت حق کا ایک ایٹمی نعرہ لگایا تو اس کے دہماکے سے نشے کی پینک میں
 اونگھتے جھومتے دس بیڑوں پتھر یکدم چونک گئے۔ سائیں جی کا معرقتی
 اشارہ پاتے ہی ان کی آنکھوں میں کسی وحشی درندے کی چمک آگئی۔ گھورتے
 غراتے اٹھتے۔ پتھر پھٹتی مچا دی۔ کسی نے ایندھ اٹھالی، کسی نے پتھر کوئی
 حجرے سے لپک کر لالچھی لے آیا کوئی بانس۔ کسی نے چرس پینے والے
 کھیان کی زڑی کھینچ لی۔ کسی نے جوتا پکڑ لیا اور پل پڑے۔ اچھلتے ہوئے،
 کودتے ہوئے، اناپ شناپ بکتے ہوئے مجھے چاروں طرف سے
 نرغے میں لے لیا۔ ایک دد نے پتھر بھی اچھا لے۔ میرا ماتھا زخمی ہو گیا۔ اتنے
 میں انیس خاں اپنی نئی نوپلی دلہن رخسانہ کو ساتھ لئے اپنی مٹی مراد پوری ہونے
 کی خوشی میں گوندی پیر کے مزار پر منست چڑھانے آیا۔ اپنے ساتھ بوندی کے
 لٹولا یا۔ شیرینی کے کھال دیکھ کر سمندر سائیں کے شیر تو ادھر ہو گئے اندر میں

ادھر چلا آیا۔ میرے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔ محقن پھیرے نے جلدی سے اپنے سلوکے کی جیب سے ایک چمچھڑا سا نکال کر میرے ماتھے پر پٹی باندھی۔ یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بولا۔

”سلیم بالوان کی ریٹ کرادو تھا نے میں۔ شہادت میں دوں گا۔“ مگر میں نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ چپکے سے گھر کا راستہ لیا۔ میں تھانے نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہنگامہ کرنے والے لوگ مجھے سمجھے نہ تھے۔ میں انہیں سمجھانہ سکا تھا۔ میری باتیں انھوں نے عقل سے نہیں جذبات سے سنی تھیں۔ جذبات میں ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ میرے گیان دھیان کا گوتم گیان دھیان میں مگن تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ وہ مطمئن تھا۔

اس ہنگامے کو انیس خاں نے اور ہوا دی۔ سائیں جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کو اور بھڑکایا۔ میرے خلاف بستی میں بڑا ہی زہریلا پراسپیکٹڈ کرنے کی ترغیب دی۔ وہ میرے خلاف گھر گھر زہر پھیلائے لگے۔ لوگوں میں اعتقاد کی جذبات بھڑکانے لگے۔ اس بات کو عقیدہ و اعتقاد کی بات بنا دیا گیا میرے متعلق یہ مشہور کیا گیا کہ میں خدا کو نہیں مانتا۔ پیروں فقروں کو نہیں مانتا۔ ان کی شان میں گستاخیاں کرتا ہوں۔ بستی کے لوگ مجھ سے بدظن ہو گئے جس کا ہمارے کام پر بہت بُرا اثر پڑا۔ کئی عورتوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ جس کی وجہ سے مارکیٹ میں ہمارے مال کی سپلائی کسی حد تک رک گئی۔ وقت پر مال نہ ملنے سے کئی گاہک ٹوٹ گئے۔ گودام میں دس بارہ ہزار روپے کی مالیت کا خام مال پڑا تھا۔ جسے آگ لگا کر جلا دیا گیا اور کچھ سرائے نہ ملا آگ لگانے والے کون

تھے۔ ادنیٰ مال بنانے والی دوشینیں خریدی تھیں وہ بھی اسی اثنا میں چرائی گئیں۔ اس بستی کے اندھیروں میں کسی سویرے کا انتظار کرنے والے اندھیروں کے مسافروں کے اجالے کی آخری کرن بھی چرائی گئی۔ جلا دی گئی۔ چھوڑ پڑوں میں کھائے بستے لہو کھوکتے پچیس فیصدی کھو کھائے ڈھانچوں کی زندگی کی آخری رت بھی مسٹ گئی۔ کام چل رہا تھا تو انہیں سب کچھ مل ہی رہا تھا۔ دوائیاں۔ دودھ مکھن۔ انڈے۔ بسکٹ۔ پھل۔ جو ہم سے ہو سکتا تھا اُسے زندگی کا سب سے بڑا فرض سمجھتے ہوئے ہم کہہ رہے تھے۔ مگر جب سارے راستے مسدود ہو گئے تو ہم مجبور ہو گئے۔ نقصان ہو جانے کا۔ مجھے اتنا افسوس نہ تھا۔ افسوس تو اس بات کا تھا کہ نقصان کرنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ وہ کس کا نقصان کر رہے ہیں۔

اس ابتری میں انیس خاں کی بن آئی تھی۔ اُس نے بستی میں ایک ہونڈی اور دو کارخانے کھول دیئے۔ ہونڈی میں ادنیٰ مال تیار ہونے لگا۔ ایک کارخانے میں صابن بنانے کا کام شروع کر دیا گیا اور دوسرے میں جوتے بنانے کا۔ وہ عورتیں جو ہمارے یہاں کام کرتی تھیں وہاں کام کرنے لگیں۔ اگر بند گوالہ اور اس کی بیٹی گوری اس وقت ہمارے ساتھ تعاون نہ کرتے تو کام اُسی وقت ٹھپ ہو جاتا۔ انیس خاں نے بند اور اس کی بیٹی کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ دونوں اس کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنی برادری کے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ ہونے والے الیکشن میں انیس خاں ان کی برادری سے اب ایک

دوٹ بھی نہیں لے سکتا تھا۔ بند گوالہ پوشیدہ طور پر اس کے خلاف ایک محاذ قائم کر رہا تھا۔ انیس خاں نے اس کی بھولی بھالی بیٹی کو بہاد کر دیا تھا۔ یہ بات بندو کی برادری کے لوگوں کے دلوں میں بھی پھانس بن کر رہ گئی تھی۔ اور گوری کا تو اس صدمہ سے بہت برا حال ہو گیا تھا۔ ابھی تک اس نے لہو تو نہیں کھٹو کا تھا مگر کھانا سنا شروع کر دیا تھا۔ نجمہ اُسے بڑی تسلیاں بڑے دلا سے دیا کرتی تھی۔ اس کے دل سے ایک ایسے مرد کی یاد کو نکالنے کی کوشش کیا کرتی تھی جو مطلبی تھا۔ جھوٹا تھا۔ ہرجائی تھا۔ دولت کے لالچ میں آکر بڑے میاں نے انیس خاں کو اپنی چھوٹی بیٹی کا رشتہ دے کر گوری پر بڑا ظلم کیا تھا۔ جس کے خیال سے نجمہ بہت حساس ہونے کی وجہ سے بڑی نادم تھی۔ گوری کے دل کی چوٹ اس کے دل کی چوٹ بن گئی تھی۔ وہ گوری کو اپنی بہن سمجھنے لگی تھی۔ گوری کے ساتھ اُسے بہنوں کا سا پیار ہو گیا تھا۔ کام کے سلسلے میں گوری اس کے پاس آتی تو دونوں مل کر کھانا کھاتیں۔ دنوں ہی میں ان میں بڑی گہری چھپنے لگی تھی۔

مارکیٹ کو ہاتھ میں لینے کے لئے انیس خاں نے ہمارے ڈنگا تے کا دوبارہ پر ایک اور کاری ضرب لگائی۔ ہمارا کام بالکل ٹھپ کرنے کے لئے اُس نے ادنیٰ مال کے نرخ لاگت سے بھی نیچے گرادیئے۔ یہ سب کچھ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ہو رہا تھا۔ وہ نقصان اٹھا کر ہمیں نقصان پہنچاتا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک اچھی خاصی رقم اس نے علیحدہ کر دی تھی۔ ایک طرنت بستی کا ایک گرگ باراں دیدہ تھا۔ اس کے لئے کام کرنے والے آدمیوں کی ایک

جماعت تھتی اس کے ساتھ۔ اور دوسری طرف فقط دو گھبراٹے ہوئے، تھکے ہوئے، الجھنوں میں الجھے ہوئے کم سرمایہ انسان۔ مخالف ہواؤں کے اس ریلے کے آتے ہی ہمارا کام بالکل فلاپ ہو گیا۔ جوتے بنانے کا کام شروع کرنے کے لئے جو دو اڑھائی ہزار روپے کا سامان خریدا تھا وہ بھی بالکل خراب ہو گیا۔ اب اتنا سرمایہ نہ رہا تھا ہمارے پاس کہ اس کام کو شروع کیا جاتا میں نے اسے فروخت کرنے کی کوشش بھی کی مگر کوئی معقول گاہک سامنے نہ آیا چوڑوں کے کپڑے اور لٹھیوں کے گز والا معاملہ کرنے کو میں تیار نہ تھا۔ اور اس سامان کو گر کر فروخت کرنے کی اس وقت چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ دو اڑھائی ہزار روپے کی رقم کھٹے پڑ گئی۔ کونے میں جا لگی۔ کاٹھ کیا بن گئی۔ پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانستے انسانوں کی ملتی دنوان کے راستے دھندلے ہو گئے۔ ان پر دھند چھا گئی۔ سوچا تھا یہ کام ہماری تخت و مشقت سے بڑا وسیع ہو جائے گا تو ایک ٹرسٹ قائم کر کے دق کے مریضوں کے لئے ہسپتال بنائیں گے۔ انیس خاں اینڈ کوئٹا تھا ان کارخانوں کے کاروباری منافع سے کرم دھرم کے کئی کام کرے گی۔ یتیموں اور بیواؤں کو پالا پوسا جائے گا۔ بستی کے نادار بچوں کو پڑھایا لکھایا جائے گا۔ ان کا مستقبل روشن کیا جائے گا۔ ڈھاروں اور چھپروں میں لہو تھوکتے انسانوں کی مناسب دیکھ بھال کی جائے گی۔ ان میں دوائیاں اور کھانے پینے کی ضروری چیزیں تقسیم ہوتی رہیں گی۔ دق کے خلاف جہاد کرنے والوں کو، محاذ قائم کرنے والوں کو اس بستی میں بھی محاذ قائم کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ میں اور نجمہ بہت خوش تھے۔ جس مہم میں ہم ناکام ہو گئے تھے

اُسے کامیاب بنانے کا بستی کے چوہدری نے بیڑہ اٹھالیا تھا۔ ہم چاہتے تھے
اگر پندرہ لاکھ لہو کھتو کتے کھانتے انسانوں کے لئے ہم کچھ نہ کر سکیں تو کم از کم
اس بستی کے پچیس فیصد لہو کھتو کتے کھانتے انسانوں کے لئے تو کچھ کیا جائے۔
اپنی مدد آپ کرو کے جذبے کے تحت اس بستی میں بیداری پیدا کرنا ہمارا مقصد
تھا۔ دن کے بخار سے تپتے ہوئے پچیس فیصد انسانوں کے اس ریگستان میں
کوئی نخلستان پیدا کرنا ہمارا مقصد تھا۔ مگر ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے،
مگر ہم خوش تھے۔ اسی مقصد کو پورا کرنے کی آوازیں دن رات ہمارے کانوں
میں آرہی تھیں۔ اس بستی کے اندھیروں میں روشنی کا بندوبست کیا جائے گا۔ روشنی
کا ایک مینار بنایا جائے گا ایک سوشل ویلفیئر سوسائٹی قائم کی جائے گی۔ اس
بستی کو جنت بنایا جائے گا۔ گندگی و غلاظت کے ڈبھروں کو ہٹایا جائے گا۔
آنے جانے کے لئے چھوٹی چھوٹی سڑکیں بنائی جائیں گی۔ گندے پانی کے نکاس
کے لئے نالیوں کا انتظام کیا جائے گا۔ عنقریب ہی حکومت کے تعاون سے
ڈھاروں اور جھونپڑوں کو خوشنما کواٹروں میں بدل دیا جائے گا۔ یہ بستی سٹے
لاسٹ ٹاؤن بن جائے گی۔ مگر ایسا تو کچھ نہ ہوا البتہ انیس خاں نے اسی اثنا میں
بستی میں اپنے چھ سات مکان اور بنائے۔ اپنے کارخانوں میں کام کرنے والی
بے سہارا کئی عورتوں کو اپنی داشتہ بنالیا۔

میری ازدواجی زندگی کے ساتویں سال میں میری زندگی کی ایک بہت بڑی
ٹریجڈی نے میرے سب سے چھوٹے بچے کا مران کے ساتھ نجمہ سے منجم لیا۔ اس کی

پیدائش سے چار دن بعد نجمہ کو بخار آنے لگا۔ ڈوائف نے سمجھا سوئی کی بخار ہے چند روز میں اتر جائے گا۔ اپنی سوچ سمجھ کے مطابق علاج کرتی رہی۔ مگر کچھ آفاقہ نہ ہوا۔ میں نے ایک قریبی ڈاکٹر سے رجوع کیا۔ بخار کے ساتھ اب نجمہ کو کھانسی بھی آنے لگی تھی۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا تو تشویش ظاہر کی۔ اس نے مشورہ دیا مریضہ کی سکرین کرائیے۔ لہذا اسی دن سکرین کرائی گئی۔ رپورٹ ملی تو معلوم ہوا نجمہ کو دق ہو گئی ہے۔ اس کے بائیں پھیپھڑے میں چھوٹا ساداغ نکلا۔ بس خراش سی۔ مگر ڈاکٹر سکرین رپورٹ سے مطمئن نہ تھا۔ مشورہ دیا اب مریضہ کا ایکسرے کرائیے۔ ایکسرے رپورٹ میں بھی بائیں پھیپھڑے میں نقص نکلا۔ بس چھوٹا ساداغ۔ خراش سی۔ مگر وہ خراش سی مجھے ایک بہت بڑی خلیج نظر آئی جو میرے اور نجمہ کے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ ایک انٹ فلٹ خلا جو اس کے اور میرے درمیان آہستہ آہستہ پھیلنے لگا تھا۔ میری بے چینی و پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ طرح طرح کے دوسوسوں اور دکانوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے گیان دھیان کی دنیا میں لہو تھوکتی کھانسی پندرہ لاکھ زندہ لاشوں میں ایک اور لاش کا اضافہ ہو گیا تھا۔ کابوسی خواب میری غیندوں پر شخون مارنے لگے۔ میں وحشت کے بہت قریب تھا۔ لیکن دق کے متعدد ماہرین نے میری ڈھارس بندھائی۔ ان کی تسلیوں نے مجھے سنبھالا دیا۔ انھوں نے کہا

”اب یہ مرض لا علاج نہیں رہا۔ موجودہ میڈیکل سائنس نے اس پر کافی حد تک قابو پا لیا ہے۔ مریضہ اچھی ہو جائے گی۔ اسے فوراً کسی ہسپتال میں داخل کرادیجئے۔“

دل دیا رہا تھا

مگر نجمہ کسی ہسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ بہت سی باتیں سن سنا کر وہ ہسپتالوں سے بہت خائف ہو چکی تھی۔ اور اس کی حالت بھی کچھ ایسی تشویشناک نہ تھی۔ لہذا میں نے گھر میں ہی اس کے علاج کا بندوبست کیا۔ دق کے ایک ماہر ڈاکٹر کی زیر ہدایت اس کا علاج ہونے لگا۔ پہلا کورس۔ دوسرا کورس۔ تیسرا کورس۔ علاج بدستور جاری رہا۔ مگر کچھ آفاقہ نہ ہوا۔ ایلو پیٹھی۔ ہومیو پیٹھی۔ بائیو کیمک۔ آئیور ویدک۔ طب یونانی۔ کوئی طریقہ علاج ایسا نہ تھا جس سے رجوع نہ کیا گیا ہو۔ مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ داغ جتنا تھا بدستور اتنا ہی رہا۔ اسی کشمکش میں تین سال گزر گئے۔

یہ بڑی شاہانہ بیماری ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے لوگوں کو لگ جاتی ہے جو شہنشاہ نہیں ہوتے۔ میرے پاس جو کچھ تھا میں نے نجمہ کی بیماری پر لگا دیا جیسے ہارا ہوا جواری ادھر ادھر سے مال لوٹ کھسوٹ کر داؤ پر لگاتا چلا جاتا ہے کہ شاید پانسہ اس بار ہی ساتھ دے جائے اور وہ جیت جائے۔ مگر میری قسمت نے میرا ساتھ نہ دیا اور وہ وقت آگیا جسے ابھی نہ آنا چاہئے تھا۔ نجمہ کی حالت یکدم بہت خراب ہو گئی۔ زکا ہرت و کمزوری اس کے جسم میں حد سے زیادہ بڑھ گئی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ اس کے چہرے پر موت کی پرچھائیاں سرسرا نے لگیں۔ وہ لہو کھٹو کھٹو کھٹو لگی۔ لہو۔ میری ڈریم لینڈ کی مونا لیزا کا لہو۔ میرے سپینوں کی لہستی کی بیاطرس کا لہو۔

یہ بڑا کھٹن وقت تھا مجھ پر۔ یہ زمانہ میری زندگی نے میرے جسم میں نہیں نجمہ کے سینے کے ہر داغ میں گزارا۔ میرے اقتصادی حالات کچھ ٹھیک نہ تھے۔

کئی دنوں سے کوئی کہانی، کوئی ناول نہ لکھا تھا، ریڈیو اور اخباروں، رسالوں کے لئے لکھ رہا تھا اور اسی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ کہانیوں کا بیوپاری۔ اس کی مدد تو بیوی اور چھوٹے چھوٹے بچے بڑی مشکل میں تھے۔ لوگ کہانیاں بہت کم خریدتے ہیں۔ کہانیاں بہت کم اور کبھی کبھی بکتی ہیں۔ کہانیوں سے پیسے نہیں بھرا جاسکتا۔ کہانیوں کو اوڑھنا نہیں جاسکتا۔ اور اگر کسی داستان گو کی بیوی کو وق ہو جائے تو وہ اپنے شوہر کی لکھی ہوئی کہانیوں کو دوائیوں کے طور پر استعمال نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر کہانیاں لے کر مریضوں کا علاج نہیں کرتے۔ بڑی مشکل میں جان آگئی تھی۔ مالی مشکلات کی وجہ سے نجمہ کو نہ تو مناسب غذا دی جاسکتی تھی اور نہ دوا۔ اور بیماری زور پکڑتی جا رہی تھی۔ داغ دن بدن بڑھ رہا تھا۔ بڑی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ آخری سکریننگ رپورٹ نے تو ہمارے چھکے چھوڑا دیئے۔ نجمہ کا بایاں پھیپھڑا آدھے سے زیادہ ماف ہو چکا تھا۔ اب وہاں ایک نہیں کئی داغ تھے۔

”کہیں کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتے سلیم بابو؟ ایک دن نجمہ نے کہا۔“
”ان کہانیوں میں کیا دھرا ہے۔ دن رات گردن جھکائے قلم چلائے جاتے ہو۔ مگر ان سے حاصل تو کچھ بھی نہیں ہوتا دوجوں کی فیس۔ گھر کا خرچ۔ میری دوائیاں۔ کب تک کھینچ کھا پنچ کر وقت پورا کرتے رہو گے۔ ہر شخص اپنے مستقبل کو سامنے رکھ کر زندگی میں کوئی کام کرتا ہے۔ چھوڑو اس کام کو۔ کیا تمہیں اپنے مستقبل کی فکر نہیں۔ کیا تم نے اپنے آنے والے وقت کے متعلق بھی کبھی

کچھ سوچا ہے۔“

”میرا مستقبل بڑا درخشاں ہے نجی۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے

کہا۔

”میرے مستقبل کے متعلق اب رائٹر گلڈ سوچے گی میں نہیں سوچوں گا۔

جب سے یہ گلڈ وجود میں آئی ہے میں نے اپنے مستقبل کے متعلق سوچنا بالکل بند کر دیا ہے۔ میں فقط لکھتا رہوں گا۔ لکھنا چلا جاؤں گا۔

کہانیاں۔ افسانے۔ اب مجھے اپنے متعلق کچھ نہیں سوچنا۔“

”رائٹر گلڈ کیا ہے؟“ نجمہ نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

”ملک کے قلمکاروں کی نمائندہ جماعت ہے۔“ میں نے گفتگو جاری

رکھتے ہوئے کہا۔

”ان کے بنیادی حقوق کی محافظت جماعت ہے۔ ان کی کامرٹڈ جماعت۔

ان کے ہر مسئلہ کا حل سوچنے والی جماعت۔ ان کی ہر مصیبت

میں کام آنے والی جماعت۔ نجی۔“

”سلیم بابو۔“

”جب سے یہ جماعت وجود میں آئی ہے میرا بوجھل دل ہر وقت

ہلکا پھلکا رہنے لگا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اب

میں لا وارث نہیں رہا۔ میرا کوئی وارث۔ میرا کوئی مونس و غمخوار میرا

کوئی ہم جلیس پیدا ہو گیا ہے۔ اب میری لاش لا وارث نہیں

کھلائے گی۔ میرے مسودوں کے کاغذ سی پرو کر مجھے کاغذ کے

کفن میں نہیں کفنایا جائے گا۔ اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے۔ میرے لئے۔ ہر قلم کار کے لئے۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے نجی۔ یہ جماعت نہ صرف قلم کار بلکہ اس کے بچوں کے مستقبل کی بھی محافظ ہے۔“ وہ کیسے؟

”اس کے منصوبوں میں ہر قلم کار کے بچوں کو تعلیم دینے کا منصوبہ بھی ہے۔ ہر سال بہترین ذہنی کاوشوں کا یہ جماعت قلم کاروں کو ہزاروں روپے کا انعام بھی دیا کرے گی۔ جہاں تک اس جماعت کی افادیت کا تعلق ہے ہمارا ملک سب سے آگے بڑھ گیا ہے نجی۔ اور کسی ملک میں ایسی کوئی جماعت نہیں جو ہر قلم کار کے ہر پیچیدہ مسئلہ پر غور و خوض کرے اور اس کا صحیح حل تلاش کرے۔ یہ اپنی قسم کی واحد نمایندہ جماعت ہے اور اسے ہمیشہ رہنا چاہئے۔ اس کی نمایندگی میں اس ملک کا قلم کار بڑی خوشحال زندگی بسر کرے گا۔“ پھر تو یہ بڑی اچھی جماعت ہے۔ لیکن اسے چلانے کے لئے ایسے اچھے ورکروں کی ضرورت ہے جو نیک نیتی سے اس کے لئے کام کریں۔ اس کے نام اور نشان کے جھنڈے کو ہمیشہ اونچا رکھیں۔ جو بغیر کسی مطلب، غرض، جانبداری، نا انصافی اور حق تلفی کے اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیں۔ ایسی جماعت کو چلانے کے لئے ایسے ہی انسانوں کی ضرورت ہے۔ اور یہ تو بتایا ہوتا یہ منصوبے کب عمل میں آئیں گے؟“

”اس میں کچھ وقت لگے گا۔ اتنا جا رہی ہے۔ ہر چیز میں جا رہی ہے۔
بہت کچھ ہو چکا ہے۔ بہت کچھ ہو رہا ہے۔ بہت کچھ ہو جائے گا۔
تم اس کا کچھ خیال نہ کرو نجی۔ اور مجھے ایک مشورہ دو۔“
”کیسا مشورہ؟“

”تمہاری اور تمہارے بچوں کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے
میں نے سوچا ہے کہ وقت کے بدلنے تک اس بستی میں ٹائٹ
اسکول کھول دوں۔ بچوں کو گیارہ دھیان کا پاٹھ دیا کروں گا۔ دیکھو
نجی میں تمہارے لئے۔ تمہاری طرح کے پندرہ لاکھ انسانوں کے لئے
مکمل و زردان کا راستہ تلاش کر رہا ہوں۔ میرے پاس کسی کی نوکری
کرنے کا وقت کہاں ہے۔ اور مکمل یکدم حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس میں
کچھ وقت لگے گا۔ مگر میں تمہیں ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لئے تو میں
ٹائٹ اسکول کھول رہا ہوں۔ صبح کو کہانیاں بچوں کا اور رات کو بچوں
کو پڑھاؤں گا۔“

”میں کہتی ہوں انیس خاں خدیث نے تمہارا اسکول بھی نہیں چلنے دینا۔
چلے چلائے تمہارے کام اس نے بند کر دیا ہے۔ اسکول کو بند کرانا
اس کے لئے مشکل بات نہ ہوگی۔ اور پھر بستی کے سارے لوگ تو
تم سے بدظن ہو رہے ہیں۔ تمہیں دہریہ کہتے ہیں۔ خدا کا دشمن پیریں
فقیروں کا دشمن کہتے ہیں۔ اپنے بچوں کو تمہارے اسکول میں پڑھنے
کے لئے ضرور ہی بھیجیں گے۔ کسی وقت تو تم بالکل بچوں کی سی باتیں

کرنے لگتے ہو سلیم بابو۔“

”تم فکر نہ کر دیجی۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
”میں اس شہر کے بہت بڑے رئیس کو ایک سوشل ویلفیئر سوسائٹی قائم کرنے پر مجبور کر رہا ہوں۔ وہ میری کہانیوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہے۔ مجھ سے بڑی دلچسپی لیتا ہے۔ میں نے اُسے ایک پلان بتایا تھا کہ سوسائٹی میں ایک کوآپریٹو سٹور بھی بنائیں گے جس کی آمدنی میں سے کام کرنے والوں کا معاوضہ نکال کر منافع کی ادھی رقم سرمایہ کار لے جائے اور ادھی رقم وق کے مریضوں پر صرف کی جائے۔“
”پھر اُس نے کیا کہا؟“

”وہ رضامند ہو گیا ہے۔ عنقریب ہی کام شروع کر دیا جائے گا۔ اس نے دیہات میں دو بیگھے زمین خریدی ہے۔ فروٹ فارم بنائیگا۔ کھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔ ادھر سے فارغ ہوتے ہی وہ اس کام کی طرف پوری پوری توجہ دے گا۔“

نجمہ یہ سن کر خوش ہو گئی۔ بڑے دنوں کے بعد میں نے اُسے پھر مسکراتے دیکھا تھا۔ اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مکتی کے اجالے کی سب سے پہلی کرن نے میرے اندر جھانک کر دیکھا ہے۔ یہ مجھے اس دن معلوم ہوا کہ نجمہ اور میں بالکل ایک طرح سوچتے تھے۔ لیکن اس بستی کا سب سے بڑا سکندڑ سازائیس خاں ہمارے متعلق اب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ وہ مجھے ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ نجمہ کی تشویشناک علالت بھی اس کے لئے بڑی خوشی کا باعث

کھتی۔ اور وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ وہ لڑکی جس نے اس کی بیوی بننا پسند نہ کیا تھا موت کے چنگل میں کھتی۔ وہ نجمہ اب دن رات لمو کھتو ک رہی کھتی جس نے اس کے دل کو ٹھیس لگا لی تھی۔ اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ ہاں وہی نجمہ جو نکاح کے موقع پر گھر سے بھاگ کر میرے پاس آگئی تھی۔ جس نے عدالت میں کھڑے ہو کر میرے ساتھ شادی کرنے کا اعلان کیا تھا۔ وہ اُس نجمہ کو زندگی اور موت کے درمیان سسکتا دیکھ کر اندر سے بہت خوش تھا۔ وہ اُس سے ایسی حالت میں بھی بیرلینا چاہتا تھا۔ اُس نے اپنی ساس کو اگسایا۔

”بڑی بی نجمہ آخر تمہاری بیٹی ہے۔ اُس سے جو کچھ ہوا خاک ڈالو اس پر معاف کر دو اس کی غلطی۔ کسی وقت اس کے پاس جاؤ۔ اور اُسے بتاؤ کہ اس کی ساس نے اُسے مسان کھلا دیئے ہیں۔“

”مسان۔“ بڑھیا چونک گئی۔

”ہاں۔ میں آج مزار پر گیا تھا۔ سمندر سائیں استخارہ کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ انہوں نے استخارہ میں اس بستی پر ایک نظر ماری تو نجمہ کے روگ کی رام کہانی بھی اُن سے چھپی نہ رہی۔ بتاؤں سائیں جی کیا کہتے ہیں؟“

”کیا کہتے ہیں؟“

”وہ کہتے ہیں نجمہ کی ساس اپنے بیٹے کا بیاہ اپنے رشتے داروں میں کرنا چاہتی ہے۔ اسی لئے تو اس نے یہ کارن کیا ہے۔“

”اچھا تو میں آج ہی نجمہ سے ملتی ہوں۔ اور اس بیوقوف لڑکی کو اس کے

چہیتے کی اور اس کی ماں کی کرتوت بتاتی ہوں۔ خدا انہیں عارت

کرے کیسا سیٹھا پیر لیا ہے میری بچی سے۔ چوہدری بیٹا سائیں جی سے

کہا ہوتا وہ تمہاری سالی کے لئے کچھ کریں۔“

”وہ سب کچھ کریں گے۔ ابھی وقت ہے۔ نجمہ سے کہو وہ بچوں

کو چھوڑ کر۔ اُس خبیث کو چھوڑ کر یہاں چلی آئے۔“

نجمہ کی ماں اپنی بیٹی رضانہ کو ساتھ لے کر اُسی دن نجمہ کی خبر لینے آئی۔ ماں اور

بہن کو دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوئی۔ اٹھ کر گلے ملی۔ بڑی عزت سے بٹھایا۔ بازار

سے بہت کچھ منگوا کر ان کی خاطر تواضع کی۔ میں اپنے چھوٹے بیٹے کا مران کو بستر

پر لٹا کر ایک ضروری کام سے باہر چلا گیا۔ اور میری ساس کو کھل کر باتیں کرنے کا

موقعہ مل گیا۔ لہذا اس نے ایسے ایسے ڈھکوسلے گھڑے۔ ایسی ایسی ہوائیاں

چھوڑیں۔ ایسے ایسے داؤ چلائے کہ نجمہ اس کی باتوں کو سچ سمجھنے لگی۔ اسے

یقین ہو گیا کہ اسے مسان نکلائے گئے ہیں۔ ادھر انیس خاں نے گوند ہی پیر

کے مجاور سمندر سائیں کو سب کچھ سکھا پڑھا کر تیار کر چھوڑا تھا۔ وہ لوگ پہلے

ہی میرے خلاف تھے۔ خوب موقعہ مل گیا تھا انہیں مجھے چھیلنے کا۔ مجھے

اس کا علم بھی نہ ہوا اور میری ساس نجمہ کو پاکی میں بٹھا کر مزار پر لے گئی۔ جہاں

سمندر سائیں نے ایک عجیب پاکھنڈ کیا۔ حجرے میں اگر بتیاں لوبان جلا یا پھول

بتا۔ شے رکھے۔ مصلے بچھا کر اُس پر بیٹھ گیا۔ استخارہ کیا۔ یعنی ایک ڈرامہ کیا۔

نجمہ سے کہنے لگا۔

”تمہیں تمہاری ساس نے مسان کھلائے ہوئے ہیں۔ اور تمہارا خاوند تم سے دکھاوے کی محبت کرتا ہے۔ وہ تمہاری موت کا انتظار کر رہا ہے۔ وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ بچوں کو چھوڑ دو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ اپنی ماں کے پاس آ جاؤ۔ چالیس دن لگا تا بڑے پیر کی چونکی دو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ نہیں تو مر جاؤ گی۔ بڑے تھوڑے دنوں کی مہلت رہ گئی ہے۔ مسان اپنا کام کر جائیں گے۔“

ان جعل سائر انسانوں کی باتوں نے نجمہ کا دل میری طرف سے کچھ کھٹا کر دیا تھا۔ وہ میرے ساتھ کھچی کھچی رہنے لگی۔ یہ کھچاؤٹ دیکھ کر میں سوچوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگا کہ خدایا یہ کیا ماجرا ہے؟ نجمہ مجھ سے کھچی کھچی کیوں ہے؟ مجھ سے کیا قصور ہو گیا ہے؟ میں نے اسے کریدا اور کامیاب ہو گیا۔ اس نے مجھے ساری باتیں بتا دیں۔ وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔

”میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں نجمی۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

”یہ سب انیس خاں کی شرارت ہے۔ تمہیں مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس گھر کو برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تم اگر چھوڑنا چاہتی ہو تو چھوڑ جاؤ میں تمہیں کسی حالت میں بھی چھوڑنے کو تیار نہیں۔“

”نہیں۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہارے قدموں میں دم

دوں گی۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اگر ایک دو چونکیاں دیکھے لوں تو کیا ہرج ہے۔ شاید خدا شفا دے دے۔ تمہیں اس میں کیا اعتراض ہے بالبو۔ علاج تو بہت ہو چکا۔ دوائیاں تو سب استعمال کر کے دیکھ لیں۔ دن بدن جان جواب دیتی جا رہی ہے۔ آخر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو بتاؤ۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”مگر ایسا کرنے سے پہلے تمہیں لیڈی ڈاکٹر فردوس سے ضرور مشورہ کر لینا چاہئے۔ کیونکہ تم اس کے زیر علاج ہو۔ اور پہلے سے تمہاری حالت کچھ کسنجھلی ہوئی ہے۔“

”اچھا تو میں لیڈی ڈاکٹر فردوس سے بات کروں گی۔“ نجمہ نے جواب دیا اور لیٹ گئی۔ اس کی بائیں پسلی میں درد ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کی پسلی پر بام کی مالش کی۔ اور گرم پانی کی بوتل اُسے دے کر اپنے کام پر چلا گیا۔ ایک کہانی کا سودا ہو رہا تھا۔ میں مسودہ لے کر وہاں پہنچا۔ پبلشر بڑی بے صبری سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے شکار کھیلنے جانا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ پرندوں کا شکار کرنے سے پہلے ایک رائٹر کا شکار کرتا جائے۔ اس کے نزدیک شاید یہ کوئی اچھا شگون ہو۔ رسمی جملوں کے بعد اس نے مجھے سگریٹ پیش کیا اور کاروباری بندوبست لوڈ کر کے بیٹھ گیا۔

”آپ کے ناول کا کیا نام ہے؟“ یہ پہلی کاروباری بات تھی۔

”گندم کی کہانی آدم کی زبانی۔“ میں نے جواب دیا۔

”رمانی گاڑ۔ اتنا لمبا نام۔“

”فٹ دو فٹ لمبا تو نہیں۔ کل چھ الفاظ ہیں۔“

”اجی نہیں۔ چھوٹا نام چلے گا۔“

”لیجئے چھوٹا کٹے دیتے ہیں۔ مگر اتنا جس سے ناول ننگا نہ ہو جائے۔“

”مائی گاڈ۔ ناول ہے یا پاجامہ۔“

”اس کا اندازہ تو ناول پڑھنے سے ہو سکے گا۔ سناؤں ایک دو باب؟“

”اجی نہیں۔ پہلے نام کا فیصلہ تو ہو جائے۔“ اس نے کہا۔

”لیجئے ہو گیا۔ ناول کا نام ہو گا گندم کی کہانی۔“ میں نے کہا۔

”مائی گاڈ۔ عجیب نام ہے۔“ اس نے کہا۔

”اور گندم کیا کم عجیب چیز ہے۔“ میں نے کہا۔

”آخر نام میں کیا عدت ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”عدت نہیں اس میں فقط عدت ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ پبلشر نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”مطلب بعد میں جناب پہلے اس مقصد کو دیکھئے جسے پورا کرنے کے لئے

یہ ناول لکھا گیا ہے۔“

”مقصد بتائیے۔“

”اس ناول کو لکھنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس غذائی بحران میں لکھنے والوں

کو ذرا اعت پر بھی لکھنا چاہئے۔“

”ذراعت پر کیوں لکھا جائے؟“

”اس۔۔۔ لکھا جائے کہ ہمارا ملک ایک زرعی ملک ہے جس کی سب سے

بڑی صنعت زراعت ہے۔ اس کی ۸۵ فی صد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ اور ۹ فی صد آمدنی کا دار و مدار زراعت پر ہے۔ مگر یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اتنی بڑی آبادی کا زراعت سے تعلق ہونے کے باوجود یہاں زرعی پیداوار کی کمی ہے۔ غذائی بحران ہے۔ یہاں تک کہ غذائی پیداوار بڑی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی۔ جس کے نتیجے کے طور پر ملک کے زرمبادلہ کی ایک بڑی رقم باہر سے گندم اور چاول منگوانے پر خرچ ہو جاتی ہے۔“

”گندم کی کہانی میں چاول کا ذکر کیوں آیا؟“ پبلشر نے پوچھا۔
”اس لئے کہ ہم گندم بھی کھاتے ہیں اور چاول بھی کھاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”چلیے ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات۔“

”اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اور عوام کو زندگی کی ضروریات پر زیادہ خرچ کرنا پڑ رہا ہے۔ اجناس خوردنی کی پیداوار بڑھائے بغیر آبادی میں اضافہ ملک میں خوراک کی کمی کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اب تک ہم نے اجناس خوردنی کی پیداوار بڑھانے میں بہت کم کامیابی حاصل کی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں آبادی بڑھ رہی ہے۔“

”بڑھتی ہوئی آبادی کا تدارک خاندانی منصوبہ بندی سے بھی کیا جاسکتا ہے“
”جی بالکل ٹھیک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ملکی معاشیات میں توازن پیدا کرنے اور صنعتی ترقی کو بحال کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اجناس خوردنی میں اضافہ

کرنے کی منصوبہ بندی میں وہ تمام تجاویز اور ذرائع کام میں لائے جائیں جو ممکن ہیں۔ کاشتکاروں کو چاہئے کہ حکومت کی مہیا کی ہوئی سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کریں۔ اس میں ان کا اپنا بھی فائدہ ہے اور ملک کا بھی۔ زیادہ اناج پیدا کرنا اس وقت ملک کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ جس کی طرف کاشتکاروں کے علاوہ قلمکاروں کو بھی توجہ دینی چاہئے۔

”کاشتکار اور قلمکار میں کیا نسبت ہے؟“ اس نے پوچھا

”کاشتکار ہل چلاتا ہے۔ قلم کار قلم چلاتا ہے۔ کاشتکار بیج بونے کے لئے زمین کھود کر اُسے ہموار کرتا ہے۔ قلمکار اونچی قدروں کو فروغ دینے کے لئے ذہن کو کرید کرید کر اُسے ہموار کرتا ہے۔ قلمکار اپنے معاشرے اپنے ماحول کا عکاس ہے۔ کیا وہ موجودہ غذائی بحران میں تڑپتے بلکتے انسانوں کی عکاسی نہیں کرے گا؟“

”بائی گاڈ۔ گندم کی کوئی کہانی ہی نہیں ہو سکتی۔“

”ہو کیوں نہیں سکتی۔ گندم کی کہانی دراصل تہذیب آدم کی داستان ہے۔“

گندم کی کاشت تاریخ انسانی کے اہم ترین واقعات میں سے ہے۔ گندم کی کاشت سے کھیت کا تصور پیدا ہوا۔ کھیت کے تصور سے ذاتی ملکیت کا تصور ابھرا۔ گندم کی کاشت نے پہلے کھیت پیدا کئے۔ پھر شہر اور حکومتیں۔ بہت سے علوم و فنون گندم کی کاشت ہی سے وجود میں آئے۔ گندم کی داستان ایک قدیم اور عظیم داستان ہے۔ گندم تخلیق آدم سے پہلے ہی جنت میں موجود تھی۔ اس اعتبار سے گندم کی کہانی انسان کی ابتدائی کہانی سے بھی زیادہ دلچسپ

اور پرانی ہے۔“

”اس داستان کے کتنے باب ہیں؟“ پبلشر نے پوچھا۔

”بیس باب“ میں نے جواب دیا۔

”اس کے تیسرے باب میں کیا ہے؟“ اس نے دریافت کیا۔

”کیا کس کی کہانی ہے۔“

”مائی گاڈ۔ کہانی میں ایک اور کہانی ہے۔“

”اپنی اپنی تکنیک ہے۔“

”بائی گاڈ انسان کیا کس تو نہیں کھاتا ہے۔“

”انسان کیا کھاتا نہیں پیتا ہے۔ لباس بھی انسان کی تین بنیادی ضرورتوں میں سے ہے۔ ہر انسان کو رہنے سہنے کے لئے مکان۔ کھانے کے لئے روٹی۔ اور تن ڈھانپنے کے کپڑے کی ضرورت ہے۔ اس تثلیث میں انسان کے ذہنی ارتقا کی پوری داستان سمٹ آتی ہے۔ خوراک کے بعد لباس انسان کی دوسری بنیادی ضرورت ہے۔ جو اسے حیوانی سطح سے بلند کرتی ہے۔ لباس انسان کی ذہنی ترقی کا مظہر ہے۔ اس کی مدد سے انسان نے اپنے تن کو نہ صرف ڈھانپنا سیکھا بلکہ موسمی تغیرات سے بھی محفوظ کیا۔ کپاس کی کاشت دراصل انسان کی اسی ضرورت کے پیش نظر دنیا کے ہر خطے میں ہو رہی ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی کپاس پیدا کرنے کی مہم دراصل ملک کے کروڑوں انسانوں کے لئے لباس مہیا کرنے کی مہم ہے۔ اور اسی لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔“

”بائی گاڈ۔ یہ باب تو بڑا ہی بزرگ کرنے والا ہے۔ کیونکہ میں یہی کہتا ہوں۔“

”اس میں ریشم اور ریشم کے کپڑوں کی کہانی بھی ہے۔“

”مائی گاڈ۔ اس میں کیا کیا ہے؟“

”اس میں بہت کچھ ہے۔ بڑی ہی عجیب باتیں۔ بڑی ہی نرالی باتیں۔“

”اس کی کوئی بڑی ہی نرالی بات بتائیں۔“

”سنیے۔“

”سنائیے۔“

”پودے کبھی آپس میں جنسی ملاپ کرتے ہیں۔“

”مائی گاڈ۔ یہ باب تو پودوں کے کوک شاستر کا باب ہو گا؟“

”جی نہیں۔ انسان کے سوا خدا کی کسی مخلوق کا خیال اس طرف نہیں گیا۔“

یہ باب خدا کی قدرت کے کرشموں کا باب ہے۔“

”قدرت کا کوئی کرشمہ سنائیے۔“ اس نے کہا۔

”سنائیے نہیں کیونکہ دکھائیے۔“ میں نے کہا۔

”میں اس وقت دیکھ نہیں رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے آپ سُن بھی نہیں رہے صرف سونگھ رہے ہیں۔ لیجئے

آپ کو پھولوں کی دنیا میں لے چلتے ہیں۔ جنس کے اعتبار سے پھول بھی دو

طرح کے ہوتے ہیں۔ نر اور مادہ۔ دنیا میں جس قدر پھل دیکھنے میں آتے ہیں

نر و مادہ پھولوں کے جنسی ملاپ ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ نر و عی سائنس

پھولوں کے اس جنسی ملاپ کو پالی نیشن یا عمل زیرگی کہتے ہیں۔ اور وہ مادہ پولن کہلاتا ہے جس کی بدولت نر مادہ پھول جنسی ملاپ کے بعد بار آور ہوتے ہیں۔“

”پولن کیا چیز؟“ پبلشر نے پوچھا۔

”زیرہ گل۔ زردانہ۔ یہ سفید رنگ کا چمکدار اور ملائم مخملی سفوف سا ہوتا ہے۔ سنبھل کی مانند۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر پودے میں نر مادہ پھول موجود ہوں۔ بعض پودوں میں صرف نر پھول موجود ہوتے ہیں اور بعض میں مادہ پھول۔ اس کے علاوہ پودوں کی کئی اقسام ایسی بھی ہیں جن میں نر مادہ پھول بالکل قریب قریب ایک ہی شاخ پر موجود ہوتے ہیں یا ایسی صورت میں ایسے پھولوں کو عمل زیرگی کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔“

”پھولوں میں جنسی ملاپ کیسے ہوتا ہے؟“

”پھولوں میں اس فطری فعل کی تکمیل کے لئے قدرت نے یہ کام ہوا کے جھونکوں، شہد کی مکھیوں اور دوسرے کیڑے مکوڑوں کے سپرد کر دیا ہے۔ جو مختلف طریقوں سے اس کام کو سرانجام دیتے ہیں۔ خاص کر شہد کی مکھی تو اس کام میں بڑا ہی اہم کردار ادا کرتی ہے۔“

”کیا کرتی ہے شہد کی مکھی؟“ اس نے پوچھا۔

”شہد کی مکھی پھولوں سے نہ صرف شہد اکٹھا کرتی ہے بلکہ اپنی ٹانگوں اور جسم کے بالوں پر پھولوں کے نر حصے سے زردانہ یعنی پولن لے کر مادہ پھولوں کو زرخیز کرتی ہے۔ مکھی کے جسم کے مختلف حصوں پر جمع شدہ

پولن مکھی کی نقل و حرکت سے کچھ کچھ پھولوں کے مادہ حصوں پر گر جاتا ہے۔
اور اس طرح کئی پودوں میں جنسی ملاپ کی تکمیل ہو جاتی ہے۔
”پودوں کے متعلق آپ نے اس کہانی میں کیا کچھ لکھا ہے؟“ اس نے
پوچھا۔

”بہت کچھ لکھا ہے۔ کیونکہ پودے اور انسان میں بہت محوڑا فرق ہے۔“
”مائی گاڈ۔ بڑا محوڑا فرق۔“

”جی ہاں۔ پودہ بھی ہماری طرح ایک زندہ چیز ہے۔ زندہ رہنے
کے لئے اسے بھی ہماری طرح روشنی، ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہے۔
اس کی خوراک میں وہی کیمیائی اجزاء پائے جاتے ہیں جو ہماری خوراک میں۔
جن کے نہ ہونے سے پودہ بھی ہماری طرح بیمار ہو جاتا ہے۔ اور وہ
بیماری اس کی موت کا باعث بن سکتی ہے۔ پودے کا سوکھ جانا اس کی
موت ہے۔“

”مائی گاڈ۔ پودوں کو بیماریاں بھی ہوتی ہیں؟“

”جی ہاں۔ غذائی کمی، نامناسب اور ناموافق ماحول کی وجہ سے پودے
بھی ہماری طرح کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر
اگر ہمیں ہماری غذا میں پیروٹین، فیٹس، کاربوہائیڈریٹس نہ ملیں۔ تازہ ہوا
اور روشنی میسر نہ آئے تو ہمیں دق ہو جائے۔ ایسے ہی یہ چیزیں نہ ملنے سے
پودے سوکھ جاتے ہیں جیسے انسان دق سے سوکھ جاتے ہیں۔“
”بائی گاڈ۔ یہ تو ایک قیامت خیز غیب معلوم ہوتی ہے۔“

”یہ حقیقت ہے ہمارے اور ایک پودے کے جسم کی کیمیائی ساخت میں کچھ فرق نہیں۔ انسان اور پودے کا جسم مختلف قسم کے مادوں سے مل کر بنا ہے جو کہ عناصر کہلاتے ہیں۔ اگر پودے کو جلا کر اس کا کیمیائی تجزیہ کیا جائے تو اس کی راکھ میں موجود مادہ سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ ان میں کون کون سے عناصر موجود ہیں۔ عناصر ان مادوں کو کہتے ہیں جو بالکل مفرد ہوں اور ان کا تجزیہ نہ کیا جاسکے۔ جیسے کسی زبان میں ہزار ہا الفاظ ہوتے ہیں جو کہ چند حروفِ تہجی سے مل کر ترکیب پاتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان ایک پودے میں مختلف قسم کے کئی کیمیائی مادے ہیں جو کہ عناصر کے مختلف طریقوں پر یکجا ہونے کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے جسم میں انہی عناصر کا حصہ ہے۔ جو ہوا سمندر، مٹی، چٹانوں اور درختوں وغیرہ میں عام طور پر پائے جاتے ہیں ان عناصر میں کاربن، ہائیڈروجن، آکسیجن، گندھک، فاسفورس، سوڈیم، پوٹاشیم، کیلشیم، میگنیشیم، فولاد، کلورین اور ان کے علاوہ باقی جس قدر عناصر موجود ہیں وہ کیمیائی مرکبات کی صورت میں ہی پائے جاتے ہیں۔“

”انسان کی طرح کیا پودے کے بھی اعضا ہوتے ہیں؟“

”جی بالکل۔ وہ اعضا پودے کی زندگی میں وہی کام کرتے ہیں جو ہمارے جسم کے مختلف حصے ہماری زندگی میں مختلف کام کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے پودے کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔“

”مثلاً“

”جڑیں — تنا — شاخیں — پتے۔“

”انسان کی ابتدا تو ایک جرم سے ہوتی ہے۔“

”اور پودے کی ابتدا بھی ایک جرم سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ جرم نوعیت کے اعتبار سے حیوانات و نباتات میں بالکل مختلف شکل میں ہوتا ہے۔

پودے کی نوع میں یہ جرم بیج، قلم، گولی یا دابہ کہلاتا ہے۔“

لابائی گاڑ۔ کیلشیم نہ ملنے سے انسان کی ہڈیوں کی نشوونما پر بُرا اثر

پڑتا ہے۔ کیا پودوں میں بھی یہ کیمیائی تاثر موجود ہے؟

”موجود ہے۔ جیسے انسان کو نشوونما اور صحت کو برقرار رکھنے کے

لئے متوازن غذا کی ضرورت ہے۔ اسی طرح پودوں پر بھی غیر متوازن غذا کا

ان کی نشوونما پر بُرا اثر پڑتا ہے۔“

”انسان سوتا ہے کیا پودا بھی سوتا ہے؟“

”ہاں۔ ہماری طرح پودے بھی سوتے ہیں۔ ہر پودہ ہر سال کچھ

عرصہ کے لئے سوئی ہوئی حالت میں چلا جاتا ہے۔ سوئی ہوئی حالت سے

مراد وہ حالت ہے جن میں ان کے پتے جھڑنے لگتے ہیں۔ پودوں کی اس

حالت کا اندازہ پت جھڑنے کے موسم میں لگایا جاسکتا ہے۔ عام طور پر پودوں

کی سوئی ہوئی حالت سردیوں کے ایام میں یکم دسمبر سے پندرہ فروری تک ہوا

کرتی ہے۔ اور پھر پودے نیند سے بیدار ہوتے ہیں۔ اس وقت نئے

شکوفے، نئی کونپلیں اور پھول نکلتے ہیں۔“

”یہ کونسا مسودہ ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”یہ ہے میرا ناول بیمار بستیاں۔“

”بائی گاڈ۔ کیا بیماری ہے ان بستیوں کو؟“
”لہو کھتو کتے اور کھانسنے کی بیماری۔ ان بستیوں میں انسان نہیں سوکھے
ہوئے پودے بستے ہیں۔ جن کو نہ متوازن غذا میسر آتی ہے نہ تازہ ہوا اور
نہ روشنی۔“

”بائی گاڈ۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے آپ اب کیا لکھنے لگے ہیں۔“
”میری جو مجھے اب لکھنا ہی چاہئے۔ قلم کار اپنے معاشرے اور ماحول
کی عکاسی کرتا ہے۔ میں جس معاشرے اور ماحول میں سانس لے رہا ہوں۔ وہاں
پندرہ لاکھ انسانوں کے سانس کو دیمک لگی ہوئی ہے۔ بستیاں بیمار ہیں۔ لہو
کھتو ک رہی ہیں۔ کھانسنے لگی ہیں۔ لہو اور کھانسنے میری ان کہانیوں کو دراشت میں
لی ہے۔ کیونکہ انھوں نے ان بیمار بستیوں اور لہو کھتو کتے انسانوں ہی سے
جنم لیا ہے۔ یہ بستیاں بھی ٹنڈ منڈ پیڑوں کی طرح نہ جانے کب سے سو رہی ہیں۔
ان بستیوں میں سدا پت جھڑکی رت ہی رہتی ہے۔ جس کی خشک ہواؤں میں
خشک پتے۔ سوکھے ہوئے زرد پتے۔ لہو کھتو کتے کھانسنے انسان کھانستے
اور کھڑکتے ہوئے پتے سسک رہے ہیں۔ دم توڑ رہے ہیں۔ چمن والو اہتمام
بہار کر دے۔ ایسا نہ ہو یہ خزاں اس چمن میں کوئی پھول ہی نہ کھلنے دے۔“

”بائی گاڈ۔ یہ اینڈی بینڈی کہانیاں نہیں چلیں گی۔ آپ عشقیہ ناول خوب
لکھتے ہیں۔ اپنے رنگ میں کوئی ناول لکھ کر دیکھیے۔ اچھا خدا حافظ۔“
یہ کہتے ہی میرا پیشربندق کو کچھ اس انداز سے سنبھالتے ہوئے اٹھا کہ میں نے
سمجھا فائر کرنے لگا ہے۔ مگر وہ فرار ہو گیا۔ اور میں مایوس و ناکام واپس لوٹا۔

مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔ اور پیسے عشقیہ کہانی لکھنے ہی سے مل سکتے تھے۔ مگر میرا تو عشق بھی اس وقت لہو تھوک رہا تھا۔ کھانس رہا تھا۔ میری محبت کا لہو دق کے برائیم پی رہے تھے۔ میں گھر آیا تو نجمہ وہاں موجود نہ تھی۔ میری غیر موجودگی میں اس کی ماں آئی اور روحانی علاج کے لئے گوندی پیر کے تکیے میں لے گئی۔ وہاں اس نے چونکی دی۔ میرا نہیں ساز بجاتی رہیں۔ نجمہ حال کھیلتی رہی۔ اور اس تکیے کا عامل روحانی سمندر سائیں نہ جانے کیا کچھ پڑھ پڑھ کر نجمہ کو جھارتا پھونکتا رہا۔ اور گھر آتے ہی نجمہ کو لہو کی تھوک کے ساتھ گوشت کی بوٹیاں خارج ہونے لگیں۔ وہ اپنی اس حرکت پر سخت نادم تھی۔ دل کے دورے تیز ہو گئے تھے۔ ایک ایک اس پر غشی طاری ہو گئی۔ میں بھاگ کر ایک ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے کارائین کا انجکشن کیا۔ جس کے رد عمل سے آدھے گھنٹے کے بعد نجمہ کو ہوش آیا۔ اسی اثنا میں اس کی ماں بھی آگئی۔ میرا بڑا لڑکا پر دینے اپنی ماں کی حالت خراب دیکھ کر جلدی سے اُسے بلا لایا تھا۔ مگر نجمہ نے اُسے سیڑھیوں ہی سے واپس کر دیا۔ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

”چلی جاؤ۔ بڑھیا چلی جاؤ۔ تم ماں نہیں ہو ڈائن ہو۔“

وہ اپنی ماں سے بدظن ہو چکی تھی۔ جھوٹ کے ڈھول کا پول کھل چکا تھا۔ اس کی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ اور ایسی گئی کہ پھر کبھی نہ آئی۔ اور نجمہ کئی روز تک اپنی حماقت پر پچھتی رہی۔ مگر اب پچھتानے سے کیا فائدہ تھا۔ اس کی حالت تشویشناک حد تک خراب ہو چکی تھی۔ بڑی مشکل کا سامنا تھا۔ جہاں سے رقم آنے کی امید تھی وہ بات تو بنتے بنتے بگڑ چکی تھی۔ میرے نادل کا سودا نہ ہو سکا تھا۔

ایڈی ڈاکٹر فردوس کا بل بھی اس مہینے میں کافی بوجھل ہو گیا تھا۔ جس کی ادائیگی کا مجھے بڑا فکر لگا ہوا تھا۔ وہ دو تین بار اپنی رقم کا مطالبہ کر چکی تھی۔ اس سے آگے وہ ہتھار کرنے کو تیار نہ تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ بل کی عدم ادائیگی کی صورت میں ہجیمہ کا علاج کرنے کو تیار نہ تھی۔ میری زندگی کا ہر سانس معما بنتا جا رہا تھا جس کا صحیح حل تلاش کرنے کے لئے میں مسلسل سوچ رہا تھا۔ مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس پریشانی میں مجھے اپنے ایک دوست کا سہارا لینا پڑا۔ اس نے میری مالی امداد بھی کی اور مجھے مشورہ بھی دیا۔ کہنے لگا۔

”اپنی بیوی کو فوراً کسی ہسپتال میں داخل کرادو۔ تاخیر اور لا پرواہی اس کے حق میں اچھی نہیں۔“

میرے دوست نے مجھے بڑا مفید مشورہ دیا تھا۔ مگر مشکل تو یہ تھی کہ ہجیمہ وبائی ہسپتال میں داخل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسے مرجانا منظور تھا لیکن اس ہسپتال میں داخل ہونا منظور نہ تھا۔ میں نے اسے داخل ہو جانے پر مجبور کیا تو کہنے لگی۔

”وہ ہسپتال آسیب زدہ ہے۔ وہاں ہر چیز پر موت کے سائے

منڈلا رہے ہیں۔ میری سہیلی گوری نے اسی ہسپتال میں دم دیا تھا۔

آسیبی سائے چند ہی دنوں میں اس کا سانس پی گئے تھے جب اپنے

گھر سے گئی تھی اتنی بری حالت تو نہ تھی اس کی۔ ایک ہفتہ بھی نہ کاٹ سکی

بیچاری۔ بری طرح گھنچھوڑ دی گئی۔ پنچوڑ دی گئی۔ اس ہسپتال کے

آسیب اس کا جاگڑ چبا گئے۔ پانی کی ایک بوند بھی اس کے پیٹ میں

بھاری معلوم ہونے لگی۔ ہماری ہمسائی موسیٰ رحموں اس کی خبر لینے گئی تو

گوری دونوں ہاتھ جوڑ کر زار زار رونے لگی۔ بولی۔ موسیٰ اپنے میاں سے کتنا میرے باپ سے کہے وہ مجھے یہاں سے لے جائے نہیں تو میں مرجاؤں گی۔ یہاں آکر تو میں اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہو گئی ہوں۔ اور دوسرے ہی دن وہ مر گئی۔ مایوس محبت لڑکی مر گئی۔ سلیم بابو تم نے اگر مجھے وہاں داخل کر دیا تو میں بھی مرجاؤں گی۔“

پرائیویٹ ڈاکٹروں سے اپنی بیٹی کا علاج کرانے کی ہمت نہ تھی بندوگوانے میں۔ بڑی مشکل سے، بڑے جتن کر کے اس نے اپنی بیٹی کو دوبائی ہسپتال میں داخل کرایا تو وہ آٹھویں دن مر گئی۔ نجمہ اس ہسپتال سے بڑی خائف تھی۔

ہماری پڑوسن۔ فقیر و نانوائی کی بیوی موسیٰ رحیموں جو کہ جگت موسیٰ ہے۔ جسے بستی کے بڑے چھوٹے موسیٰ ہی کہتے ہیں، گوری کی خبر لیکر آئی تو اس نے نہ صرف ہسپتال کے انتظامیہ عملے کے بارے میں بلکہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے متعلق بھی ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ نجمہ پر خوف و دہشت کا طاری ہو جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن میرے لئے یقیناً ایک عجیب الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ جسے سلجھانے کے لئے میں نے اپنے چند بہت ہی قریبی رشتہ داروں سے رجوع کیا۔ مگر وہ قریب ہوتے ہوئے بھی مجھے بہت دور نظر آئے۔ وہ میری الجھن میں الجھنے کو تیار نہ تھے۔ مصیبت میں اپنے بھی پرائے ہو گئے تھے۔

میں سوچوں کی صلیب پر کھچا ہوا تھا۔ سوچوں کی سنگینیں مجھے چھب رہی تھیں۔ سوچوں کی میخیں مجھے چھید رہی تھیں۔ مجھے مصلوب کیا جا رہا تھا۔ صرف ایک لڑکی سے محبت کرنے کے جرم میں مجھے مصلوب کیا جا رہا تھا۔ اور ابن مریم کو

بھی مصلوب کیا گیا تھا۔ اس کے مقدس قدموں کو چومنے والے بھی مصیبت میں
اُسے چھوڑ گئے تھے۔ اس کے پاکیزہ ہاتھوں کا بوسہ نہیں لیا گیا تھا شناخت کی
ہر لگائی گئی تھی کہ وہ آسانی سے پہچانا جائے۔ پکڑا جائے۔ مصلوب کر دیا جائے۔
زندگی کے کسی کھٹن مرحلے میں جب قدم قدم پر صلیبیں گر جاتی ہیں تلواریں
تن جاتی ہیں۔ نیزے ابھرنے لگتے ہیں تو کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ اپنے بھی بیگانے
ہو جاتے ہیں۔ اس وقت مصلوب ہونے والے کو ایک طوفان کی ضرورت
ہوتی ہے۔ اس طوفان کو بلا نے کے لئے اپنے اندر آواز دی جائے یا آسمان
کو پکارا جائے۔ طوفان آتا ہے۔ ضرور آتا ہے۔ بادل کڑکنے لگتے ہیں۔ بجلیاں
کوندتی ہیں۔ زمین لرزنے لگتی ہے۔ آندھیاں آتی ہیں۔ دہماکے ہوتے ہیں۔
میں نے اس طوفان کو بلا نے کے لئے اپنے اندر آواز دی۔ آسمان کو نہیں پکارا
تھا۔ میں ابن مریم نہیں تھا۔ بڑے زور کا ایک دہماکہ ہوا جسے صاری کائنات
میں صرف میں نے سنا۔ بڑے زور کا ایک دہماکہ۔ پھر بڑی مہیب سی گونج
سنائی دی اور طوفان آگیا۔ میرے اندر ایک طوفان چلنے لگا۔ جس کے سائے
بخمہ انگلیٹھی میں دیکھتے کوٹلوں کی شفق میں میرے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ
خاموش رہی۔ میں بھی خاموش رہا۔ وہ چپ چاپ ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتی رہی۔
میں چپ چاپ ٹکٹکی لگائے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں اترتے ہوئے
صحیفوں کو پڑھتا رہا۔ خدا۔ محبت اور اس کی عظمت کے اسرار مجھ پر منکشف
ہوتے چلے گئے۔ ان الوہی لمحوں کے سحر نے ہر چیز کو مسحور کر لیا تھا۔ میرے
اندر اٹھتے ہوئے طوفان میں بھی مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ نہیں ہو رہا۔

جیسے پوری کائنات دہما کے کے بعد سو گئی ہو۔ نہ کوئی چیز زمین سے آسمان کو جا رہی تھی۔ اور نہ کوئی چیز آسمان سے زمین پر آرہی تھی۔ جو چیز جہاں جہاں تھی جا مد و ساکت ہو کر رہ گئی۔ وقت ایک بھٹما ہوا دریا معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں گھڑی، پل، لمحہ، دن، سال اور صدیوں کی کوئی لہر کوئی بھنور نہیں اٹھ رہا تھا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم بنجہ کی آنکھوں میں اترتے ہوئے محبت کے تحفیوں کی تلاوت کرنے لگا۔ پریم وید کے منتر دن کا پاٹھ کرنے لگا۔ دو چہروں اور چار آنکھوں کے درمیان انگلیٹھی میں دہکتے ہوئے کوٹلوں کی شفق کئی بار پھولی کئی بار کجلائی اور پھر بجھ گئی۔ وہ الوہی لمحے گزر گئے۔ وہ طلسم۔ وہ سحر ٹوٹ گیا۔

”کیا سوچ رہے ہو سلیم بابو؟“ بنجہ نے گہری خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”بچی میں اس وقت بہت کچھ سوچ رہا ہوں۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”سوچوں کا ایک طوفان اٹھ رہا ہے میرے اندر۔“

”چھوڑو ان سوچوں کو۔ اتنا سوچنے سے کیا ہوگا۔ اب سو جاؤ۔ صبح سے شام تک بڑے کام کرتے ہو۔ میرے کام۔ اپنے کام۔ بچوں کے کام۔ تم کام کرتے کرتے تھک جاتے ہو بابو۔“ بنجہ نے کہا۔

”جب تک میرے پاس تمہاری محبت ہے میں تھک نہیں سکتا شکست نہیں کھا سکتا ان سوچوں سے۔ ان کاموں سے۔ میں نے ان کو جیت لیا ہے۔ میں نے ان چٹانوں میں ایک راستہ نکالا ہے۔ تمہارے لئے میں نے ایک راستہ نکالا ہے بنجی۔“ میں نے کہا۔

”کیا راستہ نکالا ہے سلیم بابو؟“ نجمہ سوٹی سوٹی آواز میں بولی۔
”تمہیں بڑے ہسپتال میں داخل ہو جانا چاہئے۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس مرض کے ماہرین وہاں دن رات کام کر رہے ہیں۔ بڑا اچھا سٹاف ہے بڑا اچھا علاج کیا جاتا ہے۔ مریضوں کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی جاتی۔ کسی قسم کی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی۔ خدا نے چاہا تو دونوں میں تم شفایاب ہو جاؤ گی۔“

”خدا۔“ نجمہ نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔

”خدا صرف زندہ رہنے اور سانس لیتے میں ہے۔ اور شاید اس میں بھی

نہیں۔ کہیں بھی نہیں۔“

”نہیں نجمی نہیں۔ خدا ہر جگہ ہے۔ ہر چیز میں ہے۔ اور اسے ہونا ہی چاہئے۔ وہ اگر نہ ہو گا تو پھر مہمارا کیا ہو گا؟ ہم کدھر جائیں گے؟ ہم کے پکاریں گے؟ اتنا مایوس نہ ہو جاؤ نجمی۔ تمہیں ملتی مل کر رہے گی۔ پندرہ لاکھ لہو کھوکتے کھانستے انسانوں کو زندہ مل کر ہی رہے گا۔ میرے گیان دھیانی کا گوتم دن رات سما دھی لگائے، عبادت، ریاضت، تپسیا کر رہا ہے۔ پندرہ لاکھ انسانوں کو لگے ہوئے گرہن کو، ان کھلاتے داغوں کو مٹا ہی ہو گا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم زندگی کے اس کو روکشر میں، پندرہ لاکھ لہو کھوکتے کھانستے انسانوں کی مہا بھارت کے اس بیڑھ میں، اس مہم میں اگر کامیاب نہ ہو سکا تو خود کشی کرے گا۔ مگر تم بھی اس مہم میں اس کی مدد کرو۔“

”میں بھلا کیا مدد کر سکتی ہوں؟“ نجمہ نے ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

”میں کیا کر سکوں گی؟ مجھ سے کیا ہو سکے گا؟“
”بس تم میری ماما اور ہسپتال میں داخل ہو جاؤ۔“
”مگر میں نے تو لیڈی ڈاکٹر فردوس سے سنا تھا کہ بڑے ہسپتال میں داخلہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ میں تمہیں اور زیادہ مشکلوں میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ تمہیں اور زیادہ پریشان ہونا پڑے گا سلیم بابو۔ یہ سب کچھ کیسے کر دے گا؟“

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں کچھ نہیں کر دوں گا۔ تمہاری محبت کا میرا ساندہ اٹھتا ہوا طوفان ہی سب کچھ کرے گا۔ اب کچھ ہو کر رہے گا۔ اب کچھ ہو ہی جانا چاہیے۔ میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان میں لہو کھوکتی کھانسی صلیبیں ملنے لگی ہیں۔ آسمان سے روشنی کے بادل نیچے اتر رہے ہیں۔ بچا میں بیشمار پردوں کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پندرہ لاکھ کھانسی لہو کھوکتی لاشوں میں اپنا مقدس سانس بھونک کر انہیں زندہ کرنے والا مسیحا شاید آسمانوں سے آ رہا ہے۔“

ہسپتال کا نام سن کر ڈر سے پسینے پسینے ہو جانے والی نجمہ رضامند ہو گئی۔ شاید اُس نے بھی آسمان سے دھرتی پر اترتی ہوئی الو ہی آوازیں سن لی تھیں۔ اُسے شاید مکتی وزدان مل جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ وہ لیٹ گئی۔ لحاف کو اپنے جسم پر پھیلایا۔ اور کھوٹری ہی دیر میں سو گئی۔ نیند اس کے لئے بہت ضروری

تھی۔ بہت اچھی تھی۔ کچھلی دو راتیں اس نے جاگ کر گزاری تھیں۔
میں چپکے سے اٹھا اور اس چارپائی کے پاس آگیا۔ جس پر میرے بچے
میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان سے بے خبر سو رہے تھے۔ میں خاموش
کھڑا کافی دیر تک لحاف سے باہر نکلے ہوئے تین معصوم چہروں کو دیکھتا رہا۔
جن میں نیند کی میٹھی لوریاں سپینوں کے کئی رنگ گھول رہی تھیں۔ ان کے ننھے
ننھے خراٹوں کے ساتھ ساتھ ان رنگوں کی ایک دھنک بچہ جاتی تھی تو فوراً ہی
دوسری دھنک کھل جاتی تھی۔ سپینوں کے رنگ ان کی نیند میں آنکھ مچولی کھیل
رہے تھے۔ کتنے دلچسپ تھے ان رنگوں کے کھیل۔ کتنی دلفریب تھی ان رنگوں
کی دنیا۔ مگر اس کی سیر کرنے کی مجھے فرصت کہاں تھی۔ میں نجمہ کے چہرے پر
کھنڈے ہوئے پیلے پیلے، بجھے بجھے سرسرااتے سیوں کے رخ سناٹوں
میں آنے والی صبح کے داغ داغ اجالوں کی طرف تیز تیز چلا جا رہا تھا میرے
اندراٹھتے ہوئے طوفان کے ریلے مجھے آگے ہی آگے دھکیلتے جا رہے تھے۔
وہ رات بھی گزر گئی۔ سنگ سنگ کے کچھ گئی۔

صبح ہوئی۔ تیز و تند ہواؤں کا جھکڑ سا چل رہا تھا۔ ہر طرف گرد و غبار اڑ
رہا تھا۔ جس سے ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ میں نے کیروسین آئیل سٹو
جلایا۔ جلدی جلدی پانی گرم کیا۔ اتنے میں بچے بھی جاگ گئے۔ میں نے پہلے
نجمہ کا منہ ہاتھ دھلایا۔ اس کے کپڑے بدلے۔ پھر گڈو اور کامران کا منہ ہاتھ
صاف کر کے ان کے میلے کپڑے اتار کر انہیں صاف سمفٹے کپڑے پہنائے۔
پہرہ دیزان بچوں سے دو سال بڑا ہے۔ وہ بستر سے اٹھتے ہی صابن دانی

اور تولیہ اٹھائے غسل خانے میں جا چکا تھا۔ وہ باتھ روم سنگمر ہے۔
بھی اپنی عادت کے مطابق وہ ادنیٰ آواز میں گاتے ہوئے مناجات پڑھ رہا تھا۔

سُن اے عرش بریں کے رہنے والے اپنی رحمت سے
مجھے حوروں کی عصمت دے ستاروں کی بلندی سے

حوروں کی عصمت۔ ستاروں کی بلندی۔ میں چائے جلدی جلدی تیار کرتے
ہوئے سوچ رہا تھا۔ پردیزہ عرش بریں کے رہنے والے سے کتنی عجیب چیزیں
مانگ رہا ہے۔ مگر گڈو چائے مانگ رہی تھی۔ کامران پرانٹھا مانگ رہا تھا۔ جب
سے بچہ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تھی کامران کو ناشتے کے لئے پرانٹھا نہیں
مل رہا تھا۔ مکھن یا گھی میں تلے ہوئے تو س اُسے پسند نہ تھے۔ وہ الماری
سے باسی روٹی اٹھا لایا۔ وہ چاہتا تھا مکھن لگا کر روٹی کو سینک دیا جائے۔
لہذا میں نے بچہ کے لئے انڈہ فراٹی کرنے کے بعد مکھن لگا کر روٹی سینک
دی۔ کامران بڑا خوش ہوا۔ ”اٹھا جی پرانٹھا“ کا شور مچاتے ہوئے تھفانی میں
وہ صواں چھوڑتی روٹی کو کھپونکیں مارنے لگا۔ اتنے میں پردیزہ بھی فارغ ہو کر آگیا۔
ہم سب ناشتہ کرنے بیٹھ گئے۔ اسی دوران میں میں نے پردیزہ سے کہا۔
”آج تم اسکول نہیں جاؤ گے۔ گھر کا خیال رکھو گے۔ میں تمہاری امی

کو داخل کرانے ہسپتال لے جا رہا ہوں۔“

”اب جو میں نے ناغہ کیا تو ماسٹر مارے گا۔ چھٹی کی عرضی لکھ دیں۔“

میں بھاگ کر دے آتا ہوں۔“ پردیزہ نے کہا۔

”تم فکر نہ کرو۔ کل میں تمہارے ساتھ سکول چلوں گا۔ ماسٹر سے کہہ

دوں گا۔ عرضی لکھنے کا اب وقت نہیں ہے۔ ہمیں نوبہجے ہسپتال پہنچنا ہے۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے گھڑی دیکھی تو نوبہجنے میں پچیس منٹ باقی تھے۔ اور ہمیں ٹھیک نوبہجے ہسپتال پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں جلدی سے تانگہ لے آیا۔ پرویزہ اور کامران کو ان کی اندھی دادی کے پاس گھر پر ہی چھوڑا۔ گڈو کو ساتھ لے لیا۔ پرویزہ اور کامران نے بھی ساتھ چلنے کے لئے ہنگامہ کیا۔ میں نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ بخمہ نے اپنے بیٹوں کی حمایت کی۔ کہنے لگی۔

”تو پھر گڈو کو بھی یہیں رہنے دو۔ اس کا ہمارے ساتھ جانا کیا ضروری ہے۔“

ضروری تو نہ تھا مگر میرا دل کہتا تھا گڈو اپنی ماں کے ساتھ چلے۔ اس کے چہرے پر سہمی سہمی معصومیت میرے دل سے لپٹ لپٹ کر کہہ رہی تھی۔ ابا مجھے میری امی کے ساتھ لے چلئے۔ مجھے میری امی کے ساتھ رہنے دیجئے۔ آپ کو معلوم ہے مجھے اپنی امی کے ساتھ کتنا پیار ہے۔ کون جانے کیا ہونے والا ہے؟ کیا ہو جائے گا؟ یہ وقت پھر نہیں آئے گا ابا جانی۔

میں نے بخمہ کو کوئی جواب نہ دیا۔ گڈو کو اس کے پاس ہی کھپلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ تانگہ ہسپتال کو روانہ ہوا۔ گھوڑی دود تک راستہ بڑا خراب تھا۔ کہیں گڑھے، کہیں چھوٹی بڑی نالیاں، کیچڑ، موڑ۔ کوچبان گھوڑے کو قدم قدم چلاتے ہوئے یہ راستہ طے کرنے لگا۔ عقب کی ایک گلی سے ایک چرواہا

چھکڑا کھینچے چلا آ رہا تھا۔ وہ اس بستی کو چھوڑ کر ایسی ہی کسی اور بستی کی طرف اپنے گھر کا سامان لئے جا رہا تھا۔ ایک اندھیرے سے نکل کر دوسرے اندھیرے میں۔ زندگی کے ایک دیرانے سے دوسرے دیرانے تک۔ ان کی ساری عمر زندگی کے اس سائیریا میں بھٹکتے ہی گزر جاتی ہے۔ نگرہ نگرہ۔ ڈگر ڈگر۔ بھٹکتے رہیں گے بھٹکتے چلے جائیں گے ان کی قسمت میں یہی کالا پانی لکھا ہے۔ چھکڑا سامان سے کچھا کچھ بھرا تھا۔ چرواہا اسے بڑی مشکل سے پکینچ رہا تھا۔ ہانپ رہا تھا۔ بوجھ تلے کانپ رہا تھا۔ اپنے جسم کی بوٹی بوٹی کا زور لگانے سے اس کی گردن پھرے اور بازوؤں پر نیلی نیلی رگیں تن رہی تھیں۔ کنپٹیوں کی نیسیں پھڑک رہی تھیں۔ اس کی پنڈلیوں کی مچھلیاں باہر نکل آئی تھیں۔ سر سے لے کر اڑتی تک پسینے سے شرابور۔ نیز تیز چلتے ہوئے جھکڑ کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا بھی اس کے پسینہ اگلنے والے مساموں پر کچھ اثر ہو رہا تھا۔ گنجی کھوپڑی چپٹے تلوے۔ ننگے پاؤں ننگے سر۔ وہ کمر اور گردن جھکائے ہانپتے اور کانپتے ہوئے یوں چھکڑا پکینچ رہا تھا جیسے اس پر سامان نہیں اس بستی کے پچیس فیصد لوہو تھوکتے کھانستے ڈھانچوں کا بوجھ لدا ہو۔ جیسے وہ اس بستی کے سارے اندھیرے، ساری غلطیوں، سارے داغ، سارے جھونپڑے ڈھاسے اور ان میں لوہو تھوکتے کھانستے پنجر اپنے چھکڑے میں لا کر کسی ایسی ہی دوسری بستی میں منتقل کر رہا ہو۔ اور اکیلا۔ تنہا۔ ہانپتا کانپتا ہونکتا۔ یہ گھیاں، یہ سڑکیں، یہ ٹیڑھی ترچھی لکیریں اس کی زندگی کا گورکھ دھندا ہیں۔ جب تک سڑکوں کی اوپنچ پنچ باقی ہے۔ جب تک دنیا میں اتراٹی چڑھائی موجود ہے۔ اس کی پیچھے یہ بوجھ لدا ہی رہے گا۔ اس کی کمر جھکی ہی

رہے گی۔ اس کے سارے جسم پر پسینا بہتا ہی رہے گا۔ اور وہ مرل پل کی طرح اس بوجھ کو چپ چاپ کھینچے چلا جائے گا۔ ہانپتا، کانپتا، کبھی اوپر چڑھتا رہے گا کبھی نیچے اترتا رہے گا۔ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے، جھکڑا کھینچتے کھینچتے اس کے شانوں کا گوشت کوئی وقت آئے گا کہ سخت ہو کر سینگ بن جائے گا۔ وہ سینگ اس کے سینے میں چھپنے لگیں گے۔ اس کے پیپھڑوں کو زخمی کر دیں گے۔ اور پھر یہ لہو کھٹو کنے لگے گا۔ کھا نسنے لگے گا۔ اور زندگی کے سائیریا کے برفانی جھکڑ اور تند و تیز ہو جائیں گے۔ اندھیروں کی چٹانیں ابھرنے لگیں گی۔ اور کوئی چٹان اسے اپنے سینگوں پر اٹھا کر بہت اونچا لے جائے گی۔ ایک اور بہت بڑے اندھیرے میں۔ اور پھر ایک بہت بڑا لینڈ سلائیڈ ہوگا۔ اور اندھیرے کی چٹانیں ٹوٹ ٹوٹ کر جھونپڑوں پر گرنے لگیں گی۔ اور ہر شے ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ یہ کسی گہرے گڑھے میں چپ چاپ پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے مٹی کے ڈھیروں کو دیکھ رہا ہوگا۔ تانگے کے ٹکے، چکولے کھاتا ہوا میں اُس پرواہ ہے کے متعلق سوچتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اس وقت یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تانگہ اس بستی میں سے نہیں میرے خیالوں میں سے گزر رہا ہے۔ اور اس کے گھوڑے کے سموں کی آواز میں کوئی خواب دیکھتے ہوئے سُن رہا ہوں۔ اس گلی سے آگے نکل کر اب تانگہ بستی کے اُس حصے میں چلا جا رہا تھا۔ جہاں جلے ہوئے مکانوں کا ویران سلسلہ ہے۔ بغیر چھتوں اور بغیر دروازوں کے ڈھاروں میں مزدوروں نے اپنے گھر بنائے ہوئے ہیں۔ ان گھروں میں وہ اپنے پرانے لمبانوں، گھاس بھوس کے بستروں، مٹی اور ٹین کے برتنوں، پھٹے پرانے

میلے کچیلے کپڑوں، بوسیدہ جوتوں، ننگے بھوکے بچوں اور بیویوں کے ساتھ کمرے
بسر کرتے ہیں۔ ٹاٹ کے پردے۔ گھاس بھوس یاٹین کی رنگ آلود چادروں
کے جھولتے جھالتے چھپرے۔ کائی لگے مٹی کے مٹکے۔ مٹی کے گھرے۔ لوٹے۔
آنخورے۔ پیالے۔ رکابیاں۔ پیوند لگے بدبودار ٹھنڈے لحاف۔ ٹھنڈے
چولہے۔ ٹھنڈی زندگی۔ گھٹن گھٹن۔ دھواں دھواں۔ مکھیوں کی بھنکار۔
بچوں کے چیخنے رونے کی آوازیں۔ دیووں میں تیل نہیں۔ مٹکوں میں پانی نہیں۔
خالی کنستری۔ خالی ہانڈیاں۔ خالی زندگی۔ مرد صبح کو اپنی عورتوں سے لڑ جھگڑ کر
مزدوری کرنے چلے جاتے ہیں۔ اور رات کو تھک ٹوٹ کر گھر لوٹ آتے
ہیں۔ اگر کوئی مزدوری مل گئی ہو تو چولہا گرم زندگی گرم اور اگر نہ ملی ہو تو پھر
لڑائی جھگڑا، گالی گلوچ، دھول دھپہ، دھینگا مستی شروع ہو جاتی ہے۔
ایک گھر۔ ایک جہنم۔ ایک کال کوٹھری۔ صبح و شام کی پھانسی کا ایک تختہ۔
ایک گلوٹین۔ صبح و شام جس سے کئی گز دینس کٹتی ہیں۔ ان آباد کھنڈروں کی شکستہ
دیواروں سے تیز و تند ہوائیں ٹکراتے ہوئے پھیر سانپ کی طرح بھنکارتی ہیں۔
جھولتے ہوئے چھپرے سرہاتے ہیں۔ کھنڈرات سے شاں شاں کی آوازیں
آتی ہیں۔ جیسے ہوائیں پیچتے ہوئے کہہ رہی ہوں۔ بھاگو۔ دوڑو۔ دیواریں
میں کرے کھرے ہوئے موت کے ان سایوں سے نکل جاؤ۔ جاگو۔ جاگو۔ میں
تمہیں ہمیشہ جگاتی رہوں گی۔ یہ پھٹے پرانے لحاف جلا دو۔ ان ڈھاروں کو ڈھان
دو۔ گندگی کے ان ڈھیروں سے باہر نکلو۔ میں تمہیں سونے نہ دوں گی۔ میں
تمہیں جگاتی رہوں گی۔ تمہاری نیندوں کو اپنی بھنکاروں سے ڈراتی رہوں گی۔

لیکن یہ لوگ ان ہواؤں کی آواز نہیں سنتے۔ جاگ کر پھر سو جاتے ہیں۔ مارتے پیٹتے ہوئے۔ گالیاں دے کر پھر سو جاتے ہیں۔ ان کے گھروں میں غنودگی طاری کرنے والی ایک عجیب سی بو پھیلی رہتی ہے۔ جیسے مردے کو ہلا کر اسے مشک کا نور لگایا جا رہا ہو۔ چھکڑے سے گرد و غبار اڑانے کی وجہ سے سورج کی روشنی پھیک پھیک معلوم ہو رہی تھی۔ ویسے دن کافی چڑھ چکا تھا۔ مگر ان ڈھاروں میں ابھی تک رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایک کنبہ۔ کئی کنبے۔ پھٹے ہوئے نحاف میں گھسا ہوا پورا خاندان، ان ڈھاروں میں بستے ہوئے گئی گھرانے ابھی تک نیند کے سناٹے میں تھے۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو ایک جگہ چند ڈھاروں میں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔ چند چولہوں میں آگ سلگ رہی تھی۔ کہیں ٹین کی زنگ آلود بالٹی میں پانی گرم ہو رہا تھا۔ کہیں ٹین کی چادر کو آگ پر رکھ کر توڑے کا کام لیا جا رہا تھا۔ روٹیاں پکائی جا رہی تھیں۔ کہیں بچوں بوڑھوں مردوں عورتوں کی ٹولی چولہے میں جھانک رہی تھیں۔ ہوئے شعلوں کی آپخ لے رہی تھی۔ کہیں آگ سدگانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر آگ نہیں سلگ رہی تھی۔ چولہے سے۔ ڈھار سے سے۔ دروازوں اور کھڑکیوں سے لٹکتے ہوئے ٹاٹ کے پردوں کے سوراخوں سے دھوئیں کے دائرے نکل رہے تھے۔ دائرے پھیل رہے تھے۔ دینگ رہے تھے۔ ہر جگہ دھواں ہی دھواں ہو رہا تھا۔ دھواں۔ کھانسی۔ لہو۔ موت۔ نیچے کی طرف جھکے ہوئے۔ مڑے ہوئے شکستہ مکانوں کے چھجوں کے سائے پھیک پھیک دھوپ میں لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ باہر دھول اڑ رہی تھی۔ بھر

زمینیں۔ دیران زمینیں۔ ہر طرف موت سی دیرانی۔ خاموشی۔
ان ڈھاروں سے آگے نکلے تو ایک جگہ مرغ ٹرائے جا رہے تھے۔ پالی
جھی ہوئی تھی۔ قہقہے۔ تالیاں۔ شور و شغب۔ تماشاٹیوں میں بڑے میاں
اور انیس خاں بھی کھڑے تھے۔ تانگہ قریب سے گزرا تو بڑے میاں نے
اپنی بیٹی کو پچھلی گدی پر سکرٹے سمٹے بیٹھے دیکھا۔ نجمہ نے سلام کیا۔ مگر انھوں نے
منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ تانگہ اب بڑی سڑک پر آگیا تھا۔ کوچبان نے چابک
لگا کر گھوڑے کو سرپٹ کر دیا۔ راستے میں کہیں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ ٹھیک
نوبے ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ ٹی بی بلاک کے پاس پہنچ کر میرے کہنے پر کوچبان
نے تانگہ روک لیا۔ گڈواپنی ماں کی پلاسٹک کی ٹوکری پکڑے بڑے غور سے
ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ میں نے پہلے اُسے نیچے اتارا اور پھر نجمہ کو گود میں
اٹھالیا۔ اس طرح اٹھائے جانے سے ہڈیوں کی پوٹ نجمہ کسی قسم کی تکلیف
محسوس نہ کرتی تھی۔ سامنے سے زرسوں کی ایک ٹولی آپس میں باتیں کرتی چلی آرہی تھی۔
پاؤں میں باٹا کے سفید بوٹ۔ سفید شلواریں۔ سفید اپرن۔ کوئی گوری کوئی کالی۔
کسی کے بال ہیلن کٹ، کسی کے قلو پیرہ کٹ۔ چہرے پر میکس فیکٹر کے کوس میٹک
شیڈ۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں ہالی وڈ کے کسی سٹڈیو میں ہوں۔ وہ
ہمیں دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئیں۔ اور
مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی ہیوی ویٹ بوکسرنے بیک وقت کئی مٹکے
میرے دل پر جما دیئے ہیں۔ جیسے میرے گیان دھیان کے گوتم کو دنیا کے
ہملک تریں زہر پوٹا شیم سائی نائیڈ کا انجکشن لگا کر پتھر کا بت بنا دیا گیا ہے۔

بڑی بے حجاب، بیباک اور بیہودہ تھیں وہ۔ ایک نے دوسری کی تنی ہوئی چھاتیوں کو چھیڑتے ہوئے بازاری لہجہ میں کہا۔ ”بے بی“ اور وہ سب پھر کھل کھلا کر ہنس پڑیں۔ میرا اور نجمہ کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ پھبتی کسی گئی تھی۔ میں نے نجمہ کو بے بی کی طرح جواٹھایا ہوا تھا۔

”کیا یہ پاگل ہو گئی ہیں۔ بے تحاشا ہنس رہی ہیں۔“ نجمہ نے مجھ سے کہا۔ مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ہمارے قریب سے گزریں تو یارڈ لے، کشن، کپڑے کے مختلف لونڈروں کی ٹہک سے ٹی بی بلاک کی کلوروفارم اور ڈی۔ ڈی۔ ٹی کی بو سے اونگھتی ہوئی فضائیں چونک گئیں۔ معلوم ہوتا تھا وہ کسی لونڈر پانڈ میں ڈبک کر نکلی ہیں۔ بڑے ہسپتال کی ٹیکنی کلر سینا سکوپ بکچریں۔ سلولائیڈ، بیکولائٹ اور پلاسٹک کی بنی ہوئی گوری کالی گڑیاں۔ جن کے ساتھ کھیلنے والے سامنے ٹمک شاپ کے دروازے میں آگئے تھے۔ کوئی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ کوئی ہاتھ میں پکڑے پھول کو سونگھ رہا تھا۔ کوئی ہوا میں رومال ہلاتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔ ان کے چہروں کے فریم میں ٹمکی ہوئی میکینکی آنکھیں ایکٹنگ کر رہی تھیں۔ ادھر سے بڑے ہسپتال کی چلتی پھرتی ٹمک شاپوں نے بھی ایکٹنگ شروع کر دی۔ ایک نے ایپرن کی جیب سے پورٹ ایبل شیشہ اور نائی لون کی کنگھی نکال کر بال درست کرنے شروع کر دیئے۔ دوسری نے ایپرن کی جیب سے رومال نکال لیا۔ تھرمامیٹروں اور سرنجوں کے علاوہ بڑے ہسپتال کی ان نرسوں کی جیب میں میک اپ کا سامان بھی تھا۔ برابر کی چوٹیں ہو رہی تھیں اور میرے ان دھیان کے گوتم کی چیخ نکل گئی۔ یہ چوٹیں اس کے سینے پر پڑ رہی تھیں۔

وہ ان ترسوں میں فلورنس ٹائٹ انگیل کو ڈھونڈتے لگا۔ فلورنس ٹائٹ انگیل۔
جس نے بیماروں کی تیمارداری میں اپنا سکہ چھین لٹا دیا تھا۔ جس نے زخمی انسانوں
کے زخموں پر اپنی ہلکیوں کے پھاہے رکھے تھے۔ کتنی عظیم ترین عورت تھی۔ مگر
یہ توفیق پر اپنی لپٹی ہوئی ٹائٹ کلبیں تھیں۔ کسی پہاڑ کی برف سے ڈھکی ہوئی
چوٹی۔ یارڈ لے، کولبری اور کشن کے سنیٹوں کی خوش مناشیاں۔ میرے گیان
دھیان کے گوتم نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ فلورنس ٹائٹ انگیل کی
ایسٹرکشن دیکھنے کو تیار نہ تھا۔ ایسٹرکٹ آرٹ کے یہ نمونے ہسپتال میں نہیں کسی
کیمرے اور ڈانس میں۔ کوئٹل پارٹی میں، کسی آرٹ گیلری میں سجائے جاسکتے ہیں۔
کوئڈر سے گزر کر میں نجمہ کو ٹی بی بلاک کے میڈیکل آفیسر کے کمرے کے
پاس لے آیا۔ لمبی سی پورچ میں پانچ چھ پنچ بچھے ہوئے تھے۔ جن پر مدقوق مریض
چپ چاپ بیٹھے تھے۔ عورتیں۔ مرد۔ بچے۔ ان کی نظروں سے معلوم
ہوتا تھا وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے نجمہ اور گڈ کو ایک پنچ پر بٹھا دیا۔
اسی اثنا میں میڈیکل آفیسر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اندر سے چہرہ اسی نکلا۔ میں نے
جلدی سے قریب ہو کر اس سے پوچھا۔

”دو ڈاکٹر صاحب اندر ہیں؟“

مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور وہ اپنی ٹوپی
جھاڑنے لگا۔ میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور وہ اپنی جیب شٹلنے لگا۔ میں نے
پھر وہی سوال کیا۔ اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور میرا بھی مستک
کاہر گیا۔ اس کے کندھے کو جھٹکاتے ہوئے میں نے پھر وہی سوال کیا۔ اور

اس نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے ابھی کھا ہی جائے گا۔ مگر اس کے دانت باہر نکلنے سے پہلے ہی کھٹے ہو گئے تھے اس نے میری آنکھوں میں بھی کچھ دیکھ لیا تھا۔

دو ڈاکٹر صاحب وارڈ کا دورہ کر رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ تک آئیں گے، وہ یوں بولا۔ جیسے بولنا تو نہیں چاہتا مگر مجبوراً بول رہا ہے۔ اس کی آواز میں بڑا روکھا پن، بڑی بیزاری، بڑی اجنبیت تھی۔

میں پلٹ کر تجربہ کے پاس ہی پنج پر بیٹھ گیا۔ پورچ کے دورویہ رکھے ہوئے گلموں میں کھلے ہوئے سرمائی کھوپڑیاں اداس اداس نظر آ رہے تھے۔ ٹی بی وارڈ کی دیواروں اور دروازوں پر فتر فتراتی ہوئی بجھی بجھی دھوپ بھی اداس اداس معلوم ہوتی تھی۔ بڑی کھڑکیوں پر لگی ہوئی جالیوں کے اندر دق کے مریض مختلف حالتوں میں نظر آ رہے تھے۔ کوئی کبیل تانے چار پائی پر لیٹا ہوا تھا مگر یوں جیسے وہ لیٹا ہوا نہیں پھانسی کے تختے پر لٹک رہا ہے۔ کسی کو دوائی پلائی جا رہی تھی مگر ایسے جیسے دوائی نہیں اُسے تیزاب پلایا جا رہا ہے۔ کوئی مریض کچھ کھا رہا تھا جیسے زہر کھا رہا ہو۔ کسی مریض کا بسترادر کپڑے بدلے جا رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے بعد وہ مریض اپنی جون بدل جائے گا۔

ادھر ادھر آتی جاتی تھیں بڑی مصروف نظر آ رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی بہت بڑا کام کر رہی ہیں۔ بڑے ہسپتال سے بھی بڑا کام۔ مگر وقت ان کے پاس بہت کھوٹا ہے۔ کوئی مریض دریچے کی جالی سے سر لگائے باہر کی دنیا کو حسرتناک

نظروں سے یوں جھانک رہا تھا۔ جیسے اس دنیا سے اس کا اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی اس میں نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے مگر اپنے آپ کو زندہ نہیں سمجھتا۔ اور اپنے ہر سانس کو ٹوٹتا ہے کہ آ رہا ہے یا نہیں۔ وہ سانس لے رہا ہے مگر اُسے یقین نہیں آتا کہ سانس لے رہا ہے۔ اتنے فاصلے سے میں نے جتنے بھی مدقوق مریض دیکھے ان میں کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی کرن بھی نظر نہ آئی۔

بظاہر ہر بڑی ہما بھی نظر آ رہی تھی وارڈ میں لیکن اس کی تہ میں ایک بکیراں نما موٹی ادھر ادھر جھانک رہی تھی۔ جیسے موت شجوں مارنے کے لئے ان دیواروں اور جالیوں میں کوئی راستہ دیکھ رہی ہو۔

”کیا آپ نے پرچی بنوائی ہے؟“ یہ ایک اور چڑا اسی کی آواز تھی۔ جو ڈاکٹر صاحب کے دروازے پر کھڑے ہوئے چڑا اسی سے مختلف معلوم ہو رہا تھا۔ وہ تو پتھر کا بنا ہوا تھا لیکن اس کی آواز کہہ رہی تھی یہ موسم کا بنا ہوا ہے۔ اور گھل رہا ہے۔

”کیسی پرچی؟“ میں نے پوچھا۔

”معائنہ کی پرچی۔“

”بھیا ایسی تو کوئی پرچی نہیں بنوائی میں نے۔“

”جلدی سے بنوائیے۔ اس کے بغیر تو ڈاکٹر صاحب کسی مریض کو نہیں

دیکھتے۔“

”وہ پرچی کہاں بنے گی؟“

”ادھر آؤ بالوجہ میں بتاتا ہوں“

میں اٹھ کر اس کے ساتھ چل دیا۔ اس کے بعد ایک دو تین کمروں سے گزر کر ہم ایک بڑے کمرے میں آ گئے۔ جس کے ایک کونے میں ایک نوجوان نسواری ٹوپیڈ کا سوٹ پہنے، بھڑک دار ٹٹائی میں تیر کی شکل کی سنہری پن لگائے بیٹھا تھا۔ وہ بشرے سے بڑا مکار، مغرور، ضدی اور سٹری معلوم ہوتا تھا۔ اس کی میز سے لے کر کمرے کے دروازے تک پرچیاں لینے والوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ وہ رہ رہ کر مریضوں کو ڈانٹ ڈپٹ رہا تھا۔ خشکی چھانٹ رہا تھا۔ قطار بناؤ۔ قطار میں آؤ۔ قطار میں جاؤ۔ قطار میں زندہ رہو۔ قطار میں کھڑے کھڑے سوکھ سوکھ کر مر جاؤ۔ میں بھی قطار کے سرے پر سب سے آخر میں کھڑا ہو گیا۔ قطار بڑی آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ کافی وقت گزرنے پر قطار میں ذرا سی جنبش پیدا ہوتی اور ایک دوسرے کے آگے پیچھے کھڑے ہوئے مرد عورتیں ایک قدم آگے اٹھا کر پھر رک جاتے۔ پھر بن جاتے۔ پرچیاں بنانے والے صاحب شاید ہر مریض کی بڑی چھان بین کر کے، تصدیق کر کے زندگی اور موت کے پاسپورٹ بنا رہے ہوتے۔ میں کھڑا کھڑا بور ہو گیا تو کھڑکی کی طرف رخ کر کے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ادھر زسوں کے کواڑ بٹھے۔ تین لڑکیاں جو اس وقت نرس کے لباس میں نہ تھیں ناشپاتی کے ننگی شاخوں والے درخت کے پاس کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ اتنے میں موٹا سا ایک خانساں تپائی پر چائے کا سامان چھننے لگا۔ ہوا ہولے ہولے چل رہی تھی۔ ناشپاتی کی ننگی ٹہنیاں بے معلوم سی جھجھول رہی تھیں۔ اُن میں سے ایک لڑکی جس نے

ساٹن کی ہلکی نیلی شلوار ہلکی نیلی قمیض اور گلے میں شنون کا ہلکا نیلا دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔
گود میں ہلکے نیلے رنگ کی ادن کا گولا لٹے سلاخیوں سے سوئیٹر بٹن رہی تھی۔
اس کے بھورے بالوں کی جھالیں گول گول شانوں کو چھو رہی تھیں۔ دوسری
لڑکی کا رنگ سرخ و سفید۔ قد لمبا، کتابی چہرہ، ستواں ناک، آنکھیں موٹی موٹی
اور خمور اور بال آبنوس کی طرح گہرے سیاہ جنہیں اس نے بڑے عجیب انداز
سے گوندھ کر گردن پر ایک بڑا ہی دلکش دائرہ سا بنایا ہوا تھا۔ یہ لڑکی سنہری
باروٹر کی سرخ رنگ کی ساڑھی میں ملبوس تھی اور آرام کرسی پر نیم دراز فلمی رسالے
پر کچھ اس انداز سے چہرہ جھکا ئے ہوئے تھی جیسے وہ اُسے پڑھ نہیں رہی
چائے کے ساتھ گھونٹ گھونٹ پی رہی ہے۔ زپ ان ایوری سب تیسری
لڑکی خوب موٹی تازی تھی۔ دھان پان۔ اس کا رنگ لیٹن چائے کی طرح تھا۔
اور اسی رنگ کا دوپٹہ، قمیض اور عزارہ اس کے رنگ کے ساتھ خوب میچ
کر رہا تھا۔ کالے کالے بالوں کی دولٹیں اس کے کندھوں سے ہوتی ہوئیں
چھاتیوں پر پڑ رہی تھیں۔ ماتھے پر بالوں کے دوپٹ اس نے سانپ کی گندلی
کی طرح بنا رکھے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر لپ شک کا سرخ شید دور
سے انار کی کلی کی طرح دمک رہا تھا۔ اور وہ اداس اداس نظروں سے کبھی کلائی
سے لپٹی ہوئی ننھی سی گھڑی کو دیکھ رہی تھی کبھی ناشپاتی کی ننگی ٹہنیوں کو۔ اتنے
میں غانسا ماں ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے ٹرے میں پیل لے آیا۔ ماتھے۔
کینو۔ موسمی۔ ہری چھال کے کیبے۔ سیب۔ گھریپ فروٹ۔ وٹامن اے۔
وٹامن بی۔ وٹامن ڈی۔ ملٹی وٹامن۔ زندہ رہنے کے لئے۔ صحت مندر بنے

کے لئے جیاتین نہایت ضروری ہیں۔ اور پھر لان کے اُس سرے پر ایک گاج
میں پیالو کی آواز سنائی دی۔ دھیمے دھیمے ہلکے ہلکے سروا کے ساتھ ساتھ بہتے
ہوئے نغمے۔ زمزمے۔ جیسے پھولوں کی نچھڑیاں اڑ رہی ہوں۔ کھڑکی میں
ایک اور کھڑکی کھلی۔ وہیں قطار میں کھڑے کھڑے میں نے گاج میں پیالو کی
آواز سے ہم آہنگ ہو کر ناچتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھا۔ ناشپاتی کے پیڑ کے
اُس پار زندگی کے پیڑ کی ایک ننگی شاخ ناچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اور مجھ
یوں محسوس ہوا جیسے ایک نوکیلا۔ لمبا۔ وحشی ناخن میرے دل میں اتر گیا ہے۔
کتنا بے مزہ تھا اس کا ناچ۔ جس میں کوئی قوس، کوئی دائرہ، کوئی پیچ و خم نہ
تھا۔ بے رس، بے آواز، بے مزہ۔ ناشپاتی کے درخت کی ننگی شاخیں
جھول رہی تھیں۔ ہوا کے تیز و تند جھونکے سرسرا رہے تھے۔ میں ایک قدم
آگے کو سرک گیا۔ زمین میں گرے ہوئے کیلوں کی قطار میں پھر ذرا سی جنبش
ہوئی تھی۔

”آپ ابھی تک وہیں کھڑے ہیں؟“ یہ اسی چپڑا سی کی آواز تھی۔
”ہاں بھیا وہیں کھڑا ہوں۔ دیکھئے کب باری آتی ہے۔“ میں نے جواب
دیا۔

”میرے ساتھ آئیے۔“ اس نے کہا اور مجھے بازو سے پکڑ کر آگے لے گیا۔
”جلدی سے ان کی پرچی بنا دیجئے فخری صاحب؟“ چپڑا سی نے پرچی لکھنے
والے کو آنکھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”ڈاکٹر صاحب کے آدمی ہیں۔“

آنکھ کا اشارہ ہوتے ہی پرچی تیار ہو گئی۔

”لاؤ بابو جی اب یہ پرچی مجھے دے دیں۔ آپ کا کام ختم ہوا آگے میرا

کام ہے۔“

میں نے پرچی چپڑا سی کو دے دی۔ اور اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے پرچی کے ساتھ کچھ اور بھی طلب کیا ہے اس نے۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی مٹھی میں دے دیا۔ وہ خوش ہو گیا۔ ہم دونوں پھر وہیں آگئے جہاں سے گئے تھے۔ گڈ واپنی ماں کے ساتھ تو تلی زبان میں نہ جانے چپکے چپکے کیا باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر پہلے وہ مسکرائی، پھر شرمائی اور خاموش ہو گئی۔ اس کی ماں پنچ سے پیٹھ لگائے اسی حالت میں اکڑوں بیٹھی تھی جس حالت میں اسے چھوڑ گیا تھا، وہ خاموش تھی۔ اس کی ہر چیز بدستور خاموش خاموش معلوم ہو رہی تھی۔ خاموشی لمحہ بہ لمحہ اور زیادہ گہری اور پراسرار ہوتی جا رہی تھی۔ چپڑا سی پرچی لے کر کمرے میں جا چکا تھا۔ بی بی مردانہ وارڈ کی تمام کھڑکیوں کے پٹ اب کھلے ہوئے تھے۔ صحن کے باغ میں چند ایک مریض کندھوں پر سرخ کسل ڈالے بنچوں پر بیٹھے تھے۔ ایک زس ناک تک چہرے کو کپڑے کے سفید بالک میں چھپائے ان کے قریب ہی درختوں کے درمیان تنی ہوئی الگنی پر سفید گیلے رد مال پھیرا رہی تھی۔ میں نے سگریٹ سدا گایا اور ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ ساتھ والے پنچ پر بیٹھے ہوئے دو شخص آپس میں کسی سینے ٹوریم کی باتیں کر رہے تھے۔ کوہستانی آب و ہوا کا ذکر کر رہے تھے۔ پہاڑوں کی بندیوں پر اگنے والے پراسرار جنگل۔ چنار، دیودار، صنوبر، چیرھ کے سایوں میں سے گزرنے والی ہوائیں۔

چشمے۔ جھرنے۔ آبشار۔ مرغزار۔ سرخ، گلابی، نارنجی، سبز، سفید، زرد، نیلے
گلابی پھولوں، تنگوفوں اور غنچوں سے لدے پھندے آلوچے، سیب، ناشپاتی
لوکاٹ اور بادام کے درخت۔ ہرے بھرے میدان۔ برف سے ڈھکی ہوئی
چوٹیوں پر منڈلاتے ہوئے بادل۔ سفید سفید کلیوں کی طرح گرتی ہوئی برف کی
سرگوشیاں۔ پرندوں کے چہچہے۔ مریض کا ساتھی اسے کسی سینے ٹوریم میں داخل
ہونے کا مشورہ دے رہا تھا۔ مریض کوئی متمول دیہاتی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ
کسی گاؤں سے بڑے ہسپتال میں اپنا معائنہ کرائے آیا تھا۔ پندرہ بیس آدمی
اس کی دیکھ بھال کے لئے اس کے ساتھ تھے۔ وہ بڑے مزے سے کوہستانی
آب و ہوا کی باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب بھی وارڈ کا معائنہ کر کے
آگئے۔ دو تین چھوٹے ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ سب مسکرا رہے تھے
اور اچھے موڈ میں تھے۔ اور سب اچھا تھا۔ مگر ادھر سب اچھا نہیں تھا۔ کئی مریض
بیٹھے بیٹھے یور ہو گئے تھے اور یوریت بڑھ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے نجمہ بھی یور ہو چکی
تھی۔ اسی اثنا میں چپڑاسی نے دروازے سے گردن باہر نکالتے ہوئے نجمہ کا
نام پکارا۔

”گڈو تم یہیں بیٹھو۔ ڈاکٹر صاحب نے بلایا ہے۔ تمہاری امی کو دیکھیں گے۔“

دوائی دیں گے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

گڈو نے جھکی ہوئی گردن اوپر اٹھا کر ماں کی صورت کو بڑے پیار سے دیکھا۔ جیسے
اس کا پلا یا ہوا سارا دھ اس وقت گڈو کے اندر پیار بن کر کھول اٹھا تھا۔ اس کی
آنکھوں میں چہچہے چہچہے آنسو تھے۔

”گڈو۔ میری بیٹی بیٹھ جاؤ۔ چندا بیٹھ جاؤ۔“ میں نے کہا

مگر گڈو نہ بیٹھی اور نہ ہی منہ سے کچھ بولی۔ جیسے اس نے میری آواز ہی نہ سنی تھی۔ جیسے وہ اس وقت وہاں نہیں تھی۔ وہ گر دن جھکائے اپنی نظروں سے دھرتی کو کمرہ پر ہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ دونوں ہاتھ یوں بھینچ کر سینے پر رکھے ہوئے موت کے ہیبت ناک دیوتا کے حضور میں فریاد کر رہی تھی۔

”دیوتا میری ماں کو صرف اس عرصہ تک زندہ رہنے دے جب تک میں جوان نہیں ہو جاتی۔ پر دیز جوان نہیں ہو جاتا۔ کامران جوان نہیں ہو جاتا۔“

میں نے نجمہ کو پھر گود میں اٹھایا اور کمرے میں لے گیا۔ چند دنوں سے اس کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ وہ ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھی۔

”مریضہ کو یہاں لٹا دیں۔“ ڈاکٹر نے آٹومیٹک سکرینگ پلانٹ کے تختے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے نجمہ کو اس پر لٹا دیا۔ اور پھر ڈاکٹر کے اشارے پر ایک نرس نے دیوار میں لگا ہوا ایک ٹین دبایا۔ کمرے میں گونج سی سنائی دی۔ سکرینگ پلانٹ بجلی کی رو سے حرکت میں آچکا تھا۔ تختے کی بائیں جانب سے گنبد نما ایک بڑا سا برقی آلہ لٹو کی طرح گھومتے ہوئے نجمہ کے سینے پر آکر رک گیا۔ نرس نے فوراً ہی دوسرا ٹین دبایا۔ اور گنبد نما برقی آلہ میں ایک جھروکہ سا بن گیا۔ اس میں مختلف ملے جلے رنگوں کی روشنیوں کی ایک قوس قزح سی چمکی، دھندلا گئی۔ دھند سی پھیل گئی۔ پھر روشنی ہوئی اور جھروکہ کے میں ایک تصویر ابھرائی۔ نجمہ کے دونوں پیچھڑوں کا عکس۔ جسے ڈاکٹر نے اپنی عینک چہرے

پر درست کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا۔ اور پھر اس نے ایک طرف جاتے ہوئے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔
”مریضہ کا باباں پھیپھڑا بالکل بیکار ہو چکا ہے۔“ اس نے آہستہ آواز میں مجھ سے کہا۔

”اور دائیں پھیپھڑے میں بھی یہ بیماری موجود ہے۔ باباں پھیپھڑا علاج ہو چکا ہے۔ ایسے مریض کی کسی وقت بھی موت واقع ہو سکتی ہے۔ مگر خدا کی قدرت کا کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ ایسا مریض ایسی حالت میں پانچ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ اور جی سکتا ہے۔“
”ڈاکٹر صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ عورت صرف پانچ سال اور زندہ رہے۔ اس کے بچے ذرا اور اونچے ہو جائیں۔ وہ اپنے مستقبل کے متعلق سوچنے کے قابل ہو جائیں۔ پھر یہ بیشک مرجائے۔“ میں نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے بھی کبھی آواز میں کہا۔

”مرنا سب نے ہے ڈاکٹر صاحب۔ پر اس وقت تو اس کی موت اک قیامت ہو گی۔ میرے لئے۔ اس کے بچوں کے لئے۔ اس کے لئے۔ اس کی بے چین روح گلی گلی کوچے کوچے اپنے بچوں کے پیچھے بھاگتی پھرے گی۔ ڈاکٹر صاحب۔ اس کی جدائی جیسے ہو گا میں تو برداشت کر لوں گا مگر یہ بچے کیسے برداشت کریں گے۔ پہاڑ سایہ غم اتنے چھوٹے چھوٹے دل کیونکہ سہہ سکیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میرے دونوں پھیپھڑے نکال کر اس کے پھیپھڑوں سے بدل دیئے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب میرا دل

اب بھی اس کا ہے۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس کا ہوگا۔ یہ اس کی امانت ہے میرے پاس۔ آپ اسے نکال کر کسی طرح اس کے کمزور اور تھکے ہوئے دل کے ساتھ ملا دیں۔ اس کا دل اور اس کی ہر دھڑکن میرے لئے بڑی مقدس ہے۔ میری ساری زندگی کی عبادت اس کی ایک دھڑکن کے برابر بھی نہیں۔ اس کا دل میرا تیرھکا۔ میرا سوال ہے۔ یہ میرے پیار کی مورتی ہے۔ میری ڈریم لینڈ کی مونا لیزا ہے۔ میرے سینوں کی بستی کی بیاطرس ہے۔ زندگی کے یہ دس سال جو ہم نے مل جل کر گزارے ہیں اس کی پوجا کے لئے بہت تھوڑے تھوڑے تھے۔ دس صدیاں بھی تھوڑی ہیں۔ دس جنم بھی بہت تھوڑے ہیں۔ اس کی پوجا میں گزارے ہوئے دس سال مجھے اپنے پیار کا وہ پہلا لمحہ معلوم ہوتے ہیں جس کی ابھی ابتدا ہوئی ہے۔“

میری آواز میں جذبات کا ایک طوفان اٹھ آیا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مگر ڈاکٹر جذباتی نہیں تھا۔ میری باتیں سن کر اس میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی، کہنے لگا۔

”میں دوائیں لکھ دیتا ہوں۔ مریضہ کو استعمال کر ائیں۔ ایک ہفتہ کے بعد اسے پھر یہاں لائیں۔ میں پھر معائنہ کروں گا۔“

”میں اسے یہاں داخل کرانے کے لئے لایا ہوں“ میں نے کہا۔
”آپ اسے داخل کر لیں۔ اب اس کا گھر پر علاج نہیں ہو سکتا۔ مرض بڑی شدید صورت اختیار کر چکا ہے۔“

”فی الحال کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ کم سے کم دو مہینے انتظار کرنا پڑے گا۔“

ڈاکٹر نے کہا۔

”مگر اس کی حالت تو بہت خراب ہو رہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں مجبور ہوں۔“

”آپ کی بڑی عنایت ہوگی۔“

”مجھے افسوس ہے میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں آپ کا ہمیشہ مشکور رہوں گا۔“

”مریض بہت ہیں۔ بیڈ کم ہیں۔ پانچ سو مریض ڈیٹنگ لسٹ میں پڑے ہیں۔

بتائیے کیا کیا جائے میں مجبور ہوں۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”اگر آپ عنایت کریں تو گنجائش نکل سکتی ہے۔“

”یہ غلط ہے۔ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں

کر سکتا۔ جو مریض مدت سے داخلے کے منتظر ہیں ان کے ساتھ نا انصافی نہیں

کی جاسکتی۔ کیا آپ اس نا انصافی کو پسند کریں گے؟“

”جی نہیں۔ میں یہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا کہ کسی مریض کو محروم کر کے اس کا

بیڈ میری بیوی کو دے دیا جائے۔ یہ انسانی شعور کی بات نہیں۔ میں تو

گنجائش کی بات کر رہا تھا۔ کہ اگر گنجائش ہو تو۔“

”جی گنجائش بالکل نہیں ہے۔“ ڈاکٹر نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔

مگر گنجائش بھئی اور ہر وقت ہوتی ہے۔ یہ مجھے اس دن معلوم ہوا۔ جن کو

داخل کرنا ہوا ان کے لئے گنجائش ہی گنجائش ہے۔ میں نجمہ کو لے کر باہر آیا

تو کوریڈر میں ایک شخص دوسرے شخص سے گنجائش کی باتیں ہی کر رہا تھا۔ وہ کہہ

رہا تھا۔

”بڑی مشکل سے بیڈ ملا تھا ہمارے مریض کو۔ ڈاکٹر نے ہاں کر لی تھی۔ پرچی پر تاریخ پڑنے کی دیر تھی۔ پر ادھر سے ایک اور آفت پڑ گئی۔ ایک سفارشی مریض آگیا۔ لہذا بیڈ اُسے اور جواب ہمارے مریض کو مل گیا۔ تاریخ لمبی ہو گئی۔ کیلنڈر بدل گئے۔ ایک منٹ پہلے جہاں گنجائش تھی گنجائش نہ رہی۔ ہسپتالوں میں بھی سفارشی ہی چلتی ہے۔ یہ سفارشی کا زمانہ ہے۔ زرد کا زمانہ ہے۔ زرد جو جی چاہے سو کر۔“

اور معاً مجھے خیال آیا ڈاکٹر صاحب کا انصاف اس وقت شاید سو گیا ہوگا۔ اور انصاف کی ایک توپ سی دغ گئی میرے دماغ میں۔ بڑے زور کا ایک دھماکہ ہوا۔ میرے گیان دھیان کے گوتم پر فالج گر گیا۔ مکتی اندھی ہو گئی۔ نروان لنگڑا ہو گیا۔ مگر نہیں وہ تو میرا اپنا ہی اک احساس تھا۔ میرے گیان دھیان کا گوتم اپنے گیان دھیان میں مگن تھا۔ اجالا۔ ایسے تو نہیں ہوگا۔ لاکھوں تاروں کا بلیڈان دیا جائیگا۔ کسی چراغ بجھیں گے سحر ہونے تک۔

پر دینہ اور کامران جیسے شوخ و شریر بچے جنہیں میں نے اس سے پہلے کبھی سنجیدہ نہ دیکھا تھا اس دن انتہا سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ ہسپتال سے واپس آکر میں نے ان میں ایک عجیب انقلاب دیکھا۔ دونوں بھائی دروازے میں دہلیز پر ایک دوسرے سے بہت قریب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اور کچھ سوچ رہے تھے۔ ان کے چہرے اتارے اتارے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں

آنسو تو نہ تھے مگر بھگی بھگی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہمیں دیکھتے ہی ان کے چہروں پہ خوشی کا ایک سایہ سا سرک گیا۔ کامران اچھیل اچھیل کر شور مچانے لگا۔
”امی آئی۔ ابا آیا۔ گڈوائی۔“

اور اس کی امی نے اُسے بھی بھی نظروں سے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔
”بیٹے میں آئی نہیں جا رہی ہوں۔ چل جاؤں گی۔ پھر کبھی لوٹ کر نہ آؤں گی۔“

کامران بھاگتا ہوا آیا اور اپنی امی کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ اس کی امی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے پیار کیا۔ پرویز اور گڈو نہ جانے کیا کھسکھسرتے ہم سے پیسے ہی کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی۔
”سلیم بابو جلدی سے کھانا منگو اور میرے بچوں کو بھوک لگ رہی ہے۔“
نجمہ نے کہا۔ اور بستر پر لیٹ گئی۔

میں نے پرویز کو ہوٹل سے کھانا لانے کے لئے پیسے دیئے۔ اور جلدی آنے کی تاکید کی۔ پرویز ٹیفن کیرئیر لے کر کھانا لینے چلا گیا۔ گڈو اپنی گڑیا کے ہیلن کٹ بال سنوار نے لگ گئی۔ کامران اچھیل کر میرے پاس چارپائی پر آ گیا۔ اور میری جیب سے سگریٹ کیس نکال کر اس میں اپنے چہرے کا عکس دیکھنے لگا۔ سگریٹ کیس کا اوپر کا حصہ آئیٹنے کی طرح صاف تھا۔ روروی میں بالوں کو سنوارتے ہوئے کبھی کبھی میں بھی اُس سے آئیٹنے کا کام لیا کرتا تھا۔

ایکا ایکلی نجمہ کے دل میں نہ جانے کیا آئی کہ اس نے اپنے بچوں کی عمر کے اندازے لگانے شروع کر دیئے۔ اور اس کے اندازے بالکل ٹھیک نکلے۔

میں نے اپنے ہریچے کی تاریخ پیدائش ڈائیری میں لکھی ہوئی ہے۔ مگر ماں کا
 سینہ کتنی عجیب ڈائیری ہے۔ جس پر بظاہر کچھ نہیں لکھا۔ مگر اپنے بچوں
 کے متعلق سب کچھ لکھا ہے۔ وہ اپنے بچوں کا ہر دکھ، ہر سکھ، ہر واقعہ اپنے
 سینے میں محفوظ رکھتی ہے۔ پر دیر کی عمر اس وقت نو سال کی ہے۔ گڈو
 کو ساتواں برس جا رہا ہے۔ اور کامران ابھی تین سال کا ہے۔ بخمہ نے
 اندازے سے اپنے ہریچے کی حتمی عمر بتائی اتنی ہی نکلی۔ اتنے میں پرورہ کھانا
 لے آیا۔ ہم سب کھانا کھا۔ نے بیٹھ گئے۔ بخمہ تو دو تین نوالے لے کر ایک
 طرف ہو گئی۔ چند دنوں سے اسے نہ تو بھوک لگ رہی تھی اور نہ رات کو
 نیند آرہی تھی۔ اور مجھے بھی اس دن کوئی خاص بھوک نہ تھی۔ چند نوالے لئے
 اور بس پیٹ بھر گیا۔ روغن جوش گڈو بڑے جوش و خروش سے کھایا
 کرتی ہے مگر اس دن اس نے سالی کو ہاتھ ہی نہ لگایا۔ تھوڑے سے
 سادہ چادر لکھا ہے اور بس۔ مگر پیدنیر اور کامران حسب معمول ڈٹے رہے۔
 سردی ہو یا گرمی دوپہر کا کھانا کھا کر میں قیلو کہ کیا کرتا ہوں۔ مگر اس دن
 میری آنکھ ہی نہ لگ رہی تھی۔ بظاہر آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑا
 تھا مگر جاگ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ رات جو طوفان
 میرے اندر اٹھا تھا ابھی گزرا نہ تھا۔ سطح خاموش تھی مگر غم میں کچھ ہو رہا تھا۔
 بڑی تیزی سے کچھ ہو رہا تھا۔ وہ آواز جو گزشتہ رات میرے اندر گونجی تھی اب
 بھی گونج رہی تھی۔ مگر اب بڑی مدھم ہوئی تھی۔ پھر بھی مجھے سنائی دے رہی تھی۔
 مجھے دلا سے دے رہی تھی۔

”جو کچھ ہونا ہے ہو ہی جانا ہے۔ تم ہمت نہ ہارتا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہارے بہت قریب ہوں۔ میں تمہارے اور قریب آرہی ہوں۔ کیا تمہیں میرے قدموں کی چاپ سنائی نہیں دے رہی؟ دروازہ کھولو۔ مجھے اندر آنے دو۔ دروازہ کھولو۔“

اور میں چونک گیا۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اتنے میں پر دیر بھاگا بھاگا آیا۔ کہنے لگا۔

”ابا آپ کو باہر دو آدمی بلا رہے ہیں۔“

میں جلدی سے باہر گیا۔ رسمی جملوں کے بعد معلوم ہوا کہ وہ صاحب اس سامان کا سودا کرنے آئے ہیں جو کہ بوٹ بنانے کا کارخانہ بند ہو جانے سے بڑی دیر سے گودام میں بیکا رہا تھا۔ میں نے اسے فروخت کرنے کے لئے بستی کے ایک بروکر سے کہا ہوا تھا۔ وہ کمیشن پر ایسی چیزوں کا سودا کرتا کرتا تھا۔ وہ اس دن ایک ضرورت مند کا ہک کو گھیر لایا تھا۔ میں نے مال دکھایا۔ اور اس کا آخری جو کچھ لینا تھا بتا دیا۔ وہ مال میں نے دو ہزار روپے میں خریدا تھا۔ مگر سات سو روپے میں بیچ رہا تھا اور وہیں کھڑے کھڑے بک گیا۔ جو بندھ جائے سو موتی۔ مال کی مجھے ضرورت تھی مال مل گیا۔ میں نے یہ خوشخبری خجہ کو سنائی تو بہت خوش ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے آتے ہی میرے اندر اٹھتے ہوئے طوفان کے ریلے پھرتے ہو گئے۔ اور تیز۔ اور تیز۔ طوفان ایک چٹان سے ٹکرا رہا تھا۔ چٹان سامنے کرسی پر تنہی بیٹھی تھی۔ میں ٹی بی بلاک کے ایڈمنسٹریٹر کا پتہ معلوم کر کے اس کی کوٹھی پہنچا اور اس سے بات کی۔ اور بات بن گئی۔ میں نے

دو کاغذ ادھر سر کاٹے تو ادھر سے بھی ایک کاغذ سرک کر ادھر آیا۔ یہ نجمہ کے
داخلے کی چٹ تھی۔ انصاف پسند ڈاکٹر کے نام تاکید کی حکمنامہ۔
» کل ٹھیک نو بجے اپنی بیوی کو لے کر ہسپتال پہنچ جائیں۔ اسے
داخل کر لیا جائے گا۔ ایڈمنسٹریٹر نے نجمہ سے کہا۔

میں نے چٹ لے کر جیب میں ڈالی۔ سلام کیا اور چل نکلا۔ لیڈی ڈاکٹر فردوس
کی ڈسپنسری میں آیا۔ بل ادا کیا۔ بوجھ ہلکا کیا۔ وہاں سے بازار کی طرف نکل گیا۔
سرسوں کا ساگ اور گوشت خریدا۔ میں گھر سے چلا تو نجمہ نے نجمہ سے کہا تھا۔
» سلیم بابو میرا جی چاہتا ہے سرسوں کا ساگ گوشت کھاؤں۔ آتے
ہوئے لیتے آنا۔ کل سے بازار سے کھانا آ رہا ہے۔ بے مزہ۔ باسی۔
بہت ہنگامہ۔

جب سے نجمہ کی حالت زیادہ خراب ہوئی تھی میں خود ہی کھانا پکایا کرتا تھا۔ اور
یہ میرے لئے کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس کے آنے سے پہلے بھی یہ سب چیزیں
میرے گھر لمبو مشاغل میں شامل تھیں۔ والدہ کی بنیادی نہ ہونے کی وجہ سے مجھے
گھر کے سارے کام کا ج کرنے پڑتے تھے۔

ساگ دھو کر میں نے کرو سین آئیل سٹو دجلا یا۔ ہنڈیا دھردی۔ تینوں بچے
اس وقت محلے کے بچوں کے ساتھ گھر کے دروازے کے قریب کھیل رہے تھے۔
سرسوں کا ساگ پکتے ہوئے بڑا پانی چھوڑتا ہے۔ تیل کی تین بوتلیں ٹھیک چکی
تھیں مگر پانی تھا کہ ابھی تک ہنڈیا میں پھتر پھتر کر رہا تھا۔ میں نے سٹو دین میں
تیل کی ایک اور بوتل ڈالی۔ تو مدھم ہوتا ہوا شعلہ یکدم پھرا بھرا۔ اور باہر چلتا ہوا

جھکڑا اور تیز ہو گیا۔ کالے کالے بادل آسمان میں گہرے گہرے ہوئے لگے۔ کمرے میں اندھیرا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے لمپ جلادیا۔ نجمہ گاؤں تکیے سے ٹیک لگاٹے اکڑوں بھیٹی تھی۔ بولی۔

”اب کیا بچا ہو گا؟“

میں نے گھڑی دیکھی تو پانچ بج رہے تھے۔ ”پانچ بج گئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”سلیم بابو یہاں آؤ میرے پاس۔“ نجمہ نے کہا۔

”کیوں کیا بات ہے نجمی؟“ میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔

”بچوں کی آواز نہیں آرہی۔ کیا سو گئے ہیں؟“

”ہاں سو گئے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”آہ۔ میرے بچے بھوکے ہی سو گئے۔“ نجمہ بولی۔ ”سلیم بابو انہیں کچھ

کھلا پلا تو دیا ہوتا۔“

”ساگ کا پانی ہی سو کھنے میں نہیں آتا۔ تیل کی چوڑھی بوتل پھینک رہی ہے۔

یہ ہو جائے تو انہیں جگا دوں۔ کھاپی لیں۔“

”سلیم بابو ہر چیز مجھے دھندلی دھندلی اور دور کیوں نظر آنے لگی ہے؟

یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”مات ہو گئی ہے نجمی۔ اور باہر بڑے زور سے جھکڑ چل رہا ہے۔ ہر طرف

دھول ہی دھول اڑ رہی ہے۔ کھڑکی کے راستے کمرے میں بھی آرہی ہے۔ میں اسے بند کئے دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”اور جلدی سے بتی بھی جلا دو بابو۔ میرا دل گھبرانے لگا ہے، دھند اور اندھیرے میں۔“

میں نے جلدی سے بتی جلائی۔ کھڑکی بند کر دی۔ اور پھر نجمہ کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

”سلیم بابو ایک بات کہوں تم سے۔“ نجمہ نے کہا۔

”کہو نجمی۔“ میں نے کہا۔

”میرے بعد میرے بچوں کو اچھی طرح رکھنا۔ انہیں رنجیدہ نہ ہونے دینا۔

یہ میرے پیار کی نشانیاں ہیں۔ انہیں اپنے دل سے لگا کر رکھنا۔ میں تو اب

تمہارے پاس کھڑی ہوں۔“ نجمہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”ایسا نہ کہو نجمی۔ ایسا نہ کہو۔ خدا تمہیں تمہارے بچوں کے سر پر سلامت

رکھے۔ تم ان کی خوشیاں دیکھو۔ میرا ہر سانس، میرے دل کی ہر دھڑکن تمہارے

لئے ہر وقت یہی دعا کرتی ہے۔“

”اب دعائیں اور دعائیں بیکار ہیں بابو۔ یہ رات میری زندگی کی آخری رات

ہے۔ آنے والے اجالے کو میں نہ دیکھوں گی۔“ نجمہ نے خوابناک آواز میں گنگو

جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کالی بیرن رات بچھوڑے کا سندیسہ لیکے آئی ہے۔ قسمت میں

یہی لکھا تھا۔ یہی ہوتا تھا۔ ان بچوں کی کوئی خوشی دیکھنا میرے نصیب میں

نہ تھا۔ میں اپنے دل میں یہ حسرت لئے جا رہی ہوں۔ خدا تمہیں ان سر پر سلامت رکھے۔ تمہیں ان کی خوشیاں دکھائے۔ تم کہانیاں لکھتے ہو بابو۔ سمجھنا مجھ سے پیار نہیں کیا تھا تم نے ایک کہانی لکھی تھی۔ اس کہانی میں اب تمہیں باپ کا ہی نہیں ماں کا کردار بھی ادا کرنا ہوگا۔ اور تم کر دو گے۔ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ تم میرے بچوں کو کھپول کی طرح رکھو گے۔ یہ کون ہے؟ کون ہے یہ؟ میرے سر ہانے یہ کون کھڑا ہے؟

”یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
”در اچھا۔ کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ یونہی میرا خیال ہے۔ اچھا خیال ہی سہی۔ سلیم بابو۔“
”نہجی۔“

”مجھے بی بی جان کے پاس لے چلو۔“
”نہجی نہجی نہیں۔ تمہیں آرام کرنا چاہئے تمہیں بڑے آرام کی ضرورت ہے۔“
”دراچھا تو پھر ان کو میرے پاس لے آؤ میں ان سے ملنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے ان سے ملنے نہ دو گے؟ یہ وقت پھر نہیں آئے گا بابو۔“

پتہ ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اٹرا
ایکے پچھڑے کب میں گے دور پڑینگے جا

نجمہ کی آنکھیں سادون کے بادل بن گئیں۔ ان سے آنسو برسنے لگے۔ وہ میری والدہ کو بی بی جان کہتی تھی۔ میں جلدی سے دوسرے کمرے میں گیا۔ اور اپنی والدہ

کو لے آیا۔ نجمہ ان کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور دہلی آواز میں نہ جانے اس نے کیا کہا کہ میری والدہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ کامل سکوت کے چند لمحے یونہی گزر گئے۔ اور پھر ایک ایک نجمہ کو کھانسی اٹھی۔ وہ کھانستے کھانتے مدہری ہو گئی۔ اور اکھڑے۔ اکھڑے سانس لیتے ہوئے لرزتی آواز میں بولی۔

”وہ سلیم بابو میں جبار ہی ہوں۔ میں جبار ہی ہوں۔ میری نبض۔ میرا دل۔“

میں نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی، جو چل رہی تھی مگر ایسے جیسے نہیں چل رہی۔ میں نے اُسے لیکوئڈ کورامین دی۔ چند منٹ دوائی کے رد عمل کا انتظار کیا۔ نتائج تسلی بخش نہ تھے۔ نجمہ کی حالت انتہائی طور پر تشویشناک ہو رہی تھی۔ باہر گرج چمک کے ساتھ ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں چھاتانے کے قریب ہی کی ایک ڈسپنسری سے ڈاکٹر کو لے آیا۔ اس نے پہلے نجمہ کی نبض دیکھی پھر اسٹٹسکوپ سے اس کے دل کا معائنہ کیا۔ جلدی جلدی بیگ کھول کر ضروری سامان نکالا۔ نجمہ کو کورامین کا انجکشن کیا۔ وہ کورامین کی حالت میں تھی اس وقت۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔

”ویری سیریش کیس۔ اکیوٹ ہارٹ اٹیک۔ نوپ۔ ہٹ دی مسٹ فائٹ ودا اور بروکن دے پنر۔ چلیے میں آپ کو ڈسپنسری سے ایک دوائی دیتا ہوں۔ ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک ڈوز دیتے جائیں۔ اور دوسرے ڈوز کے دو منٹ بعد ایک کیپسول۔“

گرج چمک کے ساتھ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ ہوائیں پھنکارنے لگی تھیں۔ چھاتانے نے ڈاکٹر کے اوپر کر دیا۔ اور خود بارش میں بھگتے ہوئے اس کے

ساتھ ہو گیا۔ بادلوں سے چلتی ہر بوند مجھ پر آنسو بن کر گر رہی تھی۔ دیر ہی سریش کیس۔
 بھینکارتی ہواؤں کی رفتار اور تیز ہوتی چلی گئی۔ اور تیز۔ اور تیز۔ میری کہانیوں
 کے کاغذی کڑے پھٹ پھٹانے لگے۔ بھینگ بھینگ کر پھٹنے لگے۔ ہر چیز مجھے
 کانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے بھونچال کے جھٹکے آرہے ہوں۔ ایک
 بڑی ہی مہیب سی گونج۔ سرسراہٹ۔ دیر ہی سریش کیس۔ ڈاکٹر کی آواز ابھی
 تک میرے کانوں میں متحرک تھی۔ ڈاکٹر کی آواز۔ ادھکنی آوازیں۔ ہلکا ہلکا شور۔
 جیسے کسی کو ٹکٹکی سے باندھ کر سرسراتے ہوئے کوڑے لگائے جا رہے ہوں۔
 جیسے کسی کو پتی ہوئی سلاخوں سے داغا جا رہا ہو۔ جیسے ڈائنامیٹ کی ہوئی
 دھرتی میں چھپی ہوئی چٹانیں اڑ رہی ہوں۔ ریزہ ریزہ ہو رہی ہوں۔ دھواں ہی
 دھواں۔ دھند ہی دھند۔ دیے دیے دہماکے۔ میری کہانیوں کے تاج محل
 گر رہے تھے۔ میری محبت کے مینا بازار اجڑ رہے تھے۔ میری داستانوں کے
 شبستانوں میں صویر اسرافیل پھونکا جا رہا تھا۔ میری کہانیوں کے کاغذی کردار
 اپنے کاغذی پیر بن پھاڑ رہے تھے، انہیں نوچ کر ہواؤں میں اڑا رہے تھے۔
 وہ سب پاگل ہو گئے تھے۔ میرے سپنوں کی بستی میں۔ میری ڈریم لینڈ میں
 بچل ہی چل گئی تھی۔ میرے سپنے، میری سوچیں سوکھے پتوں کی طرح طوفان
 میں اڑی جا رہی تھیں۔ نو ہوپ۔ اکیورٹ ہارٹ اٹیک۔ دنیا کے بلند ترین
 پہاڑوں کی سرسبز چوٹیوں پر گرے داغے برف میرے دل پر گرے نکلے۔ ماؤنٹ
 ایورسٹ، کنچن چنگا، دھولاگری، کیتو، کوہ ایپس کے برفانی تودے بادل
 بن کر میرے دل پر جھکنے لگے۔ زلزلہ۔ آندھی۔ برفباری۔ بیک وقت ایک

طوفان میں کئی طوفان تھے۔ اور میں تھا۔ شدید ترین برفباری۔ جس میں تن تنہا اکیلا، تھکا ہارا ایک جلا وطن ڈمگاتا چلا جا رہا تھا۔ ایک جلا وطن۔ جسے فقط ایک لڑکی سے پیار کرنے کے جرم میں دھرتی اور آسمان کے دیوتاؤں نے جلا وطن کر دیا تھا۔ ڈسپنسری سے جھونپڑے تک پہنچتے ہوئے میں نے سائبریا کے بھیا نک برفانی ویرانوں کو عبور کیا تھا۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میرے کپڑے پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ میں کھٹھڑا کانپتا، ہانپتا کمرے میں آیا۔ نجمہ میری والدہ کے آغوش میں تھی۔ وہ ر کے ر کے سانس لے رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق میں نے اسے دوائی کا پہلا ڈوز دیا۔ اور اس کی نبض تھام کر بیٹھ گیا۔ جیسے بجھتے ہوئے دیئے کی نو بجھنے سے پہلے ایک بار ابھرتی ہے۔ اس کی نبض دوائی دینے سے چند منٹ بعد ابھری اور میری انگلیوں میں لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی گئی اور پھر گم ہو گئی۔ نجمہ ر کے ر کے سانسوں کی بھول بھلیاں میں کھو گئی۔ دوسری نبض کی محسوس نہ ہوتی ہوئی دھڑکنوں کی گتھیوں میں گم ہو گئی۔ میری زندگی کا سب سے بڑا انقلاب آ گیا۔ زمین و آسمان کے دیوتاؤں نے مجھ سے میرے سپنوں کی بستی کی بیا طرس کو چھین لیا۔ میری ڈریم لینڈ کی مونا لزامر گئی۔ نجمہ مر گئی۔ میری محبت کی کہانی ختم ہو گئی۔ میری محبت کی کہانی۔ جسے میں نے مولسری کی مہک سے اپنے دل کی ہر دھڑکن پر لکھا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پتھر میں ڈھل گیا ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا مگر مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں سن رہا تھا مگر مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ موت کے جادو نے ہر چیز کو مسحور کر لیا تھا۔ اور

پھر ایک ایک ایک بھیانک دہماکہ سا ہوا۔ جیسے آسمان پھٹ گیا ہو۔ بجلی چمکی
اور یوں چمکی جیسے نجمہ کی لاش کو چھو کر کمرے سے باہر نکل گئی ہو۔ موت کا
طلسم ٹوٹتے ہی خاموشی میں رونے اور چیخنے کی دردناک آوازیں ایک کے بعد
ایک بلند ہوتی چلی گئیں۔ میری ماں کے بین سن کر بچے بھی جاگ گئے تھے۔ اور
اپنی ماں کی لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے
کھولتے ہوئے آنسوؤں کے دجلہ و فرات بہہ رہے تھے، اور ان کی
لہریں اُس پتھر سے بھی ٹکرائیں میں جس میں ڈھل گیا تھا۔ پتھر موم ہو گیا۔ پتھر ٹپھل
گیا۔ پتھر پانی ہو گیا۔ کتنی آگ تھی ننھے ننھے آنسوؤں میں۔ میری زندگی کے
سائیریا کے برفانی میدان سلگ اٹھے۔ میرے برفائے ہوئے جسم میں حرارت
آگئی۔ میں اُس جگہ سے اٹھا۔ بچوں کو باری باری سینے سے لگا کر پیار کیا۔ انہیں
تسلی دی۔ دلا سے دیئے۔ نجمہ کے ہاتھ کو آخری بوسہ دیا۔ اپنی بیٹی ہوئی بہار
کا آخری پھول اس کی لاش پر دھر دیا۔ ٹکٹکی لگائے اس کے چہرے کو ٹکڑے ٹکڑے
دیکھتا رہا۔ میری محبت کی دیوی — میری حوا — میری جواں مرگ حسرتوں
کے ریوا کندہ کی روپ متی۔ میری پدمنی — میری دیول دیوی۔ میری گیت
مالا کی گدا مبری — میری چتر لیکھا — میری ہیلن — میرے
سپینوں کی بستی کا سنہری سپنا سی شیا — میری ڈریم لینڈ کی پری فانگ
پن — میرے دل کے شوالے کی رہا بہہ اور شاعرہ یوسو آنچی — میری
آنکھوں میں رکے ہوئے آنسوؤں کے دریا ئے نیل کی بیٹی — نجمہ — میری
تلو پترہ — جسے موت کے افغی نے ڈس لیا تھا۔ جو مرنے کے بعد شکسپیئر

کی جیولیت سے کہیں زیادہ حسین نظر آرہی تھی۔ جس کے چہرے کی معصومیت اور بھولا پن پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش کو لحاف سے ڈھانپ دیا۔

میری رگوں میں خون کی گردش اچانک تیز ہو گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے خون کے دھبے سے ناچنے لگے۔ لہو کے داغ ایک خونیں دائرے میں وحشیانہ رقص کرنے لگے۔ میرے اندر بھی ایک لہو ترنگ اٹھی۔ جس سے میرا ذہن توازن قائم نہ رہا۔ میں پاگل ہو گیا۔ میں چیخنے لگا — مکتی — نردان — بھگوان — کہاں ہے؟ کدھر ہے؟ سامنے آؤ — پندرہ لاکھ لہو تھوکتے کھانتے ڈھانچوں کے پیدا کرنے والے سامنے آؤ۔ اندھیروں کے جنگل میں سہکتے ہوئے سوکھے سڑے گوشت کے ان لوتھڑوں کے خدا سامنے آؤ۔ میں تجھے تیرے انسان دکھاؤں۔ تیرے شاہکار دکھاؤں۔ تجھے تیری دیمک لگی ہوئی، گدہن لگی ہوئی مخلوق دکھاؤں۔ تجھے تیری صنائی کے نادر نمونے دکھاؤں۔ ان کے پیمپٹروں کے ناسور دکھاؤں۔ سوراخ دکھاؤں۔ کیا تم ان کے لئے کچھ نہیں کر دو گے؟ کیا یہ لہو تھوکتے کھانتے ہوئے ہی مٹی میں مل جائیں گے؟ آب و گل کے یہ کھلونے کیا تو نے اسی لئے بنائے ہیں؟ یہ دیکھو میری محبت کی لاش۔ تین کم سن بچوں کی ماں کی لاش۔ نجمہ کی لاش — مولسری کے پھول کی لاش۔ کیا یہ اپنے بچوں کو بٹکتے سسکتے ہی چھوڑ جائے گی؟ اس پھڑائے ہوئے جسم میں کیا اب کبھی کوئی جنبش نہ ہوگی؟ میں نے تم سے نردان اور مکتی مانگی تھی اس کی موت نہیں مانگی تھی۔ میں نے

ان اندھیروں میں سویرا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُجالا کرنا چاہا تھا۔ رات دن
شعلوں میں جلتی ہوئی ان سولہ لاکھ ٹھہسی ہوئی روحوں کے جہنم کو جنت بنانا چاہا
تھا۔ میری نیکی کا کیا یہی اجر ہے؟ میری انساں دوستی کا کیا یہی صلہ ہے؟
کہاں ہو؟ زمین و آسمان کے خدا تم کہاں ہو؟ آواز دو مجھے آواز دو۔ مگر کوئی
آواز نہ آئی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ میری چیخیں میرے نالے
چمکتی بجلیوں اور گر جتے بادلوں کے شور میں سسک سسک کر دم توڑ گئے۔
اور میں نے اپنے گیان دھیان کے گوتم کے بولتے چالتے بت کو توڑ دینے کی
ٹھان لی۔ اس نے مجھے بڑے غلط راستے پر لگایا تھا۔ اس کے کہنے پر میں نے
اپنے ساتھ اپنی محبت کو بھی موت کے جراثیم کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ دق کی
بیماری اسے خدمت خلق کرتے ہوئے اس بستی کی کسی مدقوق عورت ہی سے لگی تھی۔
بجھ اتنی ہمدرد عورت تھی کہ کسی حد تک محتاط رہتے ہوئے دق کے لاوارث و
نادار مریضوں کے کپڑے خود اپنے ہاتھ سے دھوئے میں بھی گریز نہ کرتی تھی۔
اس نے ضرورت مند مریضوں کے لئے مجھ سے چوری چوری ایک دوبار اپنا
خون بھی دیا تھا۔ پھر نہ جانے کب، کیسے، کہاں یہ حادثہ، یہ المیہ، یہ جانکاہ سانحہ
رو نما ہوا کہ اس نے اپنے پھیپھڑے کو بھی داعی کر لیا۔ میرے گیان دھیان کا
گوتم بھی مجھے اس وقت سازشی اور سکیئنڈل ساز معلوم ہوا۔ مجھے اس میں اور انیس
خاں میں کچھ فرق نظر نہ آیا۔ پہلے اپنے گیان دھیان کے گوتم اور اس کے بعد اس
بستی کے شیطان انیس خاں کو ختم کرنے کا، ہلاک کرنے کا میں نے اسی وقت منصوبہ
بنالیا۔ میری آنکھوں سے نکلتے ہوئے شرارے اور تیز ہو گئے۔ میری رگوں میں

کھولتے ہوئے خون کی گردش اور تیز ہو گئی۔ غم و غصہ کا ایک بگولہ سا میرے اندر اٹھا اور میں گھوم گیا۔ عین اسی وقت بادل گر جا۔ بجلی چمکی اور میں نے اپنے آپ کو مولسری کے پیڑ تلے پایا۔ اور ایک عجیب منظر دیکھا۔ میرے گرد پوش کی ہر چیز میرے سینوں کا ایک طلسم سی بن گئی۔ مولسری کے پیڑ کے پتے پتے، ٹہنی ٹہنی سے گلابی نور بھوٹ رہا تھا۔ جس میں میرے گیان دھیان کا گوتم پیڑ کے تنے سے پیچھے لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھا ابوالہول کی طرح میرے سینوں کی بے بادبستی کے دیرانے کو دیکھ رہا تھا۔ ریگستان کو دیکھ رہا تھا۔ طوفان نے میرے سینوں کی دنیا کو ریزہ ریزہ کر کے ریگستان بنا دیا تھا۔ اب وہاں ریت ہی ریت تھی۔ بگولے تھے۔ غول بیابانی تھے۔ صحرا میں اکٹھی ہوئی چٹانیں تھیں اور ان کے لمبے لمبے پھیلے پھیلے سائے تھے۔ جن میں ایک جگہ میرے سینے نجمہ کی لاش کو حنوط کرنے میں مصروف تھے۔ مومیائی مسالے، کیمیائی مرکب، مردے کو صدیوں تک محفوظ رکھنے والے دانش لاش کو لگائے جا رہے تھے۔ مولسری کے پھولوں کا لباس، کھن اور کوفن تیار کئے جا رہے تھے۔ دو ادبھی ادبھی، ہیکل کی سی شکل کی چٹانوں کے درمیان میری کہانیوں کا ایک مخروطی مینار، یعنی میری قلوب پترہ کا مقبرہ بالکل مکمل ہو چکا تھا۔ اب اس میں میری سوچیوں کی کافوری شمعیں جلائی جا رہی تھیں۔ میری جواں مرگ حسرتوں کی قندیلیں آویزاں کی جا رہی تھیں۔ میرے سینے میری نجست کی ملکہ کی آخری آرام گاہ کی آرائش و زیبائش میں مصروف تھے۔ عود و لوبان سلگایا جا رہا تھا۔ عنبر، مردارید، مشک اور صندل کے ڈھیر لگائے

جا رہے تھے۔ اور جب یہ سب کام ایک مختصر سی ساعت میں ہو چکے تو میرے سینے بجھ کی لاش کو لے کر چلے۔ جس شان سے فراعنہ مصر کی لاشیں ان کے مقبروں تک پہنچائی جاتی تھیں اسی شان سے بجھ کی لاش اُس مقبرے تک پہنچائی گئی۔ اسے دفن کر دیا گیا۔ اور پھر ریت کا طوفان اٹھا۔ اور میرے سینوں کا طلسم اس میں چھپ گیا۔ مگر میرے گیان دھیان کا گوتم ابھی تک میری نظر کے سامنے مولسری کے پیڑ تلے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ جگر۔ شعبدہ باز۔ مدار۔ مگر اب میں اس کی شعبدہ بازی دیکھنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے غصے سے دانت پیستے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن کو دبوچ لیا۔ قریب ہی کے کسی ڈھارے سے گتوں کے رونے کی مہیب آوازیں آنے لگی تھیں۔ تیز تیز چلتی ہواؤں سے برگد کے پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ اوریوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے بستی کا قوی ہیکل دیو بھوکا ہے۔ وہ اپنے دانت کھٹکھا رہا ہے۔ آتے جاتے اکیلے دکیلے راہگیروں کو گھور رہا ہے۔

”میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ جان سے مار دوں گا۔“

میں نے اپنے گیان دھیان کے گوتم کی گردن کو زور سے دبا تے ہوئے کرک کر کہا۔

”میں تجھے ہلاک کر دوں گا۔ جان سے مار دوں گا۔“

مگر وہ بالکل زبردست نہ ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر الوہی مسکراہٹ تھی اور چہرے پر سکون و طمانیت۔

”تم مجھے ہلاک نہیں کر سکتے۔ کوئی بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے آسمانی آواز میں کہا۔

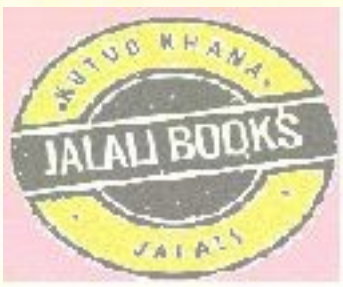
”میں امر ہوں۔ جاودا ہوں۔ میں مر نہیں سکتا۔ تجھے بھی نہیں مر سکتی۔ موت تو ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانے کا نام ہے۔ روح ایک چپے لے کو چھوڑ کر دوسرے چپے میں چلی جاتی ہے۔ موت تو ایک بڑی سی میٹھی غیبت ہے جو تھکی ماری اس زندگی میں آنی ہی چاہئے۔ آکر ہی رہتی ہے۔ موت کے بغیر زندگی نامکمل ہے۔ اس سے زندگی اور اس کی بہت سی چیزوں کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ جو کسی دوسرے قالب کو اختیار کرنے سے پہلے بڑی ضروری ہیں۔ تجھے زندہ ہے۔ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جب تک اس دھرتی پر مولسری کا ایک پھول بھی کھلتا رہے گا وہ زندہ رہے گی۔ اپنے بچوں میں زندہ رہے گی۔ تمہاری کہانیوں میں زندہ رہے گی۔ تمہارے سپنوں اور سوچوں میں زندہ رہے گی۔ اس عظیم کارنامے میں زندہ رہے گی جس کی خاطر اس نے جان دی۔ وہ وقت کے بہتے ہوئے سیلاب میں موجود رہے گی۔ ان اندھیروں کو ہمیشہ تو نہیں رہنا ہے۔ اجالا ہو گا ضرور ہو گا۔ سحر جاگے گی ضرور جاگے گی۔ اسے جگانے کے لئے کئی دیوؤں کو بھینا ہی پڑے گا۔ مکتی و نروان ایسے تو نہیں مل جائے گا۔ اسے حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ دینا ہو گا۔ بہت کچھ سہنا ہو گا۔ بہت کچھ تمہیں دیکھنا پڑے گا۔ تمہیں

بہت کچھ تیاگنا ہوگا۔ تیاگ ہی میں ملتی ہے۔ اور ملتی تمہیں مل کر ہی ہوگی۔
یہ اندھیرے، یہ طوفان اُسے آنے سے نہیں روک سکتے۔ ملتی کے
راستوں کو دھندلا نہیں سکتے۔ ملتی و نروان کا راستہ ہمیشہ سے
صاف اور سیدھا ہے۔ ہمیشہ صاف اور سیدھا رہے گا۔ بڑھے چلو۔
بڑھے چلو۔ ملتی و نروان کی منزل عزم و ہمت کے سامنے دور نہیں۔
تمہاری منزل بہت قریب ہے۔ صاف اور سیدھے اس راستے
کو نہ چھوڑو۔ نہ خم پر نہ خم کھاتے ہوئے مسکراتے ہوئے چلے
جاؤ۔ اس راستے کے راہبوں پر پتھر بھی برسائے جاتے ہیں۔ نہ بچیں
اور طوق بھی پہنائے جاتے ہیں۔ انہیں زندان کی دیواروں میں جھوس
کیا جاتا ہے۔ مصلوب کیا جاتا ہے۔ قدم قدم پہ دارورسن ہے
ان کے لئے۔ مگر ملتی و نروان کے متلاشی متفکر نہیں ہوتے۔ اپنے
لٹ جانے کا غم نہیں کرتے۔ رکنا اور الجھنوں پر سوچنا ان کا کام
نہیں۔ ملتی و نروان کے لئے تو وہ اپنا بلیڈان بھی دے دیتے
ہیں۔ دوسروں کے سکھ چہن کے لئے اپنا سکھ چہن گھونانا پڑتا
ہے۔ مایوس ہو جانا پاپ ہے۔ گناہ ہے۔ مایوس نہ ہو جانا۔
مولسری کے پھولوں کی مہک پھیلے گی۔ ضرور پھیلے گی۔ اس
نسبتی کے ہر انسان کے لہو کی ہر بوند میں رچ جائے گی۔ اس
کی مہک سے یہ ماحول بدل جائے گا۔ اس ماحول کا ہر انسان بدل
جائے گا۔ وہ زمانہ ضرور آئے گا۔ تمہارے گیان دھیان کی روشنی

گھر گھر میں پھیل جائے گی۔ لہو کھوکتے کھانستے پندرہ لاکھ انسانوں
کے لئے تم مکتی و نردان حاصل کرو گے۔ ضرور کرو گے۔ نجمہ کی
موت نے تمہیں مکتی و نردان کا دیوتا بنا دیا ہے۔ مکتی و نردان کا
نور آج میں نے پہلی بار تمہاری پیشانی پر چمکتے دیکھا ہے۔ تمہارے
چہرے کے چاروں طرف نور کا ایک ہالہ بنتا جا رہا ہے۔ اس نور
نے نجمہ کی محبت سے جنم لیا ہے۔ نجمہ کی زندگی کی جوت بجھتے
ہی تمہاری زندگی کی جوت جاگ گئی ہے۔ اس نور سے، اس جوت
سے اس بستی کے چاند ستارے جنم لیں گے۔ آج سے نجمہ ان
چاند ستاروں میں چمکے گی۔ کیا تم سمجھتے ہو مجھے نجمہ کی موت کا
غم نہیں ہے؟ ضرور ہے۔ اور تم سے زیادہ ہے۔ مگر اب کیا
کیا جائے۔ جو کچھ ہونا ہے ہو کر ہی رہے گا۔ اُسے روکا نہیں جا
سکتا۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے ہونا ہی تھا۔ تمہارا دل بھی غم سے
پاش پاش ہو رہا ہے۔ میرا دل بھی غم سے پارہ پارہ ہے۔
تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں کے سمندر اچھلنے کو بے چین ہو رہے
ہیں۔ میں بھی آنکھوں میں سادون کی کانی گھٹائیں چھپائے ہوئے ہوں۔
آؤ دونوں مل کر نجمہ کا سوگ منائیں۔ دونوں مل کر پندرہ لاکھ لہو
کھوکتے کھانستے انسانوں کی مکتی و نردان کی پجاریں کا ماتم کریں۔ ہم
دونوں ابھی تک اس کی لاش پر نہیں روئے۔ آؤ دونوں مل کر آنسوؤں
کی گنگا بہا دیں۔ مکتی و نردان کی پجاریں پر اس کا پوتر جل چھڑکیں۔“

میرے ہاتھ خود بخود ڈھیلے پڑ گئے۔ میں مولسری کے تنے سے لپٹ گیا اپنے
گیان دھیان کے گوتم سے لپٹ گیا۔ ہم دونوں ڈھائیں مار مار کر رونے
لگے۔ ہماری آنکھوں سے آنسو برسے لگے۔ بجلی چمکی۔ ایک دہشت ناک دھماکہ
ہوا۔ اور رُ کے ہوئے بادل بھی ہمارے ساتھ مل کر رونے لگے۔

جس وقت کہ میں نے اپنے گھر میں داخل ہوا تو
میرے دل میں ایک عجیب سی کیفیت تھی
جس کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں
ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی
جس کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں
ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی
جس کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں
ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی
جس کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں
ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی
جس کی وجہ سے میں نے اپنے دل میں
ایک عجیب سی کیفیت محسوس کی



ڈرامے

- ۱۔ برہم
- ۲۔ جادو
- ۳۔ چھ فنکار

یہ ڈرامے ریڈیائی تکنیک پر ریڈیو کے لئے لکھے گئے۔
ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر ہوئے اور بشکریہ ریڈیو
پاکستان کتابی صورت میں پیش کئے جاتے ہیں۔

حرف اول

آغا اشرف ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان لاہور کے ڈراما کے شعبے میں بہت شہرت پا چکے ہیں۔ میں اُسی زمانے سے انہیں جانتا اور اُن کے کمال فن کا معترف ہوں۔

ریڈیو ڈراموں میں پارٹ بہت سلیقے سے کرنے کے علاوہ وہ ریڈیو ڈراما لکھنے سے بھی گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے ایک تجربہ کار اور خوش مذاق ایگریٹر کے لکھے ہوئے ڈرامے میں کئی ایسی قابلِ قدر تکنیکی خصوصیات آپ سے آپ راہ پا جاتی ہیں جو ڈراما کے حسن کو دو بالا کرتی اور ایسے لوگوں کو عموماً نہیں سوجھتی ہیں جنہوں نے ڈراما کی پیشکش میں کبھی حصہ نہ لیا ہو۔

مجھے دلی خوشی ہے کہ آغا صاحب اپنے اُن ڈراموں کا جو ریڈیو پر کامیابی سے پیش ہو چکے ہیں، ایک مجموعہ کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ ان کے مطالعے سے وہ لوگ تو محفوظ ہوں گے ہی جو انھیں ریڈیو پر سن چکے ہیں، کئی ایسے لوگ بھی مستفید ہو سکیں گے جو ریڈیو ڈراما لکھنے کے مشتاق ہیں لیکن کامیاب ڈراموں کے

نمونے سامنے نہ ہونے کے باعث اس جدید ذریعہ اظہار میں طبع آزمائی کرنے میں تسامُل برتتے ہیں۔

مجھے امید ہے یہ ڈرامے بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھے جائیں گے اور اپنے ڈراموں کے دوسرے مجموعے چھاپنے میں مصنف کی حوصلہ افزائی کا موجب بنیں گے۔

سید امتیاز علی تاج

سید امتیاز علی تاج

۸ دسمبر ۱۹۳۳ء

بربط

[نوٹ :- یہ کھیل کسی زبان کے کسی کھیل کا ترجمہ یا چربہ نہیں ہے۔ اس کی تقسیم گریک مائیکالوجی سے ماخوذ ہے۔ اور وہ صرف اتنی ہے کہ یونان کے بمثال بربط نواز آرفیوس نے اپنی محبوبہ یوریشیا کی محبت میں جہنم کا سفر کیا۔]

کردار

- آرفیوس سرزمین یونان کا بے مثال بربط نواز
یوریشیا رہ بہ بہار کے مہیکل کی نرتکی
مائیکل رہ بہ بہار فلور کے مہیکل کا بڑا راہب
ہرس گڈریوں کے سردار کا بیٹا
زمیوس یونانی دیو مال میں سب دیوی دیوتاؤں سے
بڑا دیوتا۔
اپولو شعر و موسیقی کا دیوتا
پلوٹو دیوتا ٹے جہنم
اکرون جہنم کے دودریاؤں کا ملاح
جہنمی روحیں ہر کارے اور دوسری آمازیں

پہلا منظر

ربہ بہار فلورا کا ہیکل

مائیکل ربہ بہار فلورا کے بت کے سامنے سر جھکائے مقدس
منتر پڑھ رہا ہے۔ کافوری شمعیں روشن ہیں۔ عود و عنبر سُلگ
رہا ہے۔ ہر طرف پھولوں اور پھلوں کے انبار لگے ہوئے
ہیں۔ فضائیں مختلف سازوں کے الوہی نغموں سے لبریز
ہیں۔ دیوی کے آتشکدے سے تیزیز شعلے اٹھ رہے ہیں۔
جن کی روشنی آرفیڈس اور یوریشیا کے چہروں پر پھترک رہی
ہے۔ یہ دونوں عروسی لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اور ایک
دوسرے کا ہاتھ پکڑے چپ چاپ کھڑے ہیں۔ ان کی
گردنیں دیوی کے حضور میں جھکی ہوئی ہیں۔

مائیکل (خطیبانہ آواز میں) ربہ بہار۔ مقدس فلورا۔ تیرے ہیکل کا راہب۔
تیرا ایک ناچیز پجاری۔ مائیکل۔ بڑے عجز و انکسار کے ساتھ تیرے حضور میں
سرنگوں ہے۔ اور التجا کرتا ہے کہ اس جوڑے پر اپنی رحمت و برکت نازل
کر۔ ان کی زندگی کے دامن کو میٹھی مرادوں اور خوشیوں سے بھر دے۔ معزز دیوی۔
تیرے ہیکل کی نرتکی۔ تیری ایک حقیر پجاری۔ یوریشیا۔ میری بیٹی۔ سو ٹمبر چا
کر اپنے رفیق حیات کا انتخاب کر چکی ہے۔ بے شمار امیدواروں کے مجھوم میں
اس کی نظر انتخاب صرف آرفیڈس پر پڑی ہے۔ آرفیڈس۔ سرفزمین یونان

کابیے مثال بربط نواز۔ لاندہ وال مغنی۔ تیرے مہیکل کا زندہ جاوید موسیقار جس کے
بربط کی آواز کے اثر سے پتھر گھٹل جاتے ہیں۔ بہتے ہوئے دریا بھٹم جاتے
ہیں۔ پرندوں میں طاقت پر داز نہیں رہتی۔ اپنی بیوی یوریشیا کا ہاتھ تھامے
تیرے حضور میں سر بسجود ہے۔ یہ دونوں زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ
دینے کی قسم کھاتے ہیں —

مقدس دیوی — میں ان کا بزرگ اور تیرے مہیکل کا راہب تیرے حضور میں
ان کی خوشحالی اور درازی عمر کی دعا کرتا ہوں۔ مقدس دیوی۔ ہم تیری خوشنودی
حاصل کرنے کے لئے تیری پجارن پنڈورا کا مقدس لہو اور یہ پھول تیری مورتی
پر بچھا کر کرتے ہیں۔

[ساندوں پر طریقہ]

[ربہ بہار کے قدموں کو بوسہ دینے کے لئے آفیسس
اور یوریشیا جھک جاتے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم ادب
اور قاعدے سے آہستہ آہستہ منتشر ہوتا ہے۔]

دوسرا منظر

ہیکل کا پاؤں میں باغ

[آرفیوس اور یوریشیا یا سمینی کچھ میں ایک مرمری حوض کے کنارے محو راز و نیاز ہیں۔]

آرفیوس :- ایسا رقص میں نے آج تک نہ دیکھا تھا یوریشیا۔ مقدس فلورا کے جشن سالگرہ میں تم نے اپنے فن و کمال کی انتہا کر دی تھی۔ میرے برہم کے سب تار سلگ اٹھے تھے۔ اچھوتے نغمے خود بخود سامنے آنے لگے تھے۔ اس دن میں نے تم سے بہت کچھ سیکھا تھا۔

یوریشیا :- تم موسیقی کے دیوتا ہو آرفیڈس۔ میں تمہارے ساز کی آواز کا سہارا لے کر ناپاچ رہی تھی۔ تمہارے برہم کی آواز مجھے نئے نئے نرت بھاؤ بتا رہی تھی۔ نئے نئے انداز سکھا رہی تھی۔ ورنہ افسانہ الفت کا مضمون بڑا مشکل تھا۔

آرفیوس :- میں بہت حیران ہو رہا تھا کہ اتنا مشکل مضمون تم نے کیوں چھپڑ دیا۔ یوریشیا :- نہ جانے کس ترنگ میں۔ نہ جانے کس اُمنگ میں۔ میرے قدم الجھے الجھے راستوں پر چلنے لگے۔ سنبھلنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ تم اگر مجھے سہارا نہ دیتے تو بھری محفل میں میرا بھرم کھل جاتا۔

آرفیوس :- (ہنستے ہوئے) لوگ تمہیں عطائی کہتے۔

یورشیا :- اور کیا۔ بڑی کھٹن منزل تھی۔ میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں گرنے کو
کھتی لیکن تمہارے ساز کی آواز نے مجھے سنبھال لیا۔ اس سے پہلے میں نے
تمہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔

آرفیوسس :- اور میں نے بھی تمہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔

یورشیا :- تم نے یہ ساز بجانا کس سے سیکھا تھا؟

آرفیوسس :- یہ ایک بڑی عجیب و غریب داستان ہے۔

یورشیا :- میں اس داستان کو سننا چاہتی ہوں۔

آرفیوسس :- اچھا تو سنو۔ میرا باپ ایراس ایک بے نظیریت تراش تھا۔

میڈیا فن بت گری میں اس کا ایک لاندہال شاہکار ہے۔

یورشیا :- میڈیا کون؟

آرفیوسس :- وہ تھسلی کی ایک بڑی حسین عورت تھی۔ بڑی خود سر و مغرور۔

اسے اپنے حسن پر ناز تھا۔ مرد کی ذات سے اسے بڑی نفرت تھی۔

یورشیا :- عجیب عورت تھی۔

آرفیوسس :- واقعی وہ بڑی عجیب عورت تھی۔ اس کا غرور اتنا بڑھا۔ اتنا

بڑھا کہ اس نے دیوتاؤں کا بھی مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ اور دیوتا اپنی توہین

پر داشت نہیں کر سکتے۔ اُس پر عذاب نازل ہوا۔

یورشیا :- کیسا عذاب؟

آرفیوسس :- وہ ایک دن جھیل کے کنارے ٹہل رہی تھی۔ اچانک اسے بڑی

پایس لگی۔ جھک کر جھیل سے پانی پینے لگی تو اپنا عکس دیکھ کر اس پر نفرت ہو گئی۔

یوریشیا :- پھر کیا ہوا ؟
آرفیو سس :- اس کی فریفتگی اتنی بڑھتی۔ اتنی بڑھی کہ اپنا عکس دیکھتے دیکھتے
اُسے کئی دن گزر گئے۔ وہ کھانا پینا بھی بھول گئی۔ اور اسی حالت میں
جھیل کے کنارے مر گئی۔

یوریشیا :- بزرگ ایراس نے اپنے شاہکار میں اس کے چہرے پر
عزور کو اجاگر کیا یا محویت کو ؟
آرفیو سس :- دونوں چیزوں کو۔ عزور اور محویت کے نئے جُملے اثرات
کو۔ اور یہ امتزاج ہی اس شاہکار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس
بت کو فن بت گری کا ایک معجزہ قرار دیا گیا۔ کیونکہ اس میں ایک اور بھی
خوبی ہے۔

یوریشیا :- اور کیا خوبی ہے ؟
آرفیو سس :- اس بت میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ ہوا کے جھونکے
ان میں گزرتے ہیں تو بڑی سریلی آوازیں نکلتی ہیں۔
یوریشیا :- ان سوراخوں میں کیا ہے ؟ ان سے ایسی آوازیں کیوں نکلتی ہیں ؟
آرفیو سس :- یہ ایک بھید ہے۔ جسے اُس بت کے بنانے والے کے سوا
کوئی بھی نہ پاسکا۔ صرف سات سوراخ۔ سات مختلف آوازیں۔ میں بہار
کی ایک مہکی مہکی شام کو میڈیا کے بت کے پاس بیٹھا ایک شعر گنگنا رہا تھا۔
تو ایک ایک بت کے سوراخ بھی گنگنا نے لگے۔ اور اس گنگنا ہٹ کے
ساتھ ساتھ میرے ذہن میں بہت سی تصویریں ابھرنے لگیں۔ سادہ اور

زنگین تصویریں۔ اور پھر وہ سب مل کر صرف ایک تصویر بن گئیں۔ صرف ایک تصویر۔ ایک نقش۔ ایک ساز۔

یوریشیا :- ابتدا میں ہر فنکار کے ذہن میں ایسی ہی تصویریں کھچی کرتی ہیں۔ آرفیوسس :- یہ میرے شوق کا وہ دور تھا کہ میں نے ہر ساز کو بجا کر دیکھا۔ اور اُسے نامکمل پایا۔ ہر ساز میرے شوق کے مقابلے میں ادھورا نکلا۔ اگر کوئی ساز مجھے مکمل نظر آیا تو بس وہی ایک ساز تھا۔ جس کا نقش میرے ذہن میں موجود تھا۔

یوریشیا :- اس زمانے میں تمہاری راتیں - تمہارے دن عجیب الجھن میں گزرتے ہوں گے۔

آرفیوسس :- واقعی عجیب الجھن تھی۔ جو اچانک ایک دن خود بخود سلجھ گئی۔ یوریشیا :- وہ کیسے؟

آرفیوسس :- میں سمندر کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھا تھا۔ اسی اثنا میں آسمان سے سات ستارے ٹوٹے اور سمندر کے کنارے تنہا کھڑے ہوئے۔ صنوبر کے درخت پر گرے۔ درخت میں آگ لگ گئی۔ آندھی چلنے لگی۔ یوریشیا :- میں آندھی سے بہت ڈرتی ہوں۔

آرفیوسس :- اس طوفان میں ایک اور طوفان بھی اٹھ رہا تھا۔ سویا ہوا سمندر بھی جاگ اٹھا تھا۔ بڑی بڑی لہروں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو آندھی ختم چکی تھی۔ درخت وہاں موجود نہ تھا۔ سمندر گرج رہا تھا۔ لیکن اس کی لہروں میں وہ پہلا ساز ورنہ تھا۔ چاند کی روشنی میں ریت پر

میں نے کوئی چیز چمکتی دیکھی۔

یوریشیا :- وہ کیا چیز تھی ؟

آرفیوس :- یہ بربط ۔ میں نے اسے اٹھالیا۔ ایک چٹان پر بیٹھ کر اسے
بجانے لگا۔ لہریں سمٹتی چلی گئیں۔ ریت اور جھاگ میں پڑے ہوئے سیدپ
کھلنے لگے اور مجھے یوں محسوس ہوا گویا اس ساز کی آواز میرے کانوں کے
لئے اجنبی نہیں۔ میں نے سارا بھیر پالیا، اور چل نکلا۔ ٹرائے میں ایک
ہولناک جنگ لڑی جا رہی تھی۔ اس ساز نے اس جنگ میں بڑے معجزے
دکھائے۔

یوریشیا :- کیا معجزے دکھائے ؟

آرفیوس :- اگر میرے بربط کی آواز میدان جنگ میں نہ گونجتی تو سپاڑا والے
شکست کھا جاتے۔ ہر کولیس اور یولیس ایسے بہادروں کا نام دنیا میں
مشہور نہ ہوتا۔ اس کی آواز نے ان کو ایسی چٹان بنادیا جس پر دشمن کے ہتھیار
کارگر نہ ہوتے تھے۔ تیردوں اور نیزدوں کی بارش میں بھی وہ اپنی جگہ پر ڈٹے
رہے۔

یوریشیا :- کیا تم نے یہیں کو دیکھا ہے ؟

آرفیوس :- دیکھا ہے۔ اور بہت قریب سے دیکھا ہے۔

یوریشیا :- کہتے ہیں وہ دنیا کی سب سے حسین عورت ہے۔

آرفیوس :- اس کا جواب دیتے ہوئے میں کچھ حجاب ہمارا محسوس
کرتا ہوں۔

یورشیا :- پھر بھی کچھ پتہ تو چلے۔

آرفیوسس :- ہیلن تم سے زیادہ حسین نہیں ہے۔ وہ اگر زمین کا شاہکار ہے تو تم چاند کا شاہکار ہو۔

یورشیا :- کتنی سہانی شام ہے۔ کتنی پیاری ہوا چل رہی ہے۔ میرا پیارا ہرن بروکس بھی مست ہو رہا ہے۔ اب یہ ناچے گا۔ بروکس ناچو گے؟ میں نجر اتار دوں؟ یہ لو اتار دی۔ ناچو۔ بروکس ناچو۔

آرفیوسس :- آؤ اس جھیل پر چلیں۔ اس دادی کا آئینہ ہے یہ جھیل۔

یورشیا :- اس کی نیل نیل گرائیوں میں مگر کتے ہوئے صنوبر کے سائے تو بڑے ہی دلفریب ہیں۔

(وقفہ)

یورشیا :- (کچھ فاصلے سے) آرفیوسس۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :- یورشیا۔

یورشیا :- ان جھاڑیوں میں کچھ ہے۔ کچھ ہے۔ جس سے ڈر کر بروکس بھاگ نکلا ہے۔

آرفیوسس :- کدھر بھاگا ہے؟

یورشیا :- وہ دیکھو چوکرٹیاں بھیر رہا ہے۔

آرفیوسس :- میں اُسے پکڑ کر لاتا ہوں۔

[آرفیوسس ہرن کے پیچھے بھاگتا ہے]

[وقفہ]

[ہر س ایک جھاڑی سے نمودار ہوتا ہے]

ہر س :- (سرگوشی میں) یوریشیا۔

یوریشیا :- کون؟

ہر س :- جس کی محبت کو کھلونا سمجھ کر تم نے توڑ دیا۔ سوئمبر میں آرفیو سس کو اپنا شوہر منتخب کر کے جس کے دل پر تم نے کبھی نہ اچھا ہونے والا زخم لگایا۔

یوریشیا :- (گھبراہٹ میں) ہر س - ہر س -

ہر س :- ہر س نہیں اب مجھے میری مرحوم محبت کا مزار کہو۔ زندگی کی اجڑی ہوئی بہار کہو۔ تم نے مجھے برباد کر دیا۔ تم میری جواں مرگ محبت کی قاتل ہو۔ مگر نہ جانے کیا بات ہے تم میں۔ اب بھی میرا دل تم پر مٹا جاتا ہے۔ میں تمہیں اب بھی بڑا پیار کرتا ہوں۔

یوریشیا :- دور ہو شیطان۔ میرے ساتھ ایسی باتیں نہ کرو۔

ہر س :- (دہکا ساتھ ہارتے ہوئے) محبت کا جواب نفرت سے نہیں دیا کرتے۔ مانا کہ تم بڑی حسین ہو مگر میرا پیار بھی کوئی چیز ہے۔ چھوڑو اس مفلس بھانڈ کو جس کے پاس بربط کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرے ساتھ تم سموٹرس کے بسزہ زاروں میں چلو۔ تم جانتی ہو میں گڈریوں کے سردار کا بیٹا ہوں گڈریجے میرے باپ کو اپنا بے تاج بادشاہ سمجھتے ہیں۔ تم ان کی شہزادی کہلاؤ گی۔ گھوڑا تیار کھڑا ہے۔

یوریشیا :- مجھے تم سے نفرت ہے - نفرت ہے - چلے جاؤ - دور ہو جاؤ
میری آنکھوں سے - میں تمہاری منحوس صورت نہیں دیکھنا چاہتی - تم بڑے
ذلیل ہو -

ہرمس :- کیا کہا میں ذلیل ہوں ؟

یوریشیا :- ہاں - یہی کہا ہے میں نے -

ہرمس :- (دانت پیستے ہوئے) اچھا تو آج میں تمہیں ایسا ذلیل کر کے جاؤں گا
کہ کسی کو منہ نہ دکھا سکو گی - میرے اندر چھپا ہوا بھوت بھرک اٹھا ہے -
دیکھنا اب یہ کتنا کھرام مچاتا ہے -

یوریشیا :- (گھبراہٹ میں) آرفیوسس - آرفیوسس - آرفیوسس -

ہرمس :- بھاگ کر کہاں جاؤ گی - میں تم سے تیز بھاگ سکتا ہوں - باز اور
چپٹیا کا کیا مقابلہ - ہا ہا ہا -

[وحشیانہ قہقہہ مارتا ہے]

[یوریشیا ڈر کر ایک طرف بھاگتی ہے - لیکن تھوڑی
دور جا کر ایک دلدوز چیخ مار کر زمین پر گر جاتی ہے -
ہرمس جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو کر اڑ لگاتا ہے -
گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگتا ہے - آرفیوسس
آتا ہے -]

آرفیوسس :- (بے چین سانس لیتے ہوئے) یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں - میری محبت -

میری زندگی - میری یوریشیا زمین پر ترپ رہی ہے - سسک رہی ہے -

یوریشیا — یوریشیا — تمہیں کیا ہو گیا ہے؟
یوریشیا :- (اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے) مجھے سانپ نے کاٹ لیا
ہے۔

آرفیوسس :- کہاں؟

یوریشیا :- یہاں پنڈلی پر۔

آرفیوسس :- کہاں ہے؟ کدھر ہے سانپ؟

یوریشیا :- کس سانپ کا پوچھتے ہو؟

آرفیوسس :- جس نے تمہیں کاٹا ہے۔

یوریشیا :- ایک تو اپنے بل میں گھس گیا ہے۔ اور دوسرا اپنے گھوڑے پر

سوار ہو کر فرار ہو گیا ہے۔

آرفیوسس :- دوسرا کون؟

یوریشیا :- ہرسس۔ نابکار ہرسس۔ وہ مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ میں ڈر کر

بھاگی۔ گھاس میں سانپ چھپا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے ڈس لیا۔ جلدی سے

مجھے گھر لے چلو۔ نہر میرے جسم میں بڑی تیزی سے پھیل رہا ہے۔

[آرفیوسس یوریشیا کو اٹھا کر لے جاتا ہے]

تیسرا منظر

[آرفیوسس کی خواب گاہ]

آرفیوسس :- (روتے ہوئے) مر گئی۔ یوریشیا مر گئی۔ میری محبت مر گئی۔

اب مجھے بھی زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ زندگی اس کے بغیر ایک رسا ہوا
نا سو رہے جو کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس خنجر سے مجھے اپنا خاتمہ کر لینا
چاہیے۔

[خنجر اٹھاتا ہے]

[مائیکل آتا ہے]

مائیکل :- ٹھہرو۔

آر فیو سس :- کون۔ محترمہ مائیکل۔

مائیکل :- خودکشی بزرگوار آر فیو سس۔ یہ ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

آر فیو سس :- میں اپنے ارادے کو بدل نہیں سکتا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ میں
اس کی محبت میں مرجاؤں گا۔ آپ مجھے مرنے کیوں نہیں دیتے۔

مائیکل :- اگر تم مرنا چاہتے ہو تو ایک بہت بڑا کام کرتے ہوئے مرجاؤ۔ اگر کامیاب
ہو گئے تو موت کو بھی جیت لو گے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ تم یوریشیا کو

موت سے بچیں کر دوبارہ اس زندگی میں لے آؤ۔

آر فیو سس :- اگر ایسا ہو سکتا ہے تو میں وہ کام کرنے کو تیار ہوں۔

مائیکل :- مگر وہ بڑا مشکل کام ہے۔

آر فیو سس :- محبت ہر مشکل پر مسکرایا کرتی ہے۔

مائیکل :- اتنا حوصلہ۔

آر فیو سس :- آپ میرے حوصلے کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

مائیکل :- دل کو مضبوط کر لو۔

آرفیو سس :- فولاد سے زیادہ مضبوط ہے۔
 مائیکل :- تو جاؤ پھر کوہ الپس کو تسخیر کرو۔
 آرفیو سس :- میں تسخیر کروں گا۔ ضرور تسخیر کروں گا۔
 مائیکل :- پھر اُس سے آگے نکل کر تمہیں زیٹروس دیوتا کے دربار میں
 جانا ہوگا۔

آرفیو سس :- وہاں جا کر مجھے کیا کرنا ہے؟
 مائیکل :- مقدس دیوتا موسیقی کا دلدادہ ہے۔ انسانوں کے دلوں کو جیتنے
 کے بعد اب تمہیں دیوتاؤں کے دلوں کو بھی اپنے بربط کی آواز سے جیتنا ہے۔
 آرفیو سس :- میں جیتوں گا۔ ضرور جیتوں۔

مائیکل :- تو پھر تم یقیناً یورشیا کو موت کی دنیا سے نکال لاؤ گے۔
 آرفیو سس :- وہ کیسے؟

مائیکل :- دیوتا جب تمہاری موسیقی سے مسحور ہو جائے تو اس سے یورشیا
 کے لئے نئی زندگی طلب کرنا۔

آرفیو سس :- مجھے اپنے بربط پر پورا بھروسہ ہے۔ میں دیوتا کو اپنی موسیقی
 سے مسحور کروں گا۔

مائیکل :- پھر تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ جاؤ دیوتا کوہ الپس
 پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

آرفیو سس :- میں جا رہا ہوں۔ الوداع۔ معزز مائیکل الوداع۔

[جاتا ہے]

چوتھا منظر

[وادی ڈورس کا ایک بارونق بازار]

ایک شخص :- کتنی دردناک آواز ہے۔

دوسرا شخص :- کوئی بین کر رہا ہے۔

تیسرا شخص :- یہ آواز کہاں سے آرہی ہے ؟

پہلا شخص :- وہ دیکھو آرفیوسس برلب بجاتا آ رہا ہے۔ یہ اس کے ساز کی آواز ہے۔

دوسرا شخص :- آرفیوسس۔

پہلا شخص :- ہاں وہی۔ غور سے دیکھو۔ اچھی طرح پہچانو۔

دوسرا شخص :- وہی ہے۔ وہی ہے۔ ننگے پاؤں ننگے سر۔ بال بکھرے

ہوئے۔ گرد سے اٹے ہوئے۔ لباس تار تار ہو رہا ہے۔ اپنے ساز

کی آواز کے ساتھ ساتھ رہ رہا ہے۔

پہلا شخص :- یوریشیا کی موت نے اسے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اک افسانہ

بنا دیا ہے۔

تیسرا شخص :- آؤ اس کی دلجوئی کریں۔ اشک شوی کریں۔ اتنے بڑے

فنکار کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے۔ بیچارہ بالکل

رہ باد ہو گیا ہے۔

پہلا شخص :- اس کی بربادی کا باعث ہر س ہے۔ گڈریوں کے سردار کا بیٹا۔

جو کائی مہربا کے دیانوں میں اپنے کٹے کی سزا بھگت رہا ہے۔ یوریشیا
پر مجرمانہ حملہ کرنے کے جرم میں عدالت نے اُسے پندرہ سال کے لئے
علا وطن کر دیا ہے۔

دوسرا شخص :- آواز دو۔ آرفیوسس کو آواز دو۔ اب وہ بہت قریب
آگیا ہے۔

پہلا شخص :- آرفیوسس۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :- مجھے کس نے پکارا ہے؟

پہلا شخص :- رک جاؤ۔ ذرا رک جاؤ۔

آرفیوسس :- تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟

پہلا شخص :- ایک بات بتاتے جاؤ۔

آرفیوسس :- اب مجھے کوئی بات یاد نہیں۔

دوسرا شخص :- کدھر جا رہے ہو؟

آرفیوسس :- کوہ الپس کو تخی کرنے۔

دوسرا شخص :- وہاں کوئی نہیں جاسکتا۔

آرفیوسس :- میں جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا۔

دوسرا شخص :- (تمتہ مارتے ہوئے) پاگل ہو گیا۔ آرفیوسس پاگل ہو گیا۔ وہاں

جانا چاہتا ہے جہاں کوئی نہیں جاسکتا۔

[تمتہ مارتا ہے]

پہلا شخص :- تقدیر کے ماروں پر ہنسا نہیں کرتے۔ آدمیت سے کام لو۔

دوسرا شخص :- میں ہنسا کرتا ہوں۔ خوب ہنسا کرتا ہوں۔ ایسے انسانوں پر۔ ایسی باتوں پر۔ میں خوب ہنسا کرتا ہوں۔

[ہنستا ہے]

[آرفیو سس اپنی دھن میں مگن برہٹ بجاتے ہوئے]
[آگے نکل جاتا ہے۔]

پانچواں منظر

[کوہ المپس کی دشوار گزار برفانی بلندیاں]

[چھوٹے چھوٹے پتھر ٹھٹھکنے کی آوازیں]

آرفیو سس :- میں دھرتی سے بہت دور نکل آیا ہوں۔ میں چاند تاروں کے بہت قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ گلیشروں کے طویل سلسلے اوپر ہی اوپر اٹھتے جا رہے ہیں۔ ہوا کس قدر ٹھنڈی ہے۔ اچھا تو ہوا کرے۔ اب میں سردی گرمی کے احساس سے بھی بہت آگے نکل آیا ہوں۔ مجھے اپنی منزل صاف صاف اور بہت قریب نظر آرہی ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے مجھے وہاں پہنچنا ہے جہاں آج تک کوئی انسان نہیں پہنچا۔ میرا عزم کوہ المپس سے زیادہ بلند ہے۔

[پتھر ٹھٹھکنے کی آوازیں]

آرفیو سس :- یہ کیا ہے؟ اندھیرے کی یہ دیوار سی کیا ہے جو اوپر سے نیچے بھاگتی چلی آ رہی ہے۔ بڑی تیز رفتار ہے اس کی۔ یہ دبی دبی گونج سی کیوں

سنائی دینے لگی ہے؛ برفانی آندھی آرہی ہے۔ برفانی آندھی آرہی ہے۔
برف کا طوفان۔ تو دے ریزہ ریزہ ہو کر اڑنے لگے ہیں۔ مجھے کہیں چھپ
جانا چاہیے۔

[برفانی آندھی کا شور]

[کوہستانی بلندیوں سے لڑھک لڑھک کر گرتے
ہوئے پتھروں کے ہولناک دہماکے

آرفیوس :- یہ کیسا عجیب غار ہے۔ اس میں چھپ جاؤں تو اچھا ہے۔
اب مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کتنی عجیب گراہٹ ہے یہاں۔ دل
چاہتا ہے لیٹ جاؤں اور سو جاؤں۔ اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد اب میری
ٹانگیں بھی میرا ساتھ نہیں دے رہیں۔

[جہائی لیتا ہے]

[آندھی کا ہلکا ہلکا ہلکا شور اور لڑھکتے ہوئے پتھروں
کے دہماکے بدستور سنائی دے رہے ہیں۔ آرفیوس
سو جاتا ہے۔ لمبے لمبے اونچے اونچے خزانے ملتا
ہے۔ اور ایک بڑا ہی سہانا خواب دیکھنے لگتا ہے۔
جیسے وہ زیتوس دیوتا کے دربار میں پہنچ گیا ہے۔
دیوتا اپنے تخت پر براجمان ہے۔ اس کے تخت
کے دورویہ اور کئی تخت بچھے ہیں۔ جن پر لوتانی
دیو مالاکے دیوی دیوتا بیٹھے ہوئے ہیں۔ دربار میں

سنناٹا چھایا ہوا ہے۔ اور پھر ایک ایسی ناقوس کی
آواز دربار میں گونجتی ہے۔

ہرکارہ :- (باد از بند) خداوند۔ ایک اجنبی انسان محل کے دروازے کے
قریب مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے۔ اجازت ہو تو
اُسے پیش کیا جائے۔

زیئوس :- اجازت ہے۔

ہرکارہ :- نگاہ ادب روبرو۔ آداب بجالاؤ۔ دیوتاؤں کے دیوتا کو سجدہ
کرو۔ خدائے زیئوس کے حضور میں کونش کرو۔

آرفیوس (گڑ گڑا کر) ذی مرتبت دیوتا۔ مقدس زیئوس۔

زیئوس :- تم کون ہو؟

آرفیوس :- ایک بد نصیب کلاکار۔

زیئوس :- تمہارا نام؟

آرفیوس :- آرفیوس ہے میرا نام۔

زیئوس :- کہاں سے آئے ہو؟

آرفیوس :- میں وادی ڈورس سے آ رہا ہوں۔

زیئوس :- جہاں ہم ہیں وہاں انسان نہیں آ سکتے۔ یہ ہمارا مسکن ہے۔

جہاں تمام دیوی دیوتا ہمارے دربار میں حاضر ہونے کے شہر ہونا یا کرتے

ہیں۔ تمہیں کون یہاں لایا ہے؟

آرفیوس :- میرا عزم۔ میرا فن۔

زئیوئس :- کیا مطلب ؟

آرفیوئس :- میں دیوتاؤں کے دیوتا کو اپنی درد بھری داستان سنانے آیا ہوں۔ اجازت چاہتا ہوں۔

زئیوئس :- اجازت ہے۔

آرفیوئس :- میری داستان میرا بربط اپنی زبان میں بیان کرے گا۔

زئیوئس :- ہم بڑے غور سے سنیں گے۔ اس سنگھاشن پر بیٹھ جاؤ۔ اور

بڑے اطمینان سے اپنی داستان بیان کرو۔ اپولو دیوتا۔

اپولو :- خداوند۔

زئیوئس :- کلاکار کو نکٹار کا ایک جام دو۔

اپولو :- جو حکم۔ خوش نصیب انسان نکٹار دیوتاؤں کی شراب ہے۔ تم

پہلے انسان ہو جسے یہ پینے کو دی جا رہی ہے۔

آرفیوئس :- اس عزت افزائی کا شکریہ۔

زئیوئس :- شروع کرو۔ کلاکار اپنی داستان شروع کرو۔

[آرفیوئس بربط بجاتا ہے۔ چند ہی لمحوں میں اس کے
بربط کی آواز تمام دیوی دیوتاؤں کو مسحور کر لیتی ہے۔
اعد زئیوئس دیوتا کی گردن آواز گونجتی ہے۔]

زئیوئس :- ہو! کتنی پر درد داستان ہے۔ اپولو۔

اپولو :- خداوند۔

زئیوئس :- ہماری ہیکوں پر پھترکتے ہوئے آنسوؤں کو چاند کے قرا بے میں

تعمد کر لو۔ تاکہ جب کبھی اس کلاکار کی یہ داستان محبت لکھی جائے تو اس میں یہ بھی نمایاں طور پر لکھا جائے کہ اس کے ربط کے ساتھ ساتھ کوہ اولیس کے دیوتا بھی روئے تھے۔

الپولو :- خداوندیہ کلاکار تو کوئی بہت بڑا جادوگر معلوم ہوتا ہے جس نے اپنے جادو سے دیوتاؤں کو بھی مسحور کر لیا ہے۔
زیئوس :- محبت زمین و آسمان کا سب سے بڑا جادو ہے۔ اس سے تو دیوتا بھی ڈرتے ہیں۔

الپولو :- خداوند بجا فرماتے ہیں۔

زیئوس :- آرفیوسس۔

آرفیوسس :- معزز دیوتا۔

زیئوس :- موسیقی ہماری زبان ہے۔ جو بات ہماری زبان میں کی جاتی ہے ہم اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم نے بڑے پسندیدہ انداز میں اپنی داستان کو بیان کیا ہے۔ تمہارے جادو سے بہتے ہوئے دربارک گئے ہیں۔ کوہ اولیس کی چوٹیاں گھل کر موم ہو گئی ہیں۔ اٹھتے ہوئے پرند مست ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔

آرفیوسس :- اس داستان کا آخری باب ابھی باقی ہے معزز دیوتا۔

زیئوس :- ہم اُسے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے ساز کی آواز ہمارے دربار میں آگ لگا دے۔

آرفیوسس :- تو پھر میری داستان ادھوری رہ جائے گی معزز دیوتا۔

زیئوس :- تمہاری ہر چیز مکمل ہو چکی ہے آرفیوس - محبت معراج کا دوسرا نام ہے - دیوی دیوتا بھی محبت کرتے ہیں - دیوی دیوتاؤں سے - فانی انسانوں سے - مگر یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ دیوی دیوتا آج تک محبت میں وہ معجزے نہیں دکھائے جو کہ انسانوں نے دکھائے ہیں - تمہارا ربط بھی محبت ہی کا ایک معجزہ ہے - اپولو -

اپولو :- خداوند -

زیئوس :- تم نے بھی میڈیا سے محبت کی تھی -

اپولو :- خداوند -

زیئوس :- اس کی محبت میں تم نے بے شمار شجر کسے - بے شمار گیتوں کو جنم دیا - تم نے اپنے ہر سانس کو اس کی محبت میں سنگیت بنالیا - اپولو :- میں میڈیا کی محبت میں بالکل دیوانہ ہو گیا تھا خداوند - زیئوس :- اور آرفیوس بھی محبت میں دیوانہ ہو چکا ہے -

اپولو :- خداوند -

زیئوس :- کیا تم نے بھی محبت میں کبھی کوئی معجزہ دکھایا ہے ؟ تمہارا کوئی شجر - کوئی گیت - کوئی نغمہ جسے تمہارا معجزہ کہا جاسکے ؟ اپولو :- میڈیا کی محبت نے مجھے اتنا بنخود بنا دیا کہ میں اپنا کوئی شاہکار نہ پیش کرسکا - جو اس افسانہ محبت کا عنوان ہوتا -

زیئوس :- آرفیڈس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟

اپولو :- سنگیت اور شعر و سخن کا دیوتا ہے آرفیوس -

زیئوس :- مگر یہ مرتبہ تو ہم نے تمہیں عطا کیا تھا؟

اپولو :- افسوس، محبت میں تساہل سے کام لیتے ہوئے میں نے وہ مرتبہ کھو دیا اور آرفیوس نے اسے پالیا۔

زیئوس :- جانتے ہو یہ بربط کیا ہے؟

اپولو :- وہ سات ستارے جو کبھی خداوند کے تاج سے ٹوٹ کر سمندر کے کنارے گرے تھے۔ میں آرفیوس سے التجا کروں گا کہ وہ اپنا بربط مجھے دے دے۔

زیئوس :- (کسی قدر تند لہجہ میں) ایسے الفاظ منہ سے نکالتے ہوئے اولمپس کے دیوتاؤں کی توہین نہ کرو اپولو۔ دیوتا انسانوں کو دان دیا کرتے ہیں ان سے کچھ لیا نہیں کرتے۔

اپولو :- تو پھر مجھے اس فنکار کی شایان شان کوئی تحفہ پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ میں اس کی گیتوں بھری کہانی سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں اس کہانی کو گیت مالا کہوں گا۔

زیئوس :- آرفیوس تمہارا نہیں ہمارا ہمان ہے۔ ہمارے پاس آیا ہے۔ ہم خود اپنے ہمان کی عزت افزائی کریں گے۔ آرفیوس۔ آرفیوس :- معزز دیوتا۔

زیئوس :- ہمارے قریب آؤ۔ اور قریب۔ اور قریب۔ دل میں احساس کمتری پیدا نہ کرو۔ محبت تمہیں اُس مقام پر لے آئی ہے جہاں ہماری ذات کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ اور ہماری ذات صرف جوش و جلال

ہی نہیں جمال بھی ہے۔ مانگو کیا مانگو گئے؟

آر فیوئس :- معزز دیوتا میں اپنی بیوی یوریشیا سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔

زیئوئس :- یوریشیا۔ فلورادیوی کے ہیکل کی رفاصہ۔ مائیکل کی بیٹی۔

آر فیوئس :- وہ اس وقت کہاں ہے؟

زیئوئس :- ہاڈس میں۔

آر فیوئس :- ہاڈس کونسی جگہ ہے اہد کہاں ہے؟

زیئوئس :- ہاڈس وہ جگہ ہے جہاں ہم خطا کاروں کو ان کی خطاؤں

کی سزا دیتے ہیں۔ جہاں گناہ گار اپنے گناہوں کی سزا پاتے ہیں۔

آر فیوئس :- مگر وہ تو بڑی پاکیزہ عورت تھی۔

زیئوئس :- بیشک وہ پاکیزہ عورت تھی۔

آر فیوئس :- پھر اُسے یہ سزائیوں دی گئی؟

زیئوئس :- اُس نے ہماری محبت کا مذاق اڑایا تھا۔

آر فیوئس :- میں دیوتا کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

زیئوئس :- یوریشیا نے اپنی خوبصورتی کے گھمنڈ میں حسن کی دیوی دینس کا

مذاق اڑایا تھا۔ دینس نے ہم سے شکایت کی۔ ہم دینس سے بڑی محبت

کرتے ہیں۔ ہمیں غصہ آگیا۔ ہم نے یوریشیا کو موت کے بعد پانچ سال

تک ہاڈس میں کوڑے کھانے کی سزا دی۔

آر فیوئس :- یہ آپ نے بڑا ظلم کیا۔

زیئوس :- ہم کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ انسان خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

آرفیئوس :- لیکن میری آرزو کا اب کیا ہوگا؟

زیئوس :- گھبراؤ نہیں۔ تمہاری آرزو کو پورا کیا جائے گا۔ تم پہلے انسان ہو

جس نے محبت اور موسیقی کا سہارا لے کر کوہ اولمپس کو عبور کیا ہے

ہمیں مسحور کیا ہے۔ تم چاہو تو ہم تمہیں اپنے دربار کا رتن بنالیں کیا تم

ہمارے ساتھ اس نور میں رہنا پسند نہ کرو گے۔؟

آرفیئوس :- نہیں۔ ہرگز نہیں۔ مجھے وہاں جانا ہے جہاں میری محبت

ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے مجھے یوریشیا کے پاس پہنچا دیجئے۔

آرفیئوس :- اتنی بے قراری۔ یوریشیا کے لئے میری بیقراری ایک ایسا بے پایاں سمندر

ہے۔ جس میں کوہ اولمپس سے بھی اونچے اونچے جوار بھاٹے اٹھتے نہ ہتے ہیں۔

زیئوس :- یوریشیا تک پہنچنے سے پہلے تمہیں کراہ ظلمت میں بڑا المبا

سفر کرنا ہوگا۔

آرفیئوس :- میں تیار ہوں۔

زیئوس :- تو پھر تم یقیناً اس سے ملاقات کر سکو گے۔ ہمارے

خاص ہرکارے تمہارے متعلق ہمارا پیغام ہائوس کے دیوتا پلوٹو تک

پہنچا دیں گے۔ اپولو۔

اپولو :- خداوند۔

زیئوس :- ہرکاروں کو حکم دو وہ آرفیئوس کو کراہ ظلمت میں اتار آئیں

اپولو :- جو حکم۔

ہرکارے آرفیوس کو لے کر جاتے ہیں

چھٹا منظر

کرہ ظلمت

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ہوائیں
تیز تیز چل رہی ہیں اور سانپ کی طرح پھنکار رہی ہیں
آرفیوس :- کتنا گرا اندھیرا ہے یہاں۔ ہوائیں پھنکار رہی ہیں۔ دور کہیں دود
دھیمادھیماشور سنائی دے رہا ہے۔ مجھے اسی سمت چلنا چاہئے۔

وقفہ

آرفیوس :- اندھیرا پھیکا پڑتا جا رہا ہے۔ وہ سامنے چاندی کی ایک لکیر
سی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ بل کھاتی ہوئی ایک لمبی سی لکیر۔
یہ دریا ہے۔ اور اس کا پانی چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔ جس کے
کنارے پر ندمند درخت بھوت بنے کھڑے ہیں۔ اور ان کے زمین
پر بکھرے ہوئے زرد پتوں کے ڈھیروں میں روحیں سک رہی ہیں۔
مجھے ان کے قریب چلنا چاہئے۔

وقفہ

آرفیوس :- (ایک روح کے قریب آتے ہوئے) یہ کونسی جگہ ہے؟
روح :- (بے اعتنائی سے) کیا کہا تم نے؟
آرفیوس :- یہ کونسا مقام ہے؟

روح :- یہ کڑا ظلمت کے دو دریاؤں کا سنگم ہے۔

آرکیوسس :- یہ کن لوگوں کی روحیں ہیں ؟

روح :- یہ ان گناہگاروں کی روحیں ہیں جنہیں کفتایا اور دفنایا نہ گیا۔

آرکیوسس :- یہ ان سوکھے ہوئے پتوں کے ڈھیروں میں کیوں سسک رہی ہیں ؟

روح :- یہ سب اکروں کا انتظار کر رہی ہیں۔

آرکیوسس :- وہ کون ہے ؟

روح :- ایک ملاح کا نام ہے۔ جو ان روحوں کو اپنی کشتی میں لاد کر ان کی جگہ پر پہنچاٹے گا۔

آرکیوسس :- تمہیں اس حال میں دیکھ کر میرا دل غم سے بو جھیل ہوتا جا رہا ہے۔ کاش میں تمہا رہی کوئی مدد کر سکتا۔

روح :- تم کس شخص کی روح ہو ؟

آرکیوسس :- میں ابھی زندہ ہوں۔

روح :- عجیب بات ہے۔

آرکیوسس :- اور یہ سب کچھ ایک عجیب حادثے کی وجہ سے ہوا ہے۔

روح :- تم یہاں کیوں آئے ہو ؟

آرکیوسس :- میں اپنی بیوی اور شیائے ملاقات کرنے آیا ہوں۔ تم نے

یہاں کبھی کوئی ایسی روح دیکھی ہے جس کے بال سونے کی طرح چمکتے

ہوں اور آنکھیں نیلم کی طرح - جیسے نیلے نیلے دو جگنو -

روح :- ہاں دیکھی ہے -

آر فیو سس :- کب ؟

روح :- اب سے ایک سال پہلے ایک روح ان اندھیروں سے گزری

بھتی - اس کے بال سونے کی طرح تھے - آنکھیں دو جگنوؤں کی طرح چمک

رہی تھیں - اس کی ایک پنڈلی سے خون بہہ رہا تھا - جس کی بوندیں جہاں

جہاں گرتی تھیں گھٹنگھر سے چھٹک جاتے تھے - اور ایک بڑی ہی سریلی

آواز اس کا تعاقب کر رہی تھی -

آر فیو سس :- وہ میرے ربط کی آواز تھی -

روح :- یہ کیا ہے تمہارے ہاتھ میں ؟

آر فیو سس :- ربط -

روح :- کوئی ہتھیار ہے ؟

آر فیو سس :- نہیں - یہ ایک ساز ہے

روح :- ذرا اسے بجاؤ تو سہی -

آر فیو سس :- یہ اس وقت سوراہا ہے -

روح :- عجیب مسخرے ہونگے - یہ بھی کوئی زندہ چیز ہے -

آر فیو سس :- یہ زندہ ہے - ہمیشہ زندہ رہے گا -

روح :- یہ کب جاگے گا ؟

آر فیو سس :- اسے یوریشیا کی آواز جکائے گی -

روح :- تم مجھے پاگل معلوم ہوتے ہو۔

آرفیوسس :- یہ میرے لئے نیا نام نہیں۔ اس سے پہلے بھی مجھے ڈورس کے

بازاروں میں اسی نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ کون آرہا ہے؟

روح :- اسی کا نام تو اکر دن ہے۔ اس دریا کا ملاح۔

پانی سے ٹکراتے ہوئے چپوؤں کی آواز کشتی کنارے

سے آکر لگتی ہے۔

اکرون :- اجنبی تمہارا نام کیا ہے؟

آرفیوسس :- آرفیوسس

اکرون :- کوہ اولپس سے آئے ہونا؟

آرفیوسس :- ہاں۔ وہیں سے۔

اکرون :- خوش آمدید معزز مہمان۔ اس کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ میرے آقا معزز

پوٹو تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

آرفیوسس :- یوریشیا کہاں ہے؟

اکرون :- یوریشیا کون؟

آرفیوسس :- میری بیوی۔

اکرون :- مجھے معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔ میں اس دریا کے کناروں سے

کبھی باہر نہیں نکلا۔

آرفیوسس :- تو پھر تم بھی ان روحوں کی طرح ایک بہت بڑے عذاب میں

بتلا ہو۔

اکروں :- بخوبی تو نہیں ہو تم ؟
 آرفیوس :- میں موسیقار ہوں ۔
 اکروں :- کیا روحوں کو گانا سکھانے آئے ہو ؟
 آرفیوس :- تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو ؟
 اکروں :- اپنے آقا کے پاس ۔ ان کے محل میں ۔
 آرفیوس :- ان کا محل کہاں ہے اور کتنی دور ہے ؟
 اکروں :- تم اس کے بالکل قریب آگئے ہو ۔ میں تمہیں اس چٹان پر
 کشتی سے اتار دوں گا ۔
 آرفیوس :- کس چٹان پر ؟
 اکروں :- ادھر دیکھو ۔ وہ ۔ جہاں شعلے اٹھ رہے ہیں ۔ اب تمہیں ان شعلوں
 میں مختور اس سفر کرنا ہے ۔ محفوظی دور جا کر تمہیں ایک محل نظر آئے گا ۔
 وہی تمہاری منزل ہے ۔

[دبی دبی چیخیں ۔ دبا دبا شور ۔ کراہنے کی دھیمی دھیمی]
 [آوازیں ۔ گناہگار روحوں کو سزائیں دی جا رہی ہیں]
 آرفیوس :- شعلے ۔ بھڑکتے ہوئے شعلے ۔ چاروں طرف شعلے ہی شعلے لہان
 یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مجھے ان شعلوں کی آہ نہیں آ رہی ۔ یہ کس کی
 روح ہے ؟ اس کے شانے پر عقاب بیٹھا ہے ۔ اور اس کے دل
 کو اپنی پونچ سے گریڈ رہا ہے ۔

[چیخیں ۔ شور ۔ کراہنے کی آوازیں]

آرفیوسس :- کتنا خوفناک نشیب ہے۔ اس میں انگاروں پر روحیں ریٹک رہی ہیں۔ چیخ رہی ہیں۔ انہیں بچھو اور سانپ ڈس رہے ہیں۔ میں یہاں کیوں چلا آیا؟ یورشیا کہاں ہے؟

[کہیں قریب ہی سے کراہنے کی آواز آتی ہے]

آرفیوسس :- یہ کس کے کراہنے کی آواز ہے؟ یہ تو میری محبت ہی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس آواز کو پہچانتے میں میں کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔ یہ کس کی روح چٹان کے ساتھ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے؟ کون ہے؟ یہ کون ہے؟ یورشیا۔ میری اپنی یورشیا۔

یورشیا :- (کراہتے ہوئے) زندگی کے کناروں سے مجھے کون بلارہا ہے؟ کہاں ہے؟ گدھر ہے؟ یہ کون آ رہا ہے؟ کیوں آ رہا ہے؟ یہ ہوائیں میرے کانوں میں چپکے چپکے کیا کہہ رہی ہیں؟

آرفیوسس :- یورشیا۔ یورشیا۔

یورشیا :- آرفیوسس۔ آرفیوسس۔

آرفیوسس :- (دگلوگیر آواز میں) زندگی کے ویرانے میں تم مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی آئی ہو؟

یورشیا :- قسمت میں ہی لکھا تھا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ منجوس ستاروں نے ایک کھیل کھیلا تھا۔

آرفیوسس :- (روتے ہوئے) یورشیا۔ میری اپنی یورشیا۔

یورشیا :- تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔ میں اس عذاب کو

بھول گئی ہوں۔ ان بھڑکتے ہوئے شعلوں میں اب مجھے ٹھنڈک محسوس ہونے لگی ہے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ اس سے پہلے کہ تم چلے جاؤ مجھے اپنے آغوش میں سو لینے دو۔

آر فیوسس :- گھبراؤ نہیں یوریشیا میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ میں تمہیں اپنے ساتھ اُسی دنیا میں لے جاؤں گا جسے تم چھوڑ کر آئی ہو۔

یوریشیا :- وہ کیسے ؟
آر فیوسس :- میں نے تمہاری محبت میں زندگی اور موت کے دیوتاؤں کو بھی تسخیر کر لیا ہے۔ اب میں ان شعلوں کو تسخیر کروں گا۔

یوریشیا :- کیا تم ابھی زندہ ہو؟

آر فیوسس :- ہاں میں زندہ ہوں۔

یوریشیا :- زندہ انسان تو یہاں نہیں آسکتے۔

آر فیوسس :- یہ سب تمہاری محبت کا کرشمہ ہے۔ جو مجھے کوہ اولمپس پر

لے گئی۔ زیئوس دیوتا کے دربار میں لے گئی۔ اور اب یہاں لے آئی

ہے۔ میرے برہم کا آخری گیت آج ان شعلوں سے جہنم لے گا۔ اور یہ

شعلے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں گے۔ آج میں جہنم کی آگ کو سرد

کر دوں گا۔

[برہم کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ پروں کی پھر پھر اہٹ
دیوتا نے جہنم پلوٹو کی آواز بھڑکتے ہوئے شعلوں
میں گونجتی ہے۔]

پلوٹو :- آر فیسس - ہمارے معزز مہمان - اولمپس کے جادو اثر بربط لوار -
بند کرو - اپنے ساز کی آواز کو بند کرو - جہنم کی آگ ٹھنڈی ہوتی جا رہی ہے -
شعلے خاموش ہوئے جاتے ہیں -

آر فیسس :- یہ کس کی آواز ہے ؟
پلوٹو :- تم ہاڈس کے دیوتا سے ہم کلام ہو -
آر فیسس :- میں آپ کو کیسے مل سکتا ہوں ؟
پلوٹو :- تمہیں ہم سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے - ہم مقدس زیٹوس کے
حکم کی تعمیل کرتے ہوئے تمہاری خواہش کو پورا کرتے ہیں - تم یوریشیا کو
لے جا سکتے ہو - لیکن ایک شرط پر -

آر فیسس :- وہ شرط کیا ہے ؟
پلوٹو :- کرہ ظلمت میں سفر کرتے ہوئے تم یوریشیا کے ساتھ کوئی بات
نہیں کرو گے - اور نہ ہی کچھ گھوم کر اُسے دیکھو گے - وہ اس سفر میں تم سے
علیحدہ رہے گی - یہ پابندی صرف کرہ ظلمت کے کنارے تک ہے -
آر فیسس :- مجھے منظور ہے یہ شرط -

پلوٹو :- ایک بار پھر سوچ لو -
آر فیسس :- میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے -
پلوٹو :- تم یوریشیا کو لے جا سکتے ہو -
آر فیسس :- ہمارے جانے کا راستہ کونسا ہوگا ؟
پلوٹو :- تم جہاں قدم رکھو گے وہیں راستہ بن جائے گا - یہ اعزاز فقط

تمہاری ذات کے لئے ہے۔

[وقفہ]

آرفیو سس :- پھر وہی کرہ ظلمت کے اندھیرے۔ سناٹے۔ کوئی آواز نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے صبح ہونے والی ہے۔ اور دھرتی کا کنارہ بھی قریب آگیا ہے۔ جہاں پہنچ کر میں یورشیا کے ساتھ بول سکوں گا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ چل سکیں گے۔ مگر میرا دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے؟ یہ کس کی منحوس آواز میرے کانوں میں آرہی ہے؟ یہ کون ہے جو مجھے کہہ رہا ہے آرفیو سس تمہیں دھوکہ دیا گیا ہے۔ اولمپس اور ہاڈس کے دیوتاؤں نے تمہارا مذاق اڑایا ہے۔ یورشیا تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اب اس کے قدموں کی چاپ بھی تو سنائی نہیں دیتی۔ یورشیا سی خوبصورت عورت کے لئے مجھے دھوکہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ ایک بار مجھے پیچھے گھوم کر ضرور دیکھ لینا چاہئے۔ تاکہ دیوتاؤں کی سچائی کا پول کھل جائے۔ اب مجھے دیر نہ کرنی چاہئے

[پیچھے گھوم کر اندھیروں میں جھینکتا ہے۔ پیچھ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ پھینکارتی ہوئی ہواؤں کی]

سرسراہٹ۔

یورشیا :- یہ تم نے کیا کر دیا۔ آرفیو سس یہ تم نے کیا کر دیا۔ دیوتاؤں کی شرط کا تم نے کچھ خیال نہ کیا۔ اب ہم آپس میں کبھی نہ مل سکیں گے۔ منزل کے قریب آکر منزل سے بہت دور ہو گئے ہو تم۔ تمہاری بے چینی و بے صبری نے

اس چیز کو گنوا دیا جسے تم نے بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔
(یوریشیا کی آواز دور مٹتی چلی جاتی ہے) الوداع - آرفیو سس الوداع -

[کرہ ظلمت کے اندھیروں میں سریلی آوازوں کا طوفان
سا اٹھتا ہے۔ جس میں آرفیو سس کی آوازیں گونجتی ہیں۔]

آرفیو سس :- یوریشیا - یوریشیا - یوریشیا

[آرفیو سس کی آوازیں رفتہ رفتہ مدھم ہوتی جاتی ہیں۔
کرہ ظلمت کے اندھیرے اور گہرے ہو جاتے ہیں۔]

ساتواں منظر

[کوہ اولپس کی برفانی بلندیاں]

[برفانی آندھی بدستور چل رہی ہے۔ بلندیوں سے
لڑھکتے ہوئے برفانی تودوں اور پتھروں کے
دہماکے۔ غار کے دہانے پر ایک پتھر آکر گرتا ہے۔
جس کے دہماکے سے آرفیو سس چونک جاتا ہے۔]

آرفیو سس :- کتنا بھیانک خواب دیکھا ہے میں نے۔ اور جو کچھ دیکھا
ہے حقیقت سے اُسے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ تو وہی غار ہے جہاں کہ میں
یہ خواب دیکھنے سے پہلے تھا۔ طوفان اپنی زندگی کی ساری قوتیں صرف کر
رہا ہے۔ زیئوس دیوتا کا دربار۔ کرہ ظلمت۔ جہنم۔ بھڑکتے ہوئے
شعلے اور ان میں مبتلائے عذاب روحیں ایک خواب کے سوا کچھ کبھی نہیں۔

ایک دھوکے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور زندگی بھی سب سے بڑا دھوکہ ہے۔
اب میں کوئی دھوکہ نہیں کھاؤں گا۔ مجھے کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ میری
منزل میرے سامنے ہے۔ طوفان چلتا ہے تو چلتا رہے مجھے اس کی کچھ
پر واہ نہیں۔ محبت کے مسدک میں طوفان کے گزر جانے کا انتظار کرنا
روا نہیں۔ اس میں کود جانے کا وقت تو وہ ہے جبکہ طوفان اپنے
عروج پر ہو۔

[بربط بجاتے ہوئے غار سے باہر نکل جاتا ہے۔]
[آندھی کا شور۔ دھماکے۔]

جادو

اداکار

سریش

ریتا

منگو دادا

فلمساز

پتواری

کمپاؤڈر

ہدایت کار

مکالمہ نویس

عکاس

ایکسٹراٹرکیاں اور دوسری آوازیں۔

- ۱۔ ایکسٹرا لڑکی کی ۔۔۔ اسے بس اب جانے بھی دو۔ جمائیاں ہی لیتی جاؤ گی۔
- ۲۔ ایکسٹرا لڑکی کی ۔۔۔ میں رات بھر جاگتی رہی ہوں۔
- ۱۔ ۔۔۔ جبھی تمہارے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔
- ۲۔ ۔۔۔ میں نے آج میک اپ نہیں کیا۔
- ۱۔ ۔۔۔ کر لیتیں۔
- ۲۔ ۔۔۔ فرصت ہی نہیں ملی۔
- ۱۔ ۔۔۔ اتنا مصروف رہتی ہوں تم۔
- ۲۔ ۔۔۔ اور جب بیکار دن بیکار راتیں شروع ہوتی ہیں تو ختم ہونے میں نہیں آتیں۔
- ۱۔ ۔۔۔ دادا سے معلوم تو کیا ہوتا سیٹھ جی کیا کر رہے ہیں؟
- ۲۔ ۔۔۔ کوئی کتاب پڑھ رہے ہیں۔
- ۱۔ ۔۔۔ اور ہمیں کب پڑھیں گے؟
- ۲۔ ۔۔۔ وہ پرانی کتابیں نہیں پڑھا کرتے۔
- ۱۔ ۔۔۔ (تھکا ہوا سانس لیتے ہوئے) صبح سے شام ہو جاتی ہے اور سیٹھ جی کو ایکسٹرا لڑکیوں کے چناؤ کی فرصت ہی نہیں ملتی۔
- ۲۔ ۔۔۔ بڑے آدمی جو ہوئے۔ چھوٹی باتوں کی طرف کم دھیان دیتے ہیں۔

ع۱ :- مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ صبح ایک پیالی چائے پی کر
آئی تھی۔

ع۲ :- کچھ کھالیا ہوتا۔

ع۳ :- یہاں تو تو سبھی دو آنے میں ملتا ہے۔

ع۴ :- اور چائے کی پیالی چار آنے میں۔

ع۵ :- میری جیب میں تو چھ آنے ہیں۔ صرف بس کا کرایہ۔

ع۶ :- ٹرام میں تو چھ پیسے لگیں گے۔

ع۷ :- سیٹھ جی نہ جانے کب دفتر سے باہر آئیں گے۔ نہ جانے کب

چٹاؤ ہوگا۔ نہ جانے کب ختم ہونگی انتظار کی یہ لمبی گھڑیاں۔

ع۸ :- بس ختم ہوگئی۔ سیٹھ جی دفتر سے نکل آئے ہیں۔ ہنس ہنس کر

باتیں کر رہے ہیں۔ اچھے موڈ میں ہیں۔

ع۹ :- لپک کر چلو دادا نے اشارے سے بلایا ہے۔

[فلمساز سیٹھ ایکسٹرا سپلائر منگو دادا کے ساتھ
باتیں کرتا آ رہا ہے۔]

فلمساز :- کالے پیرے۔ پیلے پیرے۔ چتکبرے چرے۔ کوبرا بوٹ

پالش۔ سوکھے ہوئے پتے۔ دھوپ چھاؤں۔ اندھیرا

اجالا۔ ان چہروں کے یہی نام رکھے جاسکتے ہیں منگو دادا۔

منگو :- جی سیٹھ جی۔

فلمساز :- جب سے ایکسٹرا سپلائر بنے ہو کبھی کوئی سکرین فیس نہیں

دکھایا تم نے۔ جس میں زندگی ناپ چ رہی ہو۔ گنگنا رہی ہو۔
جوانی کے شوخ رنگوں سے کھیل رہی ہو۔

منگو :- اچھا سیٹھ جی دکھاؤں گا۔

فلمساز :- ہے کوئی ایسا ماڈل تمہارے پاس ؟

منگو :- ہاں ہے۔

فلمساز :- کیا نام ہے اس کا ؟

منگو :- ریتا

فلمساز :- کیا عمر ہے اس کی ؟

منگو :- یہی سولہ سترہ سال۔

فلمساز :- روپ رنگ

منگو :- گورا

فلمساز :- قد کاٹھ

منگو :- بوٹا سا

فلمساز :- ڈریل ڈول

منگو :- سانچے میں ڈھلا ہوا۔

فلمساز :- خدو خال۔

منگو :- بڑے تیکھے ہو بہو چینی کی گڑیا۔

فلمساز :- پڑھی لکھی ہے ؟

منگو :- ہاں پڑھی لکھی ہے۔

فلمساز :- آواز کیسی ہے اس کی ؟

منگو :- بڑی سریلی

فلمساز :- ناچ سکتی ہے ؟

منگو :- جی وہ بڑا اچھا ناچتی ہے۔

فلمساز :- کیا سچ

منگو :- اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں سیٹھ جی۔

فلمساز :- اس کا باپ کیا کام کرتا ہے ؟

منگو :- پیٹر ہے۔ بچارا دو سال سے بیمار ہے۔ بڑی مشکل سے

گزر بسر ہوتی ہے۔

فلمساز :- اور کوئی اولاد نہیں ہے اس کی ؟

منگو :- نہیں ریتا اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔

فلمساز :- کسی وقت ریتا کو یہاں لاؤ۔

منگو :- ضرور لاؤں گا۔ سواری کا انتظام کر دیں۔

فلمساز :- کر دیں گے۔ تم ایک بات تو بتاؤ۔

منگو :- جی فرماؤ

فلمساز :- ریتا کا باپ اس کام میں اس کی مخالفت تو نہ کرے گا ؟

منگو :- نہیں سیٹھ جی۔ وہ تو چاہتا ہے ریتا کو جلدی سے کہیں نوکری مل

جائے اور اس کے کمزور کندھوں کا بوجھ ٹلے۔

فلمساز :- بس تو پھر ریتا کو کسی وقت یہاں ضرور لاؤ۔

منگو :- میرا انعام تو سیٹھ جی ادھر سرکاؤ۔

فلمساز :- انعام ضرور ملے گا تم یہ کام تو کرو۔

منگو :- ایک بات کہوں سیٹھ جی

فلمساز :- کہو دادا

منگو :- اب میں بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ ایکسٹرالٹ کے لڑکیوں کا ریوٹر

یہاں تک ہانک کر لانے کی طاقت نہیں رہی۔ اب تو آپ پُچھنا

کریں۔

فلمساز :- بتاؤ کیا کریں۔

منگو :- اب میری نیشن لگا دیں۔

فلمساز :- لگا دیں گے۔ دعا کرو یہ پکچر ہٹ ہو جائے۔ گولڈن جوبلی کرے۔

منگو :- خدا کرے۔ خدا کرے۔ لاؤ سیٹھ جی اب کچھ دو۔ مجھے کھانا

ہے۔ رادیو چولہا گرم کئے بیٹھی ہو گی۔ کہتی تھی آج میٹھے

چاول پکانے ہیں۔

فلمساز :- جادو میرا نام لے کر منشی جی سے لے لو۔

منگو :- کتنے لوں؟

فلمساز :- بیس روپے

منگو :- نہیں سیٹھ جی کم سے کم تیس روپے

فلمساز :- اچھا جاؤ۔ سے لو۔

منگو :- کلیان ہو۔ اُن دانا کا کلیان ہو۔

CHANGE OVER

[ہلکی ہلکی سیٹیاں]

ریتا :- بڑی سُرپلی سیٹیاں بجا رہے ہو سریش بابو۔ تاروں کو کہیں نیند نہ آجائے۔

سریش :- اتنی رات گئے کہاں سے آ رہی ہو ریتا ؟
ریتا :- سٹوڈیو سے۔

سریش :- شوٹنگ دیکھ کر آئی ہو ؟
ریتا :- سیٹھ کو نئی فلم کے لئے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ منگو دادا
قسمت آزمانے کے لئے مجھے وہاں پھینچ کھا پینچ کر لے
گئے تھے۔

سریش :- کیا ہرج ہے۔ قسمت کا زمانا ہی چاہئے۔
ریتا :- سیٹھ جی بڑے تپاک سے ملے۔ بڑا اچھا سنبھا ہے ان کا۔
لاکھوں پتی ہوتے ہوئے دولت کی ذرا بو نہیں ہے
اُن میں۔

سریش :- اچھا۔

ریتا :- ہاں مجھ سے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے ایک گیت سنایا۔
بانسری بجاتی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ چائے اور
سموسوں سے ہماری خاطر تواضع کی۔ ہم لوگ آنے لگے تو
سواری کا انتظام کر دیا۔

سریش :- اچھا -

ریتا :- ابھی ابھی ان کی کار ہمیں یہاں چھوڑ گئی ہے -

سریش :- دادا کہاں ہیں ؟

ریتا :- ان کے سر میں درد ہو رہا ہے چھینکیں مار رہے ہیں - کار سے

اترتے ہی اُدھر چل دیئے - میں نے آوازیں بھی دیں -

بوائے ہی نہیں -

سریش :- تمہارے بارے میں سیٹھ نے کیا کہا ؟

ریتا :- سوچ کر جواب دیں گے -

سریش :- تمہیں ایک بڑے مزے کی بات بتاؤں ریتا -

ریتا :- بتاؤ بابو -

سریش :- ایسے نہیں -

ریتا :- اور کیسے ؟

سریش :- اس پنج پر بیٹھ جاؤ -

ریتا :- لو بیٹھ گئی -

سریش :- آج میرے اندر سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا ہے اور میں سو گیا ہوں -

ریتا :- (دھنس کے) یہ کیا بات کہی ؟

سریش :- تمہاری بانسری کے گیت میرے اندر شاعر بن کر جاگ اٹھے ہیں -

رات کی تنہائیوں میں تمہاری بانسری کی تانیں سن سن کر میرے

اندر بھی رنگ رس کی ایک تان رنگ اٹھی ہے جس کا ہر سر

تمہارے بالوں میں لگے ہوئے اس گلاب کی طرح
لگا ہے۔

ریتا :- (متبسم لہجہ میں) جی بھی آج تمہاری آواز سے بھی مہک آرہی ہے۔ پہلے
سے کچھ بد سے بد لے معلوم ہوتے ہو۔

سریش :- تم ٹھیک کہتی ہو۔ آج میں پہلے سے کچھ بد لا ہوا ہوں۔ آج کا یہ پڑ
مجھے بہت بُرا معلوم ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج یہ مجھے بڑا اچھا
معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے یہ جہاں ہے بہت ٹھیک ہے۔
اسے یہیں ہونا چاہئے تھا۔

ریتا :- انسان بدلتا ہے تو اس کی ہر چیز بدل جاتی ہے۔ وہ اپنے گزرے
ہوئے زمانے سے نیا جنم لیتا ہے۔

سریش :- ہاں۔ آج میں نے اپنے گزرے ہوئے زمانے سے نیا جنم لیا ہے
آج میں وہ نہیں ہوں جو کہ میں تھا۔ اس سے پہلے جو چیزیں
مجھے بہت دور نظر آیا کرتی تھیں۔ آج بہت قریب نظر آرہی
ہیں۔ اس سے پہلے میں جن چیزوں سے بہت دور رہا کرتا
تھا آج ان کے بڑا قریب آگیا ہوں۔ وہ فاصلے مٹ گئے
ہیں۔ ریتا۔

ریتا :- بابو

سریش :- اب میں گیتوں بھرنی ایک کہانی لکھوں گا۔ گیتوں بھرا ایک روپک۔

ریتا :- اچھا

سریش :- ہاں۔ اور تم اُس گیتوں بھرے روپک کی رانی ہو گی۔ تم نے میرے اندر سوئے ہوئے شاعر کو جگا یا ہے۔ تم نے مجھے گیت لکھنے سکھائے ہیں۔ اس سے پہلے میں فقط ایک اداکار تھا۔ ایک بد نصیب اداکار۔ بچھا ہوا چاند۔ جو شاید پھر نہیں چمکے گا۔ اب اُسے چمکنا بھی نہیں چاہئے۔ جس دنیا میں لوگ صرف دیوؤں کی روشنی میں زندہ رہنا چاہتے ہوں وہاں چاند کی ضرورت نہیں۔

ریتا :- یہ گیتوں بھری کہانی مکمل کب ہو گی ؟
سریش :- اسے مکمل کرنے کے لئے مجھے تم سے کچھ لینا ہے۔
ریتا :- کیا لینا ہے تم نے مجھ سے بالو ؟
سریش :- تمہارے ہونٹوں کی ہنسی۔ آنکھوں کا جادو۔ آواز کا رس۔
ریتا :- اس سے کیا ہو گا ؟
سریش :- اس کے بغیر یہ روپک کوئی روپ نہیں دھار سکے گا۔ اس کی کوئی مشکل نہیں بن سکتی۔

ریتا :- یہ روپک کھینچا کہاں جائے گا ؟
سریش :- زندگی کی سٹیج پر۔
ریتا :- کب کھینچا جائے گا ؟
سریش :- جب تمہاری آواز کی ملہاروں کی گھنگھور گھٹائیں اُمد گھمڑ کر اٹھیں گی اور ان سے میرے گیتوں کی برکھا ہو گی ابھی تو پہلی بوند پڑی

ہے۔ آج میں نے پہلا گیت لکھا ہے۔

ریتیا :- کیا گیت لکھا ہے تم نے؟ مجھے بھی سناؤ۔

سریش :- سناؤں گا۔ ضرور سناؤں گا۔

ریتیا :- کب؟

سریش :- جب تمہاری بانسری کی لے پر میرے من کا مورنا چمے گا اور

اس کے پردوں کے پیارے پیارے رنگوں کی دھنک

تمہاری آواز میں کھل جائے گی۔ جانتی ہو پھر کیا ہوگا؟

ریتیا :- کیا ہوگا؟

سریش :- دھرتی پر ایک نیا جادو جگائیں گے۔

ریتیا :- کون؟

سریش :- میرے گیت۔ تمہاری آواز۔ پھر شاید ہماری وہ تمنا پوری ہو

جائے جو اب تک پوری نہیں ہوئی۔ میرا گیت سن کر دادا

نے نجوم لگایا ہے۔

ریتیا :- کیا نجوم لگایا ہے؟

سریش :- دادا کہتے ہیں وہ وقت اب دور نہیں جبکہ دولت اور شہرت

ہمارے قدم چومے گی۔ ہماری قسمت کے بجھے ہوئے

ستارے چمک اٹھیں گے۔

[یکدم کھا نسنے لگتا ہے۔ کراہتا ہے]

ریتیا :- (کسی قدر پریشانی میں) کیسا ہے بابو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟ سینے کو دبا کر

کھانٹتے کھانٹتے لوٹ پوٹ کیوں ہونے لگے ؟

سریش :- (اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے) مجھے کھانسی کی شکایت ہے۔
تم اس کا کچھ خیال نہ کر دیتا۔

ریتا :- تم یکدم پیسے پڑ گئے ہو بابو۔ معلوم ہوتا ہے سخت تکلیف میں
ہو۔ مگر اپنی تکلیف چھپا رہے ہو۔

سریش :- نہیں ریتا نہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ تم اتنا پریشان کیوں ہو
رہی ہو۔ جاؤ اب آرام کرو۔ رات کافی ڈھل چکی ہے۔ میں
بھی اب آرام کروں گا۔

CHANGE OVER

ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے

منگو :- سو گئے سیٹھ جی ؟

فلمساز :- نہیں آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا ہوں۔

منگو :- آپ کا ٹیلیفون آیا ہے۔ گھنٹی بج رہی ہے۔

فلمساز :- بچنے دو۔ میں اس وقت کسی سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ اس
وقت میرے خیالوں میں نئی پکیر کا کلائی میکس گھوم رہا ہے۔

منگو :- وہ کیا ہوتا ہے سیٹھ جی ؟

فلمساز :- کہانی کی جان۔

منگو :- کہانی میں بھی جان ہوتی ہے سیٹھ جی ؟

فلمساز :- ارے دادا تم نہیں سمجھتے اس بات کو۔

منگو :- سمجھا دونا سیٹھ جی -

فلمساز :- یہ تمہارے سمجھنے کی بات نہیں۔ آرام سے یہاں بیٹھ جاؤ اور کوئی فلمی کہانی سناؤ۔ بڑی اچھی سی -

منگو :- میں اس وقت موڈ میں نہیں ہوں سیٹھ جی -

فلمساز :- جلدی سے موڈ بناؤ -

منگو :- پیسے سیٹھ جی گرم گرم چائے پلاؤ۔ رس گلے کھلاؤ۔ پھر اس پنجرے کی بلبل بولے گی -

فلمساز :- یہاں تو دل ہوتا ہے دادا -

منگو :- خدا جانے یہاں کیا کیا ہے سیٹھ جی - پر میں تو اس کو بلبل بولتا

ہوں - موڈ میں ہو تو بڑی بولیاں بولتا ہے - بڑا اچھکتا ہے -

بڑا اچھکتا ہے - بڑا غل غپاڑہ کرتا ہے - چھوڑیئے اس

کتنی کہانی کو - میں بیرے کو بلاتا ہوں جلدی سے چائے کا

بولے - اس کے بنا تو اپنی زندگی بس بڑی بے چین ہوتی ہے -

فلمساز :- چائے کا وقت ہو چکا ہے - بیرہ آنے ہی والا ہے -

منگو :- سیٹھ جی ایک بڑا اچھا گیت کار ہے اپنے پاس - بڑے

اچھے گیت لکھتا ہے - کہانیاں لکھتا ہے - بڑا ہی پھیل پھیل

نوجوان ہے - ایسا ہیرو بھی نہیں دیکھا ہوگا آپ نے -

فلمساز :- کیا حلیہ ہے اس کا ؟

منگو :- یہ رہی اس کی تصویر -

فلمساز :- اوہ یہ۔ میں نے اسے پہلے بھی گول مار کیٹ میں دیکھا ہے۔
مشتبہ آدمی ہے۔

منگو :- کیوں سیٹھ جی کیا بات ہے؟
فلمساز :- یہ بجلی کے کھمبے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ سگریٹ پی رہا تھا۔
آسمان میں گھومتے ہوئے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔
منگو :- یہ اس کی عادت ہے۔ بادل نہیں ہوتے تو یہ ستاروں کو دیکھا
کرتا ہے۔ ستارے نہیں ہوتے تو یہ خالی آسمان کو دیکھتا
رہتا ہے۔

فلمساز :- مجھے اس پر شک ہے۔
منگو :- شک کیسا سیٹھ جی؟
فلمساز :- میں کچھ چیزیں خریدتا ہوا کھمبے کے پاس سے گزرا تو مجھے یوں
محسوس ہوا جیسے میری جیب سے کوئی تیز سی چیز چھو گئی ہے۔
منگو :- پھر آپ نے کیا کیا سیٹھ جی؟

فلمساز :- میں نے جلدی سے اپنی جیب کو ٹٹولا۔ گھوم کر پچھلی طرف دیکھا۔
یہ نوجوان تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے بس سٹاپ کی طرف
جا رہا تھا۔ میں نے اس بات پر کچھ غور نہ کیا۔ امد جلدی میں
آگے نکل گیا۔

منگو :- پھر کیا ہوا سیٹھ جی؟
فلمساز :- اگلی دکان پر مجھے ایک گھڑی بہت پسند آئی۔ قیمت طے کی۔ پٹوہ

نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب کٹ چکی تھی۔
بٹوہ غائب تھا۔

منگو :- ادو

فلمساز :- یہاں سے یہاں تک کھڑکی سی بنی ہوئی تھی جیب میں۔

منگو :- کوئی تھا اس کھڑکی میں؟

فلمساز :- ہوا کے جھونکے آ جا رہے تھے۔

منگو :- روپیہ کتنا تھا بٹوے میں؟

فلمساز :- پانچ ہزار روپیہ۔

منگو :- باپ رے باپ۔ پانچ ہزار روپیہ۔ میرا تو سارا پنجر ہل گیا ہے

سیٹھ جی۔ پانچ پٹاخے سے چلے ہیں یہاں دل کے پاس۔

فلمساز :- یہ مجھے جیب کترا معدوم ہوتا ہے۔

منگو :- نہیں سیٹھ جی نہیں۔ یہ بڑا شریف ہے۔ قسمت بری سہی آدمی بڑا

نہیں۔ بڑا اونچا فنکار ہے۔ فلم انڈسٹری والوں نے اسے

پہچانا نہیں۔ بیچارے کو کسی نے کوئی چانس نہیں دیا۔

فلمساز :- یہ کہاں رہتا ہے؟

منگو :- ریتا کے پڑوس میں۔

فلمساز :- تم اس کی حمایت کیوں کرتے ہو؟

منگو :- اپنا برخوردار جو ہوا۔ بڑی عزت کرتا ہے۔ جب کوئی گیت لکھتا

ہے سب سے پہلے مجھے سناتا ہے۔ پرموں رات اس نے

اپنا ایک گیت سنایا۔ میرا دل بھرا آیا۔ میں رونے لگا یہ بھی
میرے ساتھ رونے لگا۔ دادی چھالیاں کتر رہی تھتی۔ میرے
آنسو دیکھ کر وہ بھی رونے لگی۔ اوپر سے ریتا آگئی۔ ہم سب
کو روتے دیکھ کر اُس نے بھی رونا شروع کر دیا۔

فلمساز :- (ہنستے ہوئے) بھٹی داد۔ کیا خوب تماشہ دکایا تم لوگوں نے۔
منگو :- اس بیچارے کو کہیں کام مل جائے تو اچھا ہے۔ پر دسی ہے۔
صدموں نے بیمار کر رکھا ہے۔ میں فلمی سیٹھوں کو اس کی یہ
تصویر دکھاتا رہتا ہوں۔ کسی کے دل میں تو رحم آئے گا ہی۔
فلمساز :- کوشش کرے انسان تو کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔

منگو :- سیٹھ جی اسے اپنی پکچر میں ضرور کام دیں۔

فلمساز :- اچھا دادا سوچیں گے۔ لو بیرہ چائے لے آیا۔ اب تم چکے
سے مزے مزے چائے پیو۔ میں کلائی میکس پر غور کرتا
ہوں۔

CHANGE OVER

ریتا :- سریش بابو۔ سریش بابو۔ ادہ۔ ابھی تک سو رہے ہو۔ سورج
کتنا چڑھ آیا۔ اٹھو۔ جاگو بابو۔

سریش :- (چونک کر) کون۔ ریتا۔ (جھائی لیتے ہوئے) کتنا سہانا دن ہے۔
ریتا :- نیند میں کس سے باتیں کر رہے تھے؟
سریش :- یونہی بڑبڑا رہا تھا۔

ریتا :- رات سے بابا کو بڑی تکلیف ہو گئی ہے۔ پھر فالج کا ایک ہوا ہے۔
پتھر بنے پڑے ہیں۔

سریش :- یہ تو بڑے افسوس کی بات سنائی تم نے۔

ریتا :- رات بھر میں ان کے چہرے پر مردنی چھا گئی ہے۔ بول نہیں سکتے۔
اشاروں سے بات کرتے ہیں۔ معلوم نہیں سانس کیسے
لے رہے ہیں۔ نبض کیسے چل رہی ہے۔

درو تے ہوئے ان کی یہ حالت دیکھ کر نمی کو غش پر غش
آ رہے ہیں۔ موسیٰ سیمار ورد کے منڈھال ہو رہی ہیں۔ گھر
میں ہمارے تو قیامت آگئی ہے۔

سریش :- ایسی حالت میں انہیں فوراً ہسپتال پہنچانا چاہیئے۔

ریتا :- ہسپتال فون کیا تھا۔ ابھی کوئی بیڈ خالی نہیں ہے۔ ایک دو دن
انتظار کرنا پڑے گا۔

سریش :- تو پھر انہیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانا ہوگا۔ ہسپتال میں داخلہ
ملنے تک انہیں مناسب طبی امداد ملنی چاہیئے۔

ریتا :- ڈاکٹر کو بلا دیا تھا۔ وہ بہت سی قیمتی دوائیں اور انجکشن تجویز کر گیا ہے۔
کم سے کم دو سو روپے ہوں تو کام چلے۔

سریش :- فکر نہ کرو ریتا۔ روپے میں کہیں نہ کہیں سے تمہارے لئے
حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ریتا :- تم بھی بیمار ہو جاؤ۔ کہاں پریشان ہوتے پھر دو گے۔ تمہارے حالات

بھی کچھ ایسے ہی ہیں۔ آرام کرو۔

سریش :- آرام اپنی قسمت میں نہیں ہے ریتا۔ میں چاہتا ہوں تمہیں ہی آرام ملے
ریتا :- تم نے اب تک مجھے آرام ہی دیا ہے بابو۔ بڑا آرام۔ مجھے ہر طرح
خوش رکھا ہے۔ ہر دکان میں میرا ساتھ دیا ہے۔ مجھے تم
اپنی داسی سمجھو۔

سریش :- نہیں۔ نہیں۔ تم میرے گیتوں بھرے روپک کی رانی ہو میری
گیت مالا کا سب سے پیارا گیت۔

ریتا :- تم ذرا بابا کا خیال رکھنا بابو۔ میں دادا کے ساتھ سٹوڈیو تک
جا رہی ہوں۔ شاید آج کنٹرکٹ ہو جائے اور سیٹھ سے
ایڈوانس مل جائے۔ دادا نے یہ مشورہ دیا ہے۔

[باہر سے منگو دادا کی آواز آتی ہے]

منگو :- اب آ بھی جاؤ ریتا۔ باتیں بہت ہو چکیں۔ دیر ہو رہی ہے۔
ریتا :- آرہی ہوں۔ دادا میں آرہی ہوں۔

سریش :- آج میرے پاس کمرے میں نہیں آئے دادا۔ خفا ہیں مجھ سے؟
ریتا :- خفا کیوں ہونا ہے۔

سریش :- پھر کیا بات ہے؟

ریتا :- اپنی دھن میں رکھنا والے کے ساتھ میری ٹھکی کی نوچندی کی باتیں کر
رہے ہیں۔ چکوری پواٹرن کے سانچے پان کا چسکا لے
رہے ہیں۔

سریش :- اچھا اچھا۔ پانوں کے تو بڑے رسیا ہیں دادا۔
ریتا :- لو بابو اب میں جاتی ہوں۔

وقف

سریش :- (لمبا سانس لیتے ہوئے) ریتا کو روپے کی ضرورت ہے۔ اور
اپنی جیب کئی دنوں سے خالی ہے۔ پانچ ہزار کے ہنستے
اور روتے ہوئے نوٹ ختم ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر نے میری
حالت بھی تشویشناک بتائی ہے۔ اگر یہ دوائیں کارگر نہ ہوئیں
تو انجکشن لگیں گے۔ جن کے لئے مجھے بھی روپے کی سخت
ضرورت ہوگی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا کرنا ہے۔
میرے اندر جاگے ہوئے شاعر اور اداکار نے مجھے بالکل
بیکار کر دیا ہے۔ یہ مجھے اپنا دھندا بھی نہیں کرنے دیتے۔
میں گیتوں کی بھول بھلیاں میں کھو گیا ہوں۔ ڈاکٹر کی ڈسپنسری
نے میری زندگی کا دامن اس مقبوطی سے پکڑا ہوا ہے کہ میں
اپنی مرضی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔
پس منظر میں موسیقی کی آوازیں آہستہ آہستہ
اُبھرتی ہیں۔

سریش :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ
گیت کیوں لکھے جا رہا ہوں۔ گیتوں بھری کہانی تو مکمل ہو چکی
ہے۔ مگر وہ اسٹیج کہاں ہے جہاں یہ کہانی کھیل جائے گی؟

کچھ پتہ نہیں۔ کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو معلوم نہیں یہ اندھیرے
کب ختم ہوں گے؟ کہاں ختم ہوں گے؟ اجالا کیوں نہیں
ہوتا؟ کوئی نہیں بتا سکتا۔ کوئی نہیں سمجھا سکتا۔ اب مجھے
کیا کرنا ہے؟ کدھر جانا ہے؟ میری منزل کہاں ہے؟
میری منزل۔

[موسیقی]

سرسبز :- یہ میرا دم کیوں گھٹنے لگا ہے؟ دل کی دھڑکن دھیمی کیوں پڑتی
جا رہی ہے؟ شاید اس لئے کہ ریتا کو گیت نہیں روپے
چاہتیں۔ وہ ایک دھن دان اپنے باپ کی زندگی کی بھیک
مانگنے گئی ہے۔ کیا میں خاموش بیٹھا یہ سب کچھ دیکھتا
رہوں گا اور گیت لکھ رہوں گا؟ نہیں۔ بالکل نہیں۔ ایسا
ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ میں ان گیتوں کو بیچ ڈالوں گا۔ آج نیلام
اٹھے گا ان کا۔ ان کا سودا کر کے مجھے ریتا کے لئے روپے
حاصل کرنے ہیں۔

CHANGE OVER

[شوٹنگ ہو رہی ہے۔ سٹوڈیو میں کام کرنے
والوں کی ٹی جلی آوازیں۔]

ہدایت کار :- پنچس کدھر ہے؟
مکالمہ نویس :- اسی پنچرے میں ہوں۔ مکالمے درست کر رہا ہوں۔

ہدایت کار :- تم بالکل بندل ہو۔

مکالمہ نویس :- بوگس تو نہیں ہوں۔

ہدایت کار :- پورا پانچ ہزار دیا ہے تم کو اس کچر کا۔ جلدی سے یہ ڈائلاگ بدلو نہیں تو تمہارا اُعلیہ بدل دیا جائے گا۔

(ہنستا ہے)

مکالمہ نویس :- اُعلیہ تو اپنا سر گھڑی بدلتا رہتا ہے۔ زندگی بدسننے کی بات کہو۔

ہدایت کار :- باتیں نہ کرو ڈیڑ پچھی۔ کام کرو کام۔ جلدی سے ایک چھوٹا سا ڈائلاگ دو۔

مکالمہ نویس :- کس سائز اور سترنگتھ کا؟

ہدایت کار :- سائز میں تمہاری ناک سے لمبا نہ ہو اور سترنگتھ ہو اس میں ایتھم کی۔ بس دو تین الفاظ۔ بڑے آسان سے۔

مکالمہ نویس :- سائز تو اپنا بڑی مشکل سے نکل رہا ہے۔ مکالمے آسان کیسے لکھیں گے۔

ہدایت کار :- لائٹس آن۔

عکاس :- سولہ یہاں لو۔

ہدایت کار :- بی بی مود کرو۔ ذرا اور۔ ذرا اور۔ بس ٹھیک ہے۔

عکاس :- فیس لائٹ کو ذرا سو فٹ کرو۔

ہدایت کار :- نمبر چار پر شیڈ دو۔ یہ شیڈ ہٹا لو۔

عکاس :- پنجنہ ادھر لاؤ۔

ہدایت کار :- نمبر سولہ میں کپڑے کا ڈفیوزر دو۔

عکاس :- بیس نمبر آن کر دو۔

ہدایت کار :- ویٹ کو اوپر لو۔

عکاس :- نہیں صاحب نہیں۔ اتنا اوپر سے ایک لائٹ دے گا تو کچر

ڈارک ہو جائے گا۔ کچر جیٹرنہ ہوگا۔ کم سے کم دو سپاٹ۔

تین بے بیز۔ یہ کچر کا لاسٹ شاٹ ہے۔ کلائی میکس۔

کوئی پکٹوریل الفیلٹ۔ ڈائریکٹوریل پٹج۔

ہدایت کار :- اوپس۔ ویری گڈ درکر۔

عکاس :- فل لائٹس۔

ہدایت کار :- فوکس۔

عکاس :- پانچ فٹ گیارہ اینچ۔

ہدایت کار :- (ذرا اونچی آواز میں) ساؤنڈ ریڈی۔

عکاس :- ساؤنڈ ریہرسل۔

ہدایت کار :- فورہ ریہرسل۔

عکاس :- ریڈی فارٹیک۔

ہدایت کار :- ساؤنڈ ریڈی۔

[تقوڑی دور سے ساؤنڈ ٹرک سے دو سیٹیاں]
[بھتی ہیں]

ہدایت کار :- اد کے - او کے -

عکاس :- سائے لنٹ پلیس

ہدایت کار :- میک آپ ماسٹر - میڈام کو پینٹ کرد - اور دیکھو مسٹر ہیرو
کی ناک بہت چمک رہی ہے -

| فہتے |

عکاس :- سائے لنٹ پلیس - کیپ کوائٹ -

ہدایت کار :- کیمرو سٹارٹ -

عکاس :- کلیپ -

ہدایت کار :- کٹ - کٹ - مارلس - اب کچھ شاٹ بنا - اب ٹرالی

اور کہیں شاٹ ہوگا - اور پھر میک آپ -

مکالمہ نویس :- سیٹھ صاحب نے پوچھا ہے - جو گیت کار آیا ہے

اس کے گیت آپ نے سنے ہیں ؟

ہدایت کار :- سنیں ہیں ؟

مکالمہ نویس :- سیٹھ صاحب پوچھتے ہیں کیسے ہیں ؟

ہدایت کار :- یکدم بندل - فلم میں نہیں چل سکتے - بازار میں چل سکتے ہیں -

[بازار کا صوتی منظر - جیسے خوب گہما گہمی ہو رہی
ہے - ملی جلی آوازوں میں بانسری کی تانیں بھی رہ
رہ کر کوندے کی طرح لپک جاتی ہیں - تھوڑی دیر
میں ان آوازوں میں دبی دبی سسکیاں ابھرتی ہیں -]

اور سو جاتی ہیں۔ پھر یکدم ایک جھنکار سی گونجنی
ہے۔ جیسے کوئی بہت بڑا شیشہ گر کر ٹوٹ
گیا ہو۔

سریش :- (بجھی بجھی، زندگی سے خالی آوازیں) ٹوٹ گیا سپنوں کا شیشہ ٹوٹ

گیا۔ سپنے ریزہ ریزہ ہو کے بکھر گئے۔ گیت زخمی ہو گئے کتنی
تیز آندھی چلی ہے۔ شیشوں اور سپنوں کی دنیا میں کتنا ہولناک
زلزلہ آیا ہے۔ دھرتی سے کتنے تیز شعلے اٹھے ہیں۔ میری
گیتوں بھری کہانی جل گئی ہے۔ اس کے مرگھٹ سے دھواں
اٹھ رہا ہے۔ جس میں وہ سب کچھ اب دھندلا دھندلا نظر
آ رہا ہے جو اس سے پہلے صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ میرے
گیتوں بھرے روپک کی رانی سک سک کر سو
گئی ہے۔ مجھے آوازیں دیتے ہوئے ان اندھیروں میں کھو
گئی ہے۔ مگر میں کیا کروں یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اتنی
بڑی منڈی میں مجھے ان گیتوں کا کوئی بیوپاری نہیں ملا۔ یہ گیت
پسند نہیں کئے گئے۔ میری طرح میرے گیت بھی فلمسازوں
کی سمجھ میں نہیں آئے۔ انہیں کسی نے پسند نہیں کیا۔

[موسیقی]

سریش :- (تھکا ہوا سانس لیتے ہوئے) میں چلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا ہوں۔
اس پیڑ کے نیچے ذرا آرام کرنا چاہئے۔ یہ دن میری زندگی کا

کتنی سست رفتار اور اس دن ہے۔ میں چاہتا ہوں جلدی
سے رات ہو جائے۔ یہ سورج کچھ جائے۔ چاند تار سے بھی
آسمان میں نہ نکلیں۔ انہیں دیکھ کر میں جذباتی ہو جاتا ہوں میری
کئی کمزوریاں جاگ اٹھتی ہیں۔ لیکن آج مجھے پھر اپنی پوری طاقت
سے کام لینا ہے۔ آج میں نے اپنی سوگند کو توڑ دینا ہے۔
(پنواڑی آتا ہے)

پنواڑی :- بالو جی - بالو جی
سریش :- کیا بات ہے للو بھیا بڑے بے چین ہو رہے ہو؟
پنواڑی :- آج میرے پیسے دے دیں دکان کا کرایہ دینا ہے۔
سریش :- پیسے تو ابھی دو چار روز میں آئیں گے۔
پنواڑی :- نہیں بالو جی نہیں۔ آج میرا حساب صاف کر ہی دیں۔ میں نے
آگے حساب صاف کرنا ہے۔

سریش :- پیشے میرے پاس نہیں ہیں ہوتے تو ضرور دے دیتا للو بھیا۔
پنواڑی :- ہونے نہ ہونے کا للو ذمہ دار نہیں ہے بالو جی۔ مال دیا ہے۔
مفت نہیں مانگ رہا۔ پیسے تو میں لیکے ہی جاؤں گا۔
سریش :- تنگ نہ کرو بھیا۔ میں اس وقت بہت مجبور ہوں۔
پنواڑی :- اور للو بھی بہت مجبور ہے بالو جی۔ ایک تو منہ سے مار
دیا ہے۔ اوپر سے ادھار لینے والے تنگ کرتے ہیں للو
کہ صبر جائے۔

سریش :- بس دو چار دن اور صبر کرو۔ پیسے تمہیں مل ہی جائیں گے۔ کسی روز سے بیمار پڑا ہوں۔ آج اپنی مارکیٹ کا چکر لگاؤں گا۔
پنوارٹی :- ایک دو روز کی بات نہ کرو بابو جی۔ پیسے تو میں ابھی لے لیتا تمہاری شرافت کا خیال آتا ہے۔ دو تین گھنٹوں کی مہلت دیتا ہوں۔ ٹھیک پانچ بجے پھر آؤں گا۔ میرے پیسے تیار رکھنا۔

CUT

[دروازے پر دستک]

سریش :- کون ہے ؟
کمپاؤٹر :- ڈاکٹر صاحب کا کمپاؤٹر
سریش :- میں ابھی دروازہ کھولتا ہوں۔
کمپاؤٹر :- جلدی کھولے۔
سریش :- (دروازہ کھولتے ہوئے) آئیے۔ بیٹھئے۔
کمپاؤٹر :- میں بیٹھنے نہیں آیا۔ کھڑے کھڑے آپ سے دو باتیں کرنا ہیں۔
سریش :- جی کہئے۔
کمپاؤٹر :- ڈاکٹر صاحب نے یہ بل بھیجا ہے۔ اور کہنا بھیجا ہے کہ اس کی ادائیگی آج ضرور ہو جائے۔
سریش :- کتنی رقم ہے ؟
کمپاؤٹر :- بل میں دیکھئے۔

سریش :- میں نے دیکھ لی۔

کیا ڈر :- ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں آج سے ادھار بالکل بند ہے۔ اب ادھار نہیں ہوگا۔

[دروازہ کھٹ سے بند ہوتا ہے]

سریش :- شاعر نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ کتنی بھاری زنجیریں

ڈال دی ہیں میرے پاؤں میں۔ جو مجھے گزرے ہوئے

زمانے کی طرف کھینچ رہی ہیں۔ جن میں آج سے دو سال پہلے

اجالے کی آخری کرن بھی سک سک کر دم توڑ گئی تھی۔ جبکہ

میں اداکار بننے کے شوق میں اس شہر میں آیا تھا۔ مگر کامیابی نے

میرا ساتھ نہ دیا۔ حالات مجھے افلاس کے آخری کنارے

تک لے گئے۔ میرے تن کے کپڑے تارتار ہو گئے فاقہ

نے میرا حلیہ بگاڑ دیا۔ پاکھ کی ٹھٹھری ہوئی تاروں سے خالی

راتوں کے سنائے میں مجھے فٹ پاٹھ پر سونا پڑا۔ اور مجھے

وہ کام کرنا پڑا جسے سماج بُری نظر سے دیکھتی ہے۔ مگر

سماج نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ زندہ رہنے کی کشمکش ہر

چیز میں جاری ہے۔ اُس باز کو دیکھو جو بھوک سے تنگ

اگر فضا میں بے خبر چڑیا پر جھپٹتا ہے اور اُسے دبوج کر

لے جاتا ہے۔ اسی جذبے کا سہارا لے کر میں اندھیروں سے

اجالوں میں آگیا۔ پیٹ بھر کر روٹی کھانے لگا۔ سر چھپانے کو

ایک کھولی کراٹے پر لے لی۔ لیکن شاعر نے مجھے خواہ مخواہ پریشان کر دیا۔ یہ مجھے کارٹون بنا کر لوگوں کے ہجوم میں کھڑا کرنا چاہتا ہے۔ دھوبی۔ گوالا۔ ہوٹل والا۔ باری باری سب آئیں گے۔ پیسوں کا شور مچائیں گے۔ اب ادھار کا چکر نہیں چل سکتا۔

[موسیقی]

سریش :- شاعر مجھے میرا دشمن معلوم ہوتا ہے۔ یہ مجھے ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ مجھے اس کو ہلاک کر دینا چاہئے۔ اس گیتوں بھرے روپک کو مٹی میں ملا دینا چاہئے۔ گیتوں سے بھوک نہیں مٹ سکتی۔ گیت ادھے نہیں جاسکتے۔ سر چھپانے کے لئے گیت جھونپڑے کا کام نہیں دیتے۔ اس جنگل میں زندگی کی کوئی تصویر گیتوں کے رنگوں سے مکمل نہیں ہو سکتی۔ ان اندھیروں اور اجالوں میں باز چڑیوں پر جھپٹتے ہی رہیں گے۔

CHANGE OVER

[لہروں کا شور]

سریش :- رات کے اندھیروں میں میری آنکھوں کے سامنے خون کے دھبے ناپچ رہے ہیں۔ میں شاعر کو ہلاک کر دوں گا۔ اسے ہلاک کرنے سے ہی میری زندگی میں سکون پیدا ہو سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ اسے کیسے ہلاک کیا جاسکتا ہے۔

[لہروں کا شور]

سریش :- میرے سینے میں سلگتے ہوئے زخم نے کتنی کمزوری پیدا کر دی ہے
میرے جسم میں۔ درد کی ٹیسیں بڑی تیزی سے اٹھ رہی ہیں۔
میں اس وقت بڑی تکلیف میں ہوں۔ کئی شکار میری گھات
میں آکے نکل چکے ہیں۔ یہ درد مجھے کچھ کرنے نہیں دیتا۔ میرے
ہاتھ پاؤں خود بخود کانپ رہے ہیں۔ برف کی طرح ٹھنڈے
ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسے ان میں زندگی کی آگ بجھ رہی ہو۔

[لہروں کا شور]

[ریتا آتی ہے]

ریتا :- (کسی قدر لرزتی ہوئی آواز میں) بابو۔ سریش بابو۔

سریش :- ریتا تم یہاں کہاں؟

ریتا :- میں سیٹھ جی کے ساتھ سمندر کی سیر کرنے آئی ہوں۔

سریش :- سیٹھ کہاں ہے؟

ریتا :- دادا کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے ادھر نکل گئے ہیں۔ یہ دیکھو ان کی

کار۔ کتنی خوبصورت ہے۔

سریش :- بہت ہی خوبصورت۔

ریتا :- میں تمہیں ایک خوشخبری سناؤں بابو۔

سریش :- سناؤ۔

ریتا :- سیٹھ جی کی نئی کچھر میں مجھے ہیردین کا چانس مل گیا ہے۔ آج کنٹرکٹ

ہو گیا ہے۔ دو ہزار روپیہ ایڈوانس دیا ہے سیٹھ جی نے۔
بقایا بارہ ہزار پچھر کے ساتھ ساتھ چلتا رہے گا۔ بس اب
سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

سریش :- ہاں اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

ریتا :- میں نے سیٹھ جی سے تمہاری گیتوں بھری کہانی کی بات کی تھی۔
وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ بابو۔

سریش :- ریتا۔

ریتا :- اب میں ایک بہت بڑی فلم سٹار بن جاؤں گی۔ اور تم ایک بہت
بڑے گیت کار۔ یہ پھول تمہارے پاس ہونے چاہئیں۔ میں
یہ پھول تمہیں پیش کرتی ہوں۔ ایک شاعر کو پیش کرتی ہوں شاعر
اور زرگس کے پھول۔

[ہنستی ہے]

سریش :- یہ پھول مجھے پسند نہیں ریتا۔

ریتا :- کیوں پسند نہیں؟

سریش :- میری طرح درد ہیں۔ بیمار ہیں۔ کفر کے مریض ہیں۔

ریتا :- کیا کہا؟

سریش :- آج مجھے ڈاکٹر نے بتایا ہے میرے پیپٹرے میں کفر ہے۔

ریتا :- وہ تو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

سریش :- زندگی خطروں میں سانس لینے ہی کا نام ہے ریتا۔

ریتا :- اتنی تکلیف میں تم یہاں کیوں چلے آئے ؟
سریش :- ڈاکٹر نے کہا تھا سمندر کی ہوا میرے لئے بہت مفید ہے۔
چلا آیا۔

ریتا :- ٹھیک ہی تو کہا ہے ڈاکٹر نے۔ سمندر اور شاعر ایک دوسرے کے
بہت قریب ہیں۔

لہروں کا شور

سریش :- آہ - آہ - ریتا - ریتا - مجھے تھام لو - مجھے تھام لو -
ریتا :- (گھبراہٹ میں) کیا ہے ؟ بالو کیا ہے ؟
سریش :- میرے سینے میں سلگتا ہوا پھوڑا شاید پھٹ گیا ہے۔ درد
سے میری جان نکلنے لگی ہے۔

ریتا :- سنبھلنے کی کوشش کرو بابو۔

سریش :- آہ - آہ - کتنا آرام ہے تمہارے سہارے میں۔ کتنا چین ملا
ہے مجھے تمہارے ہاتھوں کے لمس سے۔ یہ روشنی کہاں سے
آ رہی ہے ؟

ریتا :- بس سٹاپ پر آکر رکی ہے۔ اس کی ٹیل لائٹ ہے۔

سریش :- یو نہی سہارا دیئے ہوئے مجھے بس سٹاپ تک لے چلو۔ میں گھر
جانا چاہتا ہوں۔

ریتا :- سیٹھ جی بس آنے ہی واسے ہیں۔ اتنی دیر تم ان کی کار میں چل کے
بیٹھو۔ میں ابھی تمہیں گھر لے چلوں گی۔

سریش :- اور قریب آؤ۔ ریتا اور قریب آؤ۔ سمندر سے ابھری ہوئی

ان چٹانوں کو دیکھو ایک دوسری سے کتنی قریب ہیں۔

ریتا :- ابھی چاند نکلے گا تو سمندر کے یہ نظارے اور بھی دلکش ہو جائیں گے۔

سریش :- یہ کیا ہے؟ یہ کیا ہے؟ یہ شعلہ سا کیا لپکا ہے؟

ریتا :- کہاں؟

سریش :- تم نے نہیں دیکھا؟

ریتا :- میں نے نہیں دیکھا۔

سریش :- یہاں۔ ان چٹانوں کے درمیان ابھی ابھی ایک شعلہ سا لپکا

ہے۔ خون کی طرح سرخ شعلہ۔

ریتا :- یونہی تمہارا خیال ہے۔ آگ پانی میں نہیں بھڑک سکتی۔

سریش :- نہیں ریتا کچھ ہے۔ ضرور کچھ ہے۔

ریتا :- میں جھانک کر دیکھتی ہوں۔

سریش :- دیکھو۔ ضرور دیکھو ریتا۔

[لہروں کا شور۔ پیچھ کی آواز]

سریش :- ڈوب گئی۔ شرامت کی پتلی ڈوب گئی۔ شاعر ڈوب گیا۔ ریتا

ہی نے اس کو حجم دیا تھا۔ ریتا ہی کی ایک شکل شاعر بن کر

میرے اندر جاگ اٹھی تھی۔ اس کی بانسری کی آواز اور آنکھوں

کے جادو نے مجھے مسح کر لیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے تو میں

اُس سے دور دور رہتا تھا۔ وہ آگے بڑھتی آرہی تھی میں پیچھے

تنہا چلا جاتا تھا۔ ریتا نہ رہی شاعر بھی نہ رہا۔ ریتا مر گئی۔
شاعر مر گیا۔ دونوں مر گئے۔ مجھے ان کے عذاب سے
چھٹکارا مل گیا۔ میں نے دونوں کو سمندر میں دھکا دے
دیا ہے۔

[لہروں کے شور میں دبے دبے تھمتے]
سریش :- کون ؟ کون ؟ یہ کیا ہے ؟ کون تھمتے مار رہا ہے ؟ یہ تو
شاعر کی آواز ہے۔ ہاں۔ وہی ہے۔ زندہ ہے۔ شاعر
زندہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کا ہونا نہ ہونا میرے
ہونے نہ ہونے کے ساتھ وابستہ ہے۔ ریتا سے اس کا
کوئی تعلق نہیں۔ میں جب تک زندہ رہوں گا یہ زندہ ہیگا۔
تھمتوں کی یہ آوازیں سمندر سے نہیں میرے اندر سے آرہی
ہیں۔ شاعر میرا مذاق اڑا رہا ہے۔ گیتوں کی تلاش میں
مجھے آوارہ پھرانے والا شاعر۔ میرا بیری۔
[منگو دادا آتا ہے]

منگو :- سریش بابو

سریش :- کون ؟ دادا ہیں۔

منگو :- اپنے ساتھ آپ ہی کیا باتیں کر رہے ہو ؟

سریش :- دکھ اور اندھیرے سے بھری ہوئی وہ زندگی جس میں شاعر جاگ
اٹھے اور انسانیت درندے کا روپ دھار لے، زندگی

نہیں فریب زندگی ہے۔

منگو :- کیا مطلب ؟

سریش :- اب میرے پاس مطلب سمجھانے کا وقت نہیں ہے۔

منگو :- کہاں جا رہے ہو بالو ؟

سریش :- چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ان لہروں میں۔

منگو :- رک جاؤ۔ بابورک جاؤ۔

سریش :- اب مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ زندگی سے زیادہ مجھے شاعر

اور اس درندے نے پریشان کیا ہے۔ جو کل سے میرے

دماغ کے پنجرے کو توڑ کر باہر نکل آیا ہے اور چیرنے

پھاڑنے کے لئے اپنے نوکیلے پنجے تیز کر رہا ہے۔

[سمندر میں کود جاتا ہے۔ لہروں کا شور]
فیادٹ

چھ فنکار

کردار

پہلی عورت ——— رقصہ

دوسری عورت ——— شاعرہ

تیسری عورت ——— ناول نگار

پہلا مرد ——— نقاد

دوسرا مرد ——— بُت تراش

تیسرا مرد ——— مصور

یہ سب ڈھیٹے ڈھالے لباس میں ہیں اور اپنے گرو پیش کی چیز سے بالکل متاثر نہیں۔ یہ سب بیڑ اور شراب پیتے ہوئے ادنیٰ آواز میں باتیں کر رہے ہیں۔ موضوع گفتگو ناول نگار عورت کا نیا ناول ہے۔ مصنفہ یہ چاہتی ہے کہ اس کے شاہکار کو کم از کم پانچ زبانوں میں ترجمہ کر کے شائع کیا جائے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کی تخلیق، اس کا نیا مطالعہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نئی زندگی اور اس کے نئے رجحانات کا حامل ہے۔

نقاد :- فلم سٹار بننے سے پہلے مادام تمہیں میرا تازہ آرٹیکل ضرور دیکھنا چاہئے۔
رتقا صہ :- کونسا آرٹیکل؟

نقاد :- فلمینیا

رتقا صہ :- کیا مطلب؟

نقاد :- اس کا مطلب ہے فلم سٹار بننے کا جنون جس کا دوسرا نام ہے فلم فیور۔ یعنی فلمی بنجار۔ جس کے جراثیم مائیکروسکوپ سے بھی دیکھے نہیں جاسکتے۔ جو آنکھوں اور کانوں کے راستے فلم فینز کے دل و دماغ پر حملہ کرتے ہیں۔

رتقا صہ :- یہ لفظ کسی ڈکشنری میں تو دیکھا نہیں۔

نقاد :- یہ لفظ میری دریافت ہے۔

رقاصہ :- اس مرض کا علاج ؟

نقاد :- یہ لا علاج مرض ہے ۔

رقاصہ :- اس سے بچنے کا طریقہ ؟

نقاد :- فلمیں زیادہ دیکھنے سے پرہیز کیا جائے ۔ اور ان سے متاثر ہو کر

فلم سٹار بننے کے متعلق کچھ نہ سوچا جائے ۔ ہر شخص سٹار
نہیں ہو سکتا ۔

مصور :- مادام نیٹا کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے ؟

نقاد :- اچھا ناچ لیتی ہے ۔ ترنگی ہے ایکٹرس نہیں ۔

مصور :- ترنگی اور ایکٹرس میں کتنا فرق ہے ؟

نقاد :- جتنا مونچھ اور چوٹی میں ۔

بت تراش :- تمہارے اس آرٹیکل کا بہترین حصہ کونسا ہے ؟

نقاد :- جس میں فلمی بادل گزروں کا حدود اربعہ ہے ۔

بت تراش :- فلمی بادل گزے کون ؟

نقاد :- وہ جو سوتے جاگتے ، اٹھتے بیٹھتے ، کھاتے پیتے ، چلتے پھرتے

گھر میں بازار میں فلمی چکر میں رہتے ہیں ۔ فلمی ڈائلاگ بولتے

ہیں ۔ فلمی گیت گاتے ہیں ۔ نئی فلموں کے گیت ۔ پرانی

فلموں کے گیت ۔ انہیں فلمی گیتوں کی چلتی پھرتی لائبریری

بھی کہا جاسکتا ہے ۔ جو زندگی کو ایک فلمی گیت سمجھتے ہیں

اور چاہتے ہیں ۔

بت تراش :- کیا چاہتے ہیں ؟

نقاد :- وہ چاہتے ہیں ان کی گردن پر سپرے کی بجائے مودی کیمبرہ، ساونڈ
ٹرک یا ٹیپ ریکارڈ مشین ہونی چاہئے۔ اور وہ دن رات
گاتے رہیں۔

بت تراش :- کیا گاتے رہیں ؟

نقاد :- زندگی کا فلمی کورس۔ (گھاتا ہے)

گائے جا اے دل گائے جا
کس کو پتہ ہے کل آئے کہ نہ آئے
اے میری زندگی

اے میرے فلمی گیت

بت تراش :- تمہاری آواز بڑی بھونڈی ہے۔

نقاد :- تمہاری بھونڈی صورت کا سایہ پڑ رہا ہے اس پر۔

ناول نگار عورت :- ایسے لوگوں کا کوئی اور نام بھی تجویز کیا ہے تم نے ؟
نقاد :- کئی نام رکھے جاسکتے ہیں ان کے۔

ناول نگار عورت :- مثلاً

نقاد :- کو مک۔ کارٹون۔ مسخرے وغیرہ۔ ان میں کئی تو کنگھی شیشہ
بھی اپنے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔

مصوّر :- وہ کیوں ؟

نقاد :- ہیر و گٹ بال سنوارنے کے لئے ہر دو منٹ کے بعد انہیں ایک

دورہ ساڑتا ہے۔ جہاں پھرتے ہیں وہیں میک آپ
کرنے لگتے ہیں۔

مصور :- وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟
نقاد :- کیا معلوم ایسا کیوں کرتے ہیں۔ زندگی انہیں دھوکہ دے رہی
ہے یا وہ زندگی کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ ننگے جھوکے
فلمی تان سین۔ بیجو باورے۔ ہر ماسٹر فائس اور میگان فون کے
فلمی ریکارڈ۔ نہ کوئی انہیں چابی لگاتا ہے۔ نہ کوئی ان کی
سوئی بدلتا ہے۔ لیکن وہ بچ رہے ہیں۔ خود بخود بول
رہے ہیں۔ ساری رات۔ سارا دن۔ ساری زندگی وہ
چاہتے ہیں بولتے رہیں۔ بچتے رہیں۔ گاتے رہیں۔
چلتے پھرتے گراموفون۔ شکل انسان کی اور باقی سب کچھ
گراموفون کا۔

[سب ہنستے ہیں]

بت تراش :- فوارے کے پاس گھومتے ہوئے آج تمہارے ساتھ کون
تھا؟

نقاد :- سیٹھ لام جی میم جی۔

بت تراش :- سیٹھ ٹ جی پ جی کے بھائی؟

نقاد :- ہاں وہی۔

بت تراش :- سیٹھ جی کے نام لام جی میم جی کے ساتھ اگر فون جی واؤ جی

کا اضافہ ہو جائے تو کیا ہرج ہے؟

نقاد :- اگر ان کی زندگی کی بیمہ پالیسی پر اس کا کچھ اثر نہ پڑے تو ٹھیک ہے
بت تراش :- نام کا نام معنی کا معنی - بات کی بات - بھارت کی بھارت
اس ترقی پسند دور میں ہر چیز کا ایسا ہی کوئی نام ہونا چاہیے۔

مصور :- پھل اور پھول میں خوبصورتی کے لحاظ سے تو کچھ فرق نہیں۔
بت تراش :- بالکل نہیں۔

مصور :- تو پھر انسانوں یا حیوانوں کے نام پھلوں پر بھی کیوں نہیں رکھے
جاتے۔ جیسے خر بوزہ خان - مادام ایچی - مادام مونگ پھلی۔
لوکاٹ بیگم وغیرہ۔

نقاد :- پھل کھٹے اور کڑے بھی ہوتے ہیں۔ سمجھے تم لوگ۔ میں
ایک بہت بڑی بات کہہ رہا ہوں۔

بت تراش :- مگر سیٹھ جی کی دکان کے چھجے سے لگے ہوئے جہاز می سائز
کے بورڈ سے چھوٹی ہے۔

نقاد :- اور سیٹھ جی خود بھی بہت چھوٹے ہیں۔ بڑے مختصر۔ مونگ پھلی سے
نام بڑے اور درشن چھوٹے۔

بت تراش :- ویسے تو وہ چوٹی کے ناشران میں سے ہیں۔ لاکھوں کتابیں
لاکھوں کا بیوپار۔

نقاد :- کل سیٹھ جی بزم ادب کے جشن سالگرہ میں ایک بڑی دھواں دھار
تشریک کر رہے ہیں۔

ناول نگار عورت :- کس موضوع پر؟

نقاد :- فن اور فنکاروں پر۔

ناول نگار عورت :- موضوع تو بہت اچھا ہے۔

نقاد :- تقریر انہیں میں نے لکھ کر دی ہے۔

ناول نگار عورت :- اس تقریر کے چند تراشے تو پیش کرو۔

نقاد :- تقریر یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ حضرات ہمارا ادارہ ہر ادیب

اور شاعر کا اپنا ادارہ ہے۔ ہم ہر فنکار کو اس کی محنت کا معقول

معاوضہ دینے کے حامی ہیں۔ تاکہ ہمارے ملک کے ہر فنکار

کی زندگی خوشحال ہو جائے۔ اگر ہمارے فنکار بھوکے تنگے

رہیں گے تو ہمارے ملک کا ہر آرٹ، ہر فن بھوکا ننگا ہوگا۔

ہم اپنے ملک کے فنکاروں کو زندگی کی شاخ سے ٹوٹے

ہوئے خشک پتے نہیں بننے دیں گے۔ جنہیں بھوک و

افلاس کا ہر ٹھونکا جدمرچا ہے لے جائے۔

تالیاں

بت تراش :- تقریر تو بہت اچھی لکھی گئی ہے۔

نقاد :- لیکن سیٹھ جی کے بونے کا انداز اچھا نہیں۔ بھٹی آواز۔ بھدا الہجہ۔

ان کے سانس کے اتار چڑھاؤ سے تو ایسا لگتا ہے جیسے

کوئی شکر قندی بیچ رہا ہے۔ فقط تو بڑا ہی معیوب ہے۔

فرقت کو پھر کت اور سبیل کو بچھو مل کہتے ہیں۔

بت تراش :- سیٹھ سے کہہ کر مادام رضیہ کے ناول کی بات طے کرادو نا۔
نقاد :- کیا کہوں ان سے ؟

بت تراش :- ان سے کہو مادام رضیہ اس دور کی بہترین ناول نگار
ہیں۔ اور ان کے ناول میں زندگی کی آگ بڑی تیز ہے۔
نقاد :- آگ کا نام سن کر تو وہ بوکھلا جاتے ہیں۔ کہتے ہیں ارے بھئی آگ
کو اس دکان سے دور ہی رکھو۔ یہاں ہزاروں ٹن کا غذ چھپا
پڑا ہے۔

بت تراش :- تو پھر کسی مناسب طریقے سے ان کے ساتھ مادام
رضیہ کے ناول کی بات کرو۔

نقاد :- وہ آجکل زیادہ تر جاسوسی ناول چھاپ رہے ہیں۔ یہ جاسوسی
ناول کا دور ہے۔ کوئی ایسا جاسوسی ناول ہونا چاہئے جس کے
کم سے کم دو ہزار صفحے ہوں۔ کم سے کم دس ڈگیتی کی
وارداتیں۔ کم سے کم بارہ نقب زنی کے واقعات۔ کم
سے کم بیس پراسرار چوریوں۔ کم سے کم پندرہ اغوا کی وارداتیں۔
کم سے کم آٹھ قتل اور سراع کسی ایک کا بھی نہ چلے۔ سیٹھ
ایسا ناول چھاپنے کو فوراً تیار ہو جائے گا۔

بت تراش :- کیوں مادام رضیہ کیا خیال ہے ؟

ناول نگار عورت :- سوچوں گی اس وقت تو میرے سر میں ہلکا ہلکا درد
ہو رہا ہے۔

نقاد :- اسپر دکھاؤ مادام - اسپر د میں جادو ہے - لوہے کو لوہا کاٹتا ہے -
ناول نگار عورت :- اسپر د میں شاید لوہا ہو میں تو لوہے کی نہیں ہوں -
بت تراش :- تم تو مکھن کی بنی ہوئی ہو مادام - ایسا سفید جسم میں نے
کبھی نہیں دیکھا - تمہارے گوشت میں سنگ مرمر ہے -

رتقا صہ :- پھر تو مادام کو ناول نگاری کا تاج محل کہنا چاہئے -
نقاد :- گوشت میں سنگ مرمر نہیں ہو سکتا -
رتقا صہ :- ہو سکتا ہے - انسان میں لوہا ہے - گندھک ہے - چونا ہے -
فاسفورس ہے - سنگ مرمر کیوں نہ ہوگا -

مصور :- یہ دیکھئے کتنی دلچسپ تصویر ہے -

رتقا صہ :- یہ کس کی تصویر ہے ؟

مصور :- بارہ من کی دھوبن کی -

رتقا صہ :- مجھے تو یہ بارہ من کی معلوم ہوتی ہے -

[سب ہنستے ہیں - پس منظر میں موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں
ابھرتی ہیں]

بت تراش :- بادل - بارش - دھند - بہت بور کہنے والی چیزیں ہیں -
مصور :- خاص کردہ ممبر اور جولائی کی یہ بارشیں - یہ بادل جو سورج کو اغوا
کہہ کے کئی کئی دن تک نہ جانے کہاں لے جاتے ہیں -

بت تراش :- یہ کالے کالے بھورے بھورے بادل بوند بوند بوند
کا بھی بیسواں حصہ ہو کر ٹپکتے ہیں - گرے ہوتے چبے جاتے

ہیں۔ جھکتے چلے آتے ہیں۔ ہر چیز گیلی گیلی، ٹھنڈی ٹھنڈی
دھندلی دھندلی نظر آتی ہے۔ ایسا ماحول، ایسا موسم مجھے
سخت ناپسند ہے۔

مصور :-

بت تراش :- ایسے ماحول، ایسے موسم میں زردس ہو جاتا ہوں میں۔ ٹھنڈی برقی ہوا میں
گیلیوں اور بازاروں کو بے رونق بنا دیتی ہیں۔ کچھ پانی، دھند اور بھگے
ہوئے، ٹھٹھڑے ہوئے خشک پتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔
مصور :- نزدیک اور دور۔ دور اور نزدیک کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ نہ ٹھنی کلر چہرے، نہ مسکاتی
ہوئی لب اسٹیکس۔ نہ میکس فیکٹر کے گنگنا تے ہوئے شیڈ۔ نہ جڑبستہ فلیڈ
شعر کہتی ہوئی تھری ڈائی منشن الٹ لیلوی آنکھیں۔

بت تراش :- جو ہر سنی منٹل کو سند باد بہا ز می بنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

مصور :- اور نہ کابل کی کالی کالی لکیروں میں جلتے بجتے جگنو۔ الہ دین کے میچک لیمپ۔
بت تراش :- اور نہ کاروں کی کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے کوس میٹک، اید میٹک
ستارے۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا ایسے ماحول، ایسے موسم میں۔

مصور :- ہر چیز بور نظر آتی ہے۔ بوریت کی انتہا ہو جاتی ہے۔

بت تراش :- گلیوں اور بازاروں کے ٹھنی کلر جگنو اور کاس میٹک ستارے سردی
سے نہ جانے کہاں سمٹ جاتے ہیں۔

مصور :- یہ سڑکیں یہ پارکیں۔ یہ زندگی بالکل خالی خالی نظر آتی ہے۔ اوپن فراڈ۔

بت تراش :- جیسے ٹانی اور چاکلیٹ کے وہ خوشنما کور جو اندر سے خالی ہوں لیکن
بڑے اہتمام سے پیشے کے کنٹرول میں رکھے ہوں۔

مصور :- ٹانی۔ چاکلیٹ اور چیونگ گم نہ صرف میری ریفر ٹمنٹ بلکہ

ڈاٹھ ہیں۔ خالی کوروں سے میری تسلی نہیں ہوتی۔
بت تراش :- اور وہ اس لئے کہ تمہیں ہر وقت جگالی سی کرتے رہتے کی
عادت ہے۔ اسی لئے تو چیونگ گم بہت پسند کرتے ہو۔
مصور :- کیوں نہ پسند کروں اس کے بغیر تو زندگی مجھے بلیک اینڈ وائٹ
میں ایک ٹریجڈی نظر آتی ہے۔

نقاد :- اس بوتل کا لیبل تو ذرا پڑھنا جی۔
مصور :- خود ہی پڑھ لو۔ میں اپنی عینک گھر پر بھول آیا ہوں۔
بت تراش :- تو مادام رضیہ کی گاگل لے لو۔
مصور :- اس بوتل میں کیا ہے ؟

نقاد :- دوائی ہے۔
مصور :- کیسی دوائی ؟
نقاد :- مجھے دے کی شکایت ہو گئی ہے۔
مصور :- ہر میچیاں کے کیسے کھایا کرو۔ ڈامن اسے، بی، سی، ڈی
تمہارے لئے بہت مفید ہیں۔

نقاد :- انگریزی کا پورا قاعدہ ہی نہ پھانک لوں کسی دن فرصت میں۔
مصور :- کوئی ہرج نہیں۔ لیکن کسی ڈاکٹر کو کنسلٹ کر لینا۔ اُسے پھانکنے
کے اوقات اور مقدار وہ تجویز کرے گا۔
ناول نگار عورت :- ایک چیز میں بھی تمہارے لئے تجویز کرتی ہوں۔
نقاد :- وہ کیا ؟

ناول نگار عورت :- صبح کے وقت باغ کی سیر کیا کرو۔ تازہ ہوا لیا کرو۔

میرے ناول کا ایک مرکزی کردار تم سے بہت متاثر ہے

بت تراش :- میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ مادام رضیہ کا ناول اس صدی کا

بہترین ناول ہے تم اپنے دوست سیٹھ سے کہو اُسے چھاپے

نقاد :- تم حسب عادت جھک مار رہے ہو۔ ناول بالکل ٹھس ہے۔ زندگی

سے خالی۔ زندگی سے دور۔ جس کے سب کردار بیمار

ہیں۔ اعصاب زدہ ہیں۔ اندھیروں کے مسافر۔

مصور :- اس دور کا ہر انسان اندھیروں کا مسافر ہے۔ اس کی مشکلات کا حل

خدا اور آدم کے جسم میں نہیں بلکہ سرمایہ کی صحیح تقسیم میں ہے۔

شاعرہ :- میرا تو خیال ہے چاند میں ہے۔ اس کا حل اسپٹنگ میں ہے۔

خلا بیمار اکٹوں میں ہے۔ سرخ سویرے میں ہے۔

نقاد :- بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔ دھرتی پر اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں

مصور :- یہ بکو اس ہے۔ ایک بہت بڑی بکو اس۔ سرخ بکو اس

بت تراش :- بکو اس سرخ نہیں ہو سکتی۔

مصور :- اگر سفید جھوٹ ہو سکتا ہے تو سرخ بکو اس بھی ہو سکتی ہے۔

اس معاملے میں تم بڑے تنگ نظر ہو۔

ناول نگار عورت :- دیکھئے۔ سینے۔ آپ لوگ اس وقت فلسفہ

چھانٹتے ہوئے الجھ رہے ہیں۔ الجھا رہے ہیں۔ میرے

خیال میں میں نے اپنے ناول میں آج کے انسان کے

صرف ایک طبقہ کی عکاسی کی ہے۔ جو میرے خیال میں
ہے اور نہیں ہے۔ میں بڑے وثوق سے کہہ سکتی ہوں۔
میں نے نہایت چابکدستی سے اس نازک موضوع کو نبایا
ہے۔ ایک عورت ایک خوا۔

بہت تراش :- سمو سے کھائے مادام۔ بڑے لذیذ ہیں۔

شاعرہ :- سمو کس چیز سے بنتا ہے ؟

ناول نگار عورت :- گندم سے۔

نقاد :- میں گندم نہیں کھاتا۔

شاعرہ :- کیوں ؟ گندم میں کیا ہے ؟

نقاد :- ایک بہت بڑا خطرہ۔

شاعرہ :- کیسا خطرہ ؟

نقاد :- گندم کھانے سے آدم کو جنت سے نکال دیا گیا تھا۔

شاعرہ :- بے فکر رہیں آپ کو اس کلب سے کوئی نہیں نکالے گا۔

مصور :- کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ چنے کے ہوتے ہوئے آدم نے گندم

کیوں کھائی جبکہ چنا گندم سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔

شاعرہ :- آدم نے نہ تو گندم کھائی کھتی اور نہ چنا۔

مصور :- تو پھر اس نے کیا کھایا تھا ؟

شاعرہ :- ایک زنگین فریب کھایا تھا آدم نے۔

[سب ہنستے ہیں]

نقاد :- تمہارے شاہکار کا کیا ہوا ؟

بت تراش :- اکادمی نے بیس ہزار روپے کی پیس کش کی ہے۔

نقاد :- پھر ؟

بت تراش :- امید ہے پچیس ہزار پر فیصد ہو جائے گا۔

نقاد :- تو پھر مبارک ہو۔

بت تراش :- لیکن اس میں ایک بڑی الجھن ہے جی۔

نقاد :- الجھن کیسی ؟

بت تراش :- اکادمی مجھ سے مستقل حقوق مانگتی ہے۔

نقاد :- تمہارا کیا خیال ہے ؟

بت تراش :- مجھے یہ بالکل منظور نہیں۔

نقاد :- تم اگر ڈٹے رہے تو اکادمی تمہاری شرائط مان لے گی ؟

بت تراش :- اس کا باد آدم کھنی مانے گا۔

نقاد :- وہ کیسے ؟

بت تراش :- تم بھی اس بالکل وہ ہو یعنی اندھیروں کے مسافر۔

نقاد :- لیکن تمہارا وہ شاہکار کیا ہے ؟

بت تراش :- ہاتھی۔

نقاد :- اونٹ کیوں نہیں ؟

بت تراش :- شتر غمزے بڑے دکھاتا ہے۔

نقاد :- کوئی کل سیدھی جو نہیں اُس کی۔

مصور :- اونٹ کا کوہان اونٹ سے زیادہ عجیب ہے ۔

نقاد :- تم نے اپنا شاہکار پٹرا کوٹا میں تراشا ہے یا مرمر میں ؟

بت تراش :- مرمر میں ۔

مصور :- بالکل نئی چیز ہے ۔ جدت ہے ۔

شاعر :- یقیناً یہ ایک نئی چیز ہے ۔

نقاد :- اور تختیل اس میں کیا ہے ؟

بت تراش :- ہاتھی ناچ رہا ہے ۔ گنے کھا رہا ہے ۔

شاعر :- بالکل نیا تختیل ہے ۔ بورژوازی تختیل

ناول نگار عورت :- اس مجھے کے دالمی حقوق ہرگز نہ دینا جی ۔

تیس ہزار اس تختیل کی کم قیمت ہے ۔

بت تراش :- ایک اور بڑی الجھن ہے جی ۔

نقاد :- وہ کیا ؟

بت تراش :- جس ہاتھی کو میں نے ہاتھی دانت میں تراشا ہے وہ

پیاری امبا کا ہاتھی ہے ۔

شاعر :- امبا کون ؟

نقاد :- ہوگی کسی ہاتھی بان کی بیٹی ۔

شاعر :- امبا سے تمہیں کیا نسبت ہے ؟

بت تراش :- میں چاہتا ہوں اس سے میری نسبت ہو جائے

مصور :- بس تو پھر اس مجھے کی قیمت میں دس ہزار روپے کا اور

اضافہ کر دو۔

شاعرہ :- بیشک - بیشک - پیار بھی ایک فن ہے - اور بورش والی نقطہ
نظر سے کوئی بھی فن بے مول نہ بننا چاہئے -
بت تراش :- لیکن ایک اور بڑی الجھن ہے جی -
نقاد :- وہ کیا ؟

بت تراش :- رات میرے نگار خانے میں آگ لگ گئی - ہاتھی دانت
کا ہاتھی جل گیا - صرف اگلے دو دانت بچے ہیں -
نقاد :- اور تمہارے بھی اگلے دو دانت نہیں ہیں - کتنا خوشگوار حادثہ ہے -
سب ہنستے ہیں

نقاد :- تمہارے نئے مطالعے کا موضوع کیا ہے جی ؟
مصور :- اندھیرے اجالے -

شاعرہ :- اچھا عنوان ہے -

ناول نگار عورت :- جب تم کوئی تصویر بناتے ہو تو کیا محسوس کرتے ہو ؟
مصور :- میں اس وقت یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اس وقت کچھ بھی محسوس
نہیں کر سکتا - جیسے مجھے کلوروفارم سونگھا دیا گیا ہو -

نقاد :- تمہاری یہ تصویر نامکمل ہے -

مصور :- نامکمل کیسے ہوئی ؟

نقاد :- اندھیرے نہیں ہیں اس میں اجالے ہی اجالے ہیں -

شاعرہ :- کیا یہ تصویر تمہارا نیا مطالعہ ہے ؟

نقاد :- میرا نیا مطالعہ ڈوڈا دسکی ہے۔

شاعرہ :- وہ کون ؟

مصور :- ایک نوجوان اندھی بھکاری جو حاملہ ہو گئی۔

نقاد :- تمہاری اس تصویر کا عنوان کیا ہے ؟

مصور :- ننگی دھرتی۔

نقاد :- تمہاری کوئی تصویر ہماری سمجھ میں تو کبھی آئی نہیں۔ جہاں ناک ہونا

چاہئے وہاں تم آنکھ بنا دیتے ہو۔ اور جہاں کان ہونے

چاہئیں وہاں ہونٹ ہوتے ہیں۔ عجیب مصوری ہے۔

مصور :- میں اس زمانے کا مصور نہیں ہوں۔

نقاد :- اور کس زمانے کے مصور ہو تم ؟

مصور :- مجھے آج سے دو سو سال بعد آنا چاہئے تھا۔

نقاد :- اس وقت تو شاید نہ زمین ہوگی نہ زندگی۔

مصور :- لیکن وقت ہوگا۔

شاعرہ :- تمہیں اپنے زمانے میں آنا چاہئے تھا۔

مصور :- کون مرد وہاں آنے پر راضی تھا۔ میرے ساتھ تو کوئی حادثہ پیش

آیا ہے۔

شاعرہ :- کیسا حادثہ ؟

مصور :- اس کا جواب صرف وہ عورت اور مرد ہی صحیح دے سکتے ہیں

جنہوں نے مجھ سے پہلے اس حادثہ کو جنم دیا۔

شاعرہ :- بہت اونچا تخیل ہے۔
ناول نگار عورت :- بہت بڑی بات ہے۔ سمندر اور آسمان سے بھی بڑی بات۔

بت تراش :- ایسے تخیل تمہارے ذہن میں کہاں سے آتے ہیں؟
مصور :- جہاں سے زندگی آئی ہے۔
نقاد :- تمہاری تصویروں میں چہروں کے نقوش ٹیڑھے میڑھے کیوں ہوتے ہیں؟

مصور :- زندگی ابتدا میں ایسی ہی تھی۔
نقاد :- تم اس وقت کہاں موجود تھے؟
مصور :- وقت میں۔

شاعرہ :- اور وقت کیا ہے؟
مصور :- اس کے لئے تم میری تصویر دائرے دیکھو۔
نقاد :- اور اگر اس سلسلے میں زندگی کا کوئی کیلنڈر۔ کوئی ٹائم ٹیبل دیکھ لیا جائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟
مصور :- ہرگز نہیں۔ پسند اپنی اپنی۔

نقاد :- تمہاری تصویروں میں زندگی اصلی زندگی سے مختلف کیوں ہے؟
مصور :- اس لئے کہ میرا فن دوسرے فنکاروں سے مختلف ہے۔
نقاد :- تمہاری تصویریں تنگی کیوں ہوتی ہیں؟
مصور :- زندگی میرے تخیل میں زمین پر ایسی ہی ہے۔

شاعرہ :- بورڈروائی تخیل ہے

ناول نگار عورت :- بورڈروائی زندگی -

نقاد :- بورڈروائی موت -

بت تراش :- اور مادام رضیہ کے دو بورڈروائی بوسے - کیونکہ میں اس کا

ناول دو زبانوں میں ترجمہ کر رہا ہوں -

شاعرہ :- تم بہت اونچے فنکار ہو -

رقاصہ :- اس لئے کہ تمہیں سمجھا نہیں جاسکتا -

نقاد :- اس لئے کہ لوگ تمہارے متعلق سوائے اونچے پن کے اور کچھ سمجھنے

کی کوشش ہی نہیں کرتے -

شاعرہ :- ویٹرس -

ویٹرس :- میس سر -

شاعرہ :- ایک کنفیڈرائٹی -

ناول نگار عورت :- ایک سیون آپ -

نقاد :- ایک شہین

بت تراش :- ایک کوکٹیل - ہکا سا پگ

مصور :- ایک ہیگ اینڈ ڈونٹ بی ویگ -

نقاد :- آج دھرتی کے ریوتا پیس گئے - زیادہ سے زیادہ پیس گئے -

اور ناچیں گے -

بت تراش :- مادام رضیہ کا ناول اور سات زبانوں میں ان کے تراجم بھی

ناچیں گے۔ شاعرہ کی غزلیں، نظمیں اور گیت بھی ناچیں گے۔
رات بڑی دلکش ہوتی جا رہی ہے۔ بورژوائی رات۔ بورژوائی
چاند۔ بورژوائی ستارے۔ ان سب کو دھرتی پر آنا ہوگا۔

[سب مہنتے ہیں]

[شاعرہ دھیمے دھیمے سُرور میں کچھ لگاتی ہے]

مصور :- تم بڑی حسین ہو شاعرہ۔ بڑی دلکش و دل فریب ہو۔ جیسے ایوننگ
ان پیرس کاسنٹ۔ لکس ٹائیٹ سوپ۔ پونڈز کی کھلڈ
کریم۔ ڈائیل کاشیمو۔ کڈ بوی کے چاکلیٹ۔ جیسے عمر خیام
کی رباعی۔

ناول نگار عورت :- تمہیں دیکھتے ہی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں
عورت سے مرد بن گئی ہوں۔

نقاد :- ویسے بھی تمہیں عورت تو نہیں کہا جاسکتا۔ تم اگر اپنے آپ کو اپنی ڈرائنگ
میں دیکھ لو گی تو مجھ سے اتفاق کرو گی۔ مصور سے کہو تمہیں
تمہاری ڈرائنگ میں دکھائے۔

مصور :- بس ہلکے گئے نا۔

نقاد :- ہلکا نہیں میں اپنا دل بہلا رہا ہوں۔

مصور :- شاعرہ تم بڑی رومانٹک ہوتی جا رہی ہو۔

نقاد :- اور میری طبیعت بھی آج کل تنقید سے ہٹ کر رومان کی طرف
آ رہی ہے۔ بڑی ایڈوانس ہو تم۔

شاعرہ :- کیا ایڈوانس بکنگ کا خیال ہے ؟
 مصور :- تم کیا پینا پسند کر دو گی ؟
 شاعرہ :- جو تم پی رہے ہو ۔
 مصور :- میں اپنا خون پی رہا ہوں ۔ دھرتی کا خون پی رہا ہوں ۔ انسانوں
 کا خون پی رہا ہوں ۔
 شاعرہ :- بس تو پھر ٹھیک ہے ۔
 مصور :- ویٹر س ۔
 ویٹر س :- ایس سر ۔
 مصور :- ایک باٹلی تازہ خون ۔ اپنا خون ۔ ہمارا خون ۔ ساری دھرتی کا خون ۔
 ویٹر س :- تازہ خون کے لئے بلڈ بینک ٹوزیر وٹائٹ کو فون کیجئے ۔
 بت تراش :- شاعرہ اپنا وہ شعر تو گنگنا نا ۔
 شاعرہ :- کونسا شعر ؟
 بت تراش :- صبح اپنی گرگابی پالش کرتے ہوئے جو شعر گنگنا رہی تھیں ۔
 رفا صہ :- شعر نہیں ۔ مادام سے کوئی تازہ نظم سنیئے ۔
 مصور :- ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔
 شاعرہ :- ان گنت صدیوں کے لوک گیت ۔ لوک ناپچ ۔ میرے اس
 بیگ میں نگیٹ ہیں ۔ پنہار ہیں ہیں ۔ لہلہاتے ہوئے
 کھیت ہیں ۔ گھونگھٹ ہیں ۔ ساگر ہیں ۔ آکاش ہے ۔
 دھرتی ہے ۔

نقاد :- تو پھر دور سے دھرتی کے اُس کنارے کی جھلک ہمیں بھی دکھانا
مصور :- مادام بس اب اور نہ تڑپاؤ۔ جلدی سے اپنی کوئی نظم سناؤ۔
شاعرہ :- عرض کیا ہے۔
مصور :- ارشاد - ارشاد۔

شاعرہ :- چھین چھین چھین
مصور :- یہ مصرعہ چھینکا ہے یا مادام کی پازیب کا کوئی گھنگرہ؟
شاعرہ :- دل کی زنجیر کھڑک رہی ہے آج
چھین چھین چھین

بھاگ کر پس دیوار کوئی آیا ہے
دور تک کوئی ستارہ ہے نہ کوئی جگنو
ہر طرف چھائے ہوئے سناٹے
اندھیرے

کسی پازیب کی جھنکار سے جل اٹھیں گے
یہ تختیوں کی سحرکاری نہیں اور نہ فریب
بھاگ کر پس دیوار کوئی آیا ہے
یہ کسی مرمری پیکر کا حسیں سایہ ہے
چھین چھین چھین

کھل گیا ہے دردِ اندہ

[تالیاں - ہاڈ ہو کا شور]

مصور :- مثالی نظم ہے۔ طلسمی نظم ہے۔
بت تراش :- بورژوائی نظم ہے۔
ناول نگار عورت :- کلاسیکی نظم ہے۔ میکائیلی نظم ہے۔
نقاد :- یہ نظم نہیں نئی شاعری کا بے ہمارا اونٹ ہے۔ جس کی کوئی بھی
کل سیدھی نہیں۔ بیٹھ جاتا ہے جہاں جی چاہے۔
[موسیقی کی آوازیں پس منظر سے ابھر کر پھر مدہم پڑ جاتی ہیں۔]

اناؤنسر :- لیڈز اینڈ جنٹلمین۔ ہمارا آج کا پروگرام یہ ہے۔ حسب معمول
سندے نائٹ ٹکنی کلر پروگرام۔ روزانہ پروگرام سے بالکل
مختلف۔ سب سے پہلے مس نیٹا کا ڈانس ہوگا۔ یہ آج
رمبا پیش کر رہی ہیں۔ ان کے ڈانس کے ساتھ ساتھ مس ماکھر
مس تقار دو نول بہنیں فلمی گیت گائیں گی۔ پھر سیکسوفون
پر ایک طریقہ۔ ایک سانیہ بندہ۔ ایک جلیسی۔ پھر ایک کیبرے
اور آخر میں کھلاناچ۔ لیجئے اب تھوڑی دیر میں پروگرام
شروع ہوتا ہے۔

| موسیقی کی آوازیں ابھر کر مدہم پڑ جاتی ہیں |

نقاد :- مادام یہ نظم کس کی ہے ؟
شاعرہ :- الفاظ میرے اپنے ہیں۔
نقاد :- یہ الفاظ بھی تمہارے نہیں ہو سکتے۔

شاعرہ :- آواز میری اپنی ہے۔

نقاد :- یہ آواز بھی تمہاری نہیں ہے۔

شاعرہ :- تو پھر یہ کون بول رہا ہے میرے اندر؟

نقاد :- کوئی بھی نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔

شاعرہ :- تو پھر یہ سب کچھ کیا ہے؟

نقاد :- یہ سب کچھ کچھ بھی نہیں ہے۔ فریب۔ دھوکہ۔ جھپٹ۔

مصور :- تم قنوطی ہو۔ اخلاقی کنگال ہو۔

بت تراش :- تم خطبیل بھی ہو۔ سٹری بھی ہو۔ سودائی بھی۔

رقاصہ :- دل دکھانے کی باتوں کے سوا تمہیں کچھ آتا ہی نہیں۔

ناول نگار عورت :- جیولیس سیزر بھی خطبیل تھا۔ سٹری تھا۔ سودائی تھا۔

دوسروں کو آزار پہنچا کر اُسے بڑی خوشی ہوتی تھی۔

رقاصہ :- جی بھی تو اُسے منظر عام پر نہایت بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

ناول نگار عورت :- بڑی زہریلی تنقید کرتے ہو تم۔ زہر میں بجھے ہوئے

خنجر چھبوتے ہو۔

شاعرہ :- تمہاری باتوں سے خون کی ٹو آتی ہے۔

بت تراش :- قتل کر دو۔ اسے قتل کر دو۔

مصور :- پھولوں کی شکھڑیوں کو چیرنے پھاڑنے والے اس درندے کو

آج میں چیر پھاڑ دوں گا۔ کھانا کھانے والی اس چھری سے

آج میں دہی کام لوں گا جو جیولیس سیزر کے قاتلوں نے

خنجر سے لیا تھا۔

بت تراش :- تم اگر ایسا کر دگے تو فنون لطیفہ پر بڑا احسان کرو گے۔
مصور :- تم نے شاعری کی ہتک کی ہے۔ میری محبت کا مذاق اڑایا ہے۔
میں ابھی تمہاری بوٹیاں اڑا دوں گا۔

نقاد :- (چپختے ہوئے) بچاؤ۔ بچاؤ۔

[شور و شغب]

اناؤنسر :- ویٹر بس

ویٹر بس :- بس سر

اناؤنسر :- (گجراہٹ میں) جلدی سے ہنگامی پولیس اسٹیشن کو فون کرو۔

ویٹر بس :- بس سر

بت تراش :- (دھمکتے ہوئے) ٹھہرو سدک جاؤ۔ پریشان نہ ہوں۔

آپ لوگ۔ ہم اس ڈرامے کی ریسرل کر رہے ہیں۔ جسے

ہم سب فنکار اس کلب کی اسٹیج پر پیش کرنے والے

ہیں۔

[پس منظر سے موسیقی کی آوازیں ابھرتی ہیں]

افسانے

۱۔ آم کی گھٹلی

۲۔ آرک لائٹ

۳۔ ایک کے بعد ایک

۴۔ گل - خ

۵۔ موم بتی

۶۔ دلربا

(افسانے اور افسانوی نثر)

حرف اول

کچھ عرصہ ہوا اردو کے نوخیز افسانہ نگار آغا اشرف نے مجھے اپنے چند مطبوعہ افسانے پڑھنے کے لئے دئے تھے۔ میں نے انہیں پڑھ کر محسوس کیا ہے کہ مصنف نے نہایت دور اندیشی کے ساتھ اپنے مطالعے اور مشاہدے کو ایک ہی موضوع کی حدود میں محصور کر دیا ہے۔ اُنکھوں نے اپنی نگارش لطیفہ میں فنی منطق اور جغرافیائی حقائق پر اچھے افسانے لکھنے والوں کی صف میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

اس جادہ فن پر منتو نے جو آثارِ سفر چھوڑے ہیں، وہ قابلِ مطالعہ ہیں اور آغا اشرف کو انہیں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان افسانوں میں وہ منتو کے بہت قریب ہیں۔

(مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم))

یہ انشا پر داز (آغا اشرف) جذبات انسانی کی گہرائیوں کو ٹٹولنے اور
موثر طریق پر انہیں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
(مولا نا) عبد المجید سالک مرحوم) (راقب اس از تبصرہ)

یہ کتاب انشا پر داز (آغا اشرف) کی جذبات انسانی کی گہرائیوں کو ٹٹولنے اور
موثر طریق پر انہیں بیان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔
(مولا نا) عبد المجید سالک مرحوم) (راقب اس از تبصرہ)

”آم کی گھٹلی“

کالی گھٹا چھائی تھی۔ پروا کے بھیگے بھیگے جھونکے یوں چھینک رہے تھے۔
جیسے کسی چنچل چھوری کی چھاگل کے گھنگرہ داس کی گوری گوری پنڈلی سے ٹکرا کر
چھینک جائیں۔ مادھو مالی آموں کا ٹوکہ اٹھائے چونگی کے چوراہے میں آ بیٹھا۔
اور ہانکا دینے لگا۔

”آم سندھوری آم۔ مصری کی ڈلیاں۔ شہد کے ڈونے۔ برکھانے

رس ٹپکایا۔ مادھو مالی چُن چُن لایا۔“

سندھوری آم مادھو مالی نے ٹوکے میں بڑے قریب سے چُنے ہوئے
تھے۔ جیسے ہونٹ کے اوپر ہونٹ دھرا ہو۔ کہیں کہیں کسی آم کے ساتھ ہر اپتہ
چپکا ہوا تھا۔ جسے دیکھ کر یہی گماں ہوتا تھا کہ کسی پری زاد کے چہرے پر سبزہ
خط کا نشان ہے۔ آموں کی میٹھی میٹھی مہک نے چونگی کے چوراہے کو مہکا دیا تھا۔
”ارے مادھو کے سیر دیئے ہیں شہد کے ڈونے؟“ مادھو کے پرانے
گاہک مرلی دھرنے پوچھا۔

”بہت سستے۔“ مادھو نے جواب دیا۔ ”دکوڑیوں میں باغ لٹا

دیا ہے۔ اوروں سے ڈھالی آپ سے دو۔“

”ارے مادھو اتنے مہنگے۔ تو آم بیچتا ہے رس گلے؟“ مرلی دھرنے

طنز کی۔

”کوی جی رس گلے ان آموں کے آگے کیا چیز ہیں۔“ مادھو نے آم اٹھا کر انگلیوں کی پوروں پر دھرتے ہوئے کہا۔

”دیکھو نا کیسر کی کل۔ برکھا کی بیر ہوئی۔ ایک چسکی تو لے کر دیکھو۔ بوسے کا مزانہ آٹے تو کوڑی نہ لول گا۔“

”دکھلا تو بھلا۔“ مرلی دھرتے آم لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ مد سخت ہاتھ نہ لگانا کوی جی۔ کایج کی کلی بڑی نازک ہے۔“ مادھو نے آم اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے مادھو یہ تو داغی ہے۔“ مرلی دھرتے کہا۔
”یہ دیکھ داغ۔“

”اجی واہ۔ کیوں خواہ مخواہ میری ہوا خراب کرتے ہو کوی جی۔ یہ داغ نہیں کوئل کے بوسے کا نشان ہے۔“ مادھو مالی نے کہا اور مرلی دھر پٹک اٹھا۔ آخر شاعر تھا۔ کہنے لگا۔

”مادھو تول دے دوسر کوئل کے بوسے۔ رام جانے بات نہیں کہی تو نے ایک شعر کہا ہے۔“

مادھو نے دوسر آم تول دیئے۔ مرلی دھر گیا تو چپا کو لیے مٹکاتی آگئی۔ ”مادھو آج تو آم کھانے کو جی چاہتا ہے۔ بولو کھلاؤ گے؟“ چپانے آنکھوں میں آموں کا رس چپکاتے ہوئے کہا۔

”کھا لو جتنے جی چاہے۔“ مادھو نے کہا۔ ”ٹوکر اتمارے آگے دھرا ہے۔“

”ام ایس نہیں کھائے جاتے۔“ چمپا نے آنکھیں مٹکائے ہوئے کہا۔

”یوں مزانہ آئے گا۔“

”مز اچھر کیسے آئے گا؟“ مادھو نے پوچھا۔

”میرے چارے میں آؤ گے تو بتاؤں گی۔“

”اچھا تو میں آؤں گا۔“

”کب آؤ گے؟“

”ام بیچ کر۔“

”ام کب بکیں گے؟“

”ابھی بک جائیں گے۔ چھینٹے پڑنے کی دیر ہے۔“

”اچھا تو میں جا کر بیٹھے پکوان بناتی ہوں۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ مادھو نے کہا۔ ”تم جا کر پکوان بناؤ۔ میں

اتنے میں ام بیچ کر آ جاؤں گا۔“

”ذرا جلدی کرنا۔“ چمپا نے جاتے ہوئے تاکید کی۔

”مادھو کے ام بہت جلدی بک جاتے ہیں۔ مسخرا کے پیڑے

بیچتا ہے مادھو۔ یہ ام لیتی جاؤ برف میں لگا دینا۔“ مادھو نے کہا۔

اور اپنی مرضی کے اچھے اچھے ام چن کر ٹوکری میں ڈال دیے۔ چمپا ام لے کر

ہنستی ہوئی چلی گئی۔ مادھو پھر ہانکے دینے لگا۔ اور آموں کے گاہک دھڑا

دھڑا آنے لگے۔ ٹوکرا رفتہ رفتہ خالی ہونے لگا۔ برکھا کے چھینٹے پڑ رہے تھے۔

مادھو چمپا کی پُرسن مالتی کے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ مالتی کسبن مادھو پور

رہنے والی تھی۔ بڑی ٹٹ کھٹ۔ کہتے تھے اس میں مادھو پور کی بڑی کی
مٹھاس تھی۔ اُسے بہت سے فلمی گیت یاد تھے۔ وہ فلمی گیتوں کا چلتا پھرتا
سنگیت تھی۔ کاٹھ بازار کے کن رسیوں نے اس کا نام سارنگی رکھا ہوا تھا۔
کیونکہ اس کے گلے میں سارنگی کے پردے لگے ہوئے تھے۔ بڑی سری
تھی اس کی آواز۔ لیکن ہر شخص کن رسیا نہیں ہوتا۔ سُر کی پہچان بڑی مشکل
ہے۔ بجانے کے شوق میں مادھو نے عطائیوں والا ہاتھ مارا تو گیتوں بھری
اُس سارنگی کے سارے سُر خراب کر کے رکھ دیئے۔ گیت بیمار ہو گئے۔
مالتی اس سے ناراض ہو گئی۔ ویسے دیکھنے میں تو مادھو بڑا پتلا و بلا ماشہ بھرکا انسان
تھا۔ لیکن نہ جانے اس میں یہ کیا بات تھی کہ کوئی بھی کسب دوبارہ اُس سے آنکھ
نہ ملائی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی دور سے اُسے سلام کر دیتی تھی۔ اس کے بعد
مادھو کئی بار مالتی سے ملنے آیا لیکن اس نے سیدھے منہ بات ہی نہ کی۔ آخر
مادھو نے بھی دل میں یہ بات پکی کر لی کہ دل لگی کے لئے اب کوئی نئی دنیا ہی
دیکھیں گے۔

کئی دنوں سے اس کی نظر میں چمپا کے نقشے اترنے لگے تھے۔ مالتی اگر
مولسری کا بھپول تھی تو چمپا بھی چمپا کلی تھی۔ اور پھر سب سے بڑی خوبی اس میں
یہ تھی کہ اس کے منہ میں مینا کی زبان تھی۔ جب وہ مشک مشک کر باتیں کرتی
تھی۔ تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نضطوں کو چوم چوم کر ادا کر رہی ہو۔
پہلے دن جب مادھو نے اس کے ساتھ تعارفی گفتگو کی تو اس نے مادھو
کا من موہ لیا۔ اور وہ چمپا کا چکور بن گیا۔ اس نے چمپا سے کہا۔

”چمپا مجھے اپنا بنا لو۔“

اور چمپا نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اپنا ہی سمجھتی ہوں مادھو۔ پر تو بھی

اپنوں کی سی بات تو کر۔“

”بتاؤ میں کیا کروں؟“ مادھو نے کہا۔ ”مجھے اپنے دل کی بات بتا دو۔“

”مجھے اُرسی اور کچھوے لادے۔“ چمپا نے کہا۔

”اچھا تو لادوں گا۔ مجھے ایک ہفتہ کی ہلت دے دو۔“

اور آج اس وعدے کی میعاد گزر چکی تھی۔ آموں کا تو ایک بہانہ تھا۔ چمپا تو

در اصل اُسے اس کا وعدہ یاد کرانے آئی تھی۔ اور اسی لئے اُسے اپنے چہرے

میں بلا گئی تھی۔ مادھو ساری بات سمجھ گیا تھا۔ لیکن اب کوئی فکر کی بات نہ تھی۔ آٹھ

دنوں میں اُس نے کافی رقم جمع کر لی تھی۔

پردہ والے کمرے کے چھینک رہے تھے۔ ننھی ننھی بوندوں کو دیکھ کر یہی گمان ہوتا

تھا کہ گھٹاؤں سے چمپا کی کلیاں برس رہی ہیں۔ اور مادھو کو یوں محسوس ہوا جیسے

چمپا ساری چیزیں تیار کر کے چہرے میں بیٹھی اُسے یاد کر رہی ہے۔ اُسے بلا

رہی ہے کہ مادھو اب ابھی جاؤ۔ یہ کالی گھٹائیں یونہی نہ گزر جائیں۔ پردہ والی پائل

کے گھنگرے دکھائی کھینکا کرتے ہیں۔ مگر آم تو جب تک ان کی رت ہے ہر روز

بکا ہی کرتے ہیں۔ بکتے ہی رہیں گے۔ بک ہی جائیں گے۔ آج نہیں کل۔ کل نہیں

پیرسوں۔ یہ آم جو تو بیچ رہا ہے نیم کی نم کو لیاں ہیں، محبت کے آموں کے مقابلے

میں۔ وہ آم جب تک انسان جیتا ہے اس کی زندگی میں جھک پیدا کر دیتے ہیں۔

یہ آم تو باسی ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت کے چمن کے آم کبھی باسی نہیں ہوتے۔ اس

ٹوکرے کو اٹھا کر کہیں رکھ دو۔ اور پردا کے چھنکنے ہوئے جھونکوں پر چھنکنے
چلے آؤ۔ جھونکے چھنکے۔ بادل گر جا۔ کوندا لپکا۔ کالی گھٹائیں اور جھک گئیں۔ برکھا
کی رانی بوندوں کے جلت رنگ پر مسکھ ملہا۔ بجانے لگی۔ اور مادھو نے ٹوکرے اٹھا
کر نیلام کر دیا۔ امراؤ جی حلوائی کی بولی بڑھی۔ ایک۔ دو۔ تین۔ پندرہ روپے۔
مادھو نے ٹوکرے اٹھا کر امراؤ جی کے آگے دھر دیا۔ اور رقم جیب میں ڈال کر
چمپیت ہو گیا۔

امراؤ جی حلوائی نے پیچھے سے آواز دی۔

”اے چورنگی کے چمپے اپنا ٹوکرے اتولیتا جا۔“

اور مادھو نے جاتے جاتے کہا۔ ”سیٹھ جی آم تو کھا لو ٹوکرے ابھی آجائے گا۔“
جب مادھو چمپا کے چبارے میں پہنچا تو گھٹائیں کھل کر برس رہی تھیں۔
کہیں قریب ہی کوئل کی کوک رہ رہ کر کوندے کی طرح لپک جاتی تھی۔ اور سب
چیزیں تیار پڑی تھیں۔

چمپا نے مادھو سے کہا۔ ”ویسے تو سب کچھ موجود ہے مادھو۔ پر
مدھیرا نہیں ہے۔ اور اس کے بغیر تو تم جانو ہو مزانہ آٹے کا آم کھانے
کا۔ اور کوئل کو سنو کیا کہتی ہے۔ پی۔ پگلے جی بھر کر پی۔ گھٹاؤں سے
مدھیرا ہی تو برس رہا ہے۔ جو نہ پیئے وہ پاپی۔ پیو اور پیار کرو۔
دیئے کو جلانے سے پہلے اُس میں تیل ڈالا جاتا ہے۔ پھر دیا جلتا
ہے۔ پتنگے آتے ہیں۔ پریم کی راس رچاتے ہیں۔ پتنگے پریم کی آگ کو
پی جاتے ہیں۔ تم مدھیرا نہیں پیو گے مادھو؟“

”ضروریوں گائے“ مادھو نے کہا۔ ”ابھی منگوا لو۔ مدھیرے اور مادھو

میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔“

”ایسی رات میں تو چھانسی کی رسیل رس گھولتی ہے۔ آموں کے
رس سے تیار کرتے ہیں۔ سندھوری آموں کے ساتھ بس مزای
تو آجائے گا۔“

”تو بس پھر رسیل ہی منگوا لو۔“ مادھو نے کہا۔ ”میں رس میں بس
تو نہیں گھولوں گا۔“

چمپا نے کھڑکی کھولی۔ کالی گھٹائیں اور گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ بارش کی
ہلکی ہلکی دھند میں ڈفرن برج کے اُس پار بہتی ہوئی جمنا سفید لکیر سی معلوم ہوا ہی
تھی۔ اور مادھو کے اندر کا ہوا برساتی نالہ بھی بہہ نکلا۔ چمپا کے کالے لالے
بال جھونکوں سے اس کے کولہوں پر لہرا رہے تھے۔ وہ ان کے ساتھ کھینچنے
لگا۔ چمپا نے سر میں چنبیل کا تیل لگایا ہوا تھا۔ تیکھی تیکھی خوشبو سے مادھو کے
من میں لگا ہوا آموں کا باغ بھی مول اٹھا۔ اس باغ کے ہر پتھر کی ہر شاخ سیٹھی
سیٹھی تھک والے پور سے بھر گئی۔ اس وقت وہ بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس
دن کے انتظار میں اس نے کئی دن بڑی بے چینی میں گزارے تھے۔

چمپا کے کالے کالے بال کا جل بن کر اس کی آنکھوں میں پھینے لگے۔ آنکھوں
کا سنگار۔ کا جل۔ آنکھوں میں ڈالنا تو سب کو آتا ہے لیکن اس کو ٹمکانا کسی
کو آتا ہے۔ چمپا نے بھی آنکھوں میں کا جل ڈالا ہوا تھا۔ اور وہ کا جل کو ٹمکانا
بھی جانتی تھی۔ جب وہ آنکھوں کو لٹو کی طرح کھما کر کا جل ٹمکاتی تھی تو یوں

معلوم ہوتا تھا۔ جیسے برکھا کی بھگی بھگی کالی راتیں اس کی ٹپکوں کی کالی جھالروں کو ہٹا کر مادھو کے من میں جھانک رہی ہیں۔

چمپا نے چاندنی ہوٹل کے پیرے باورے کو آواز دی۔

”باورے ارے باورے۔“

”کیا بات ہے چمپا بائی؟“ باورے نے ہوٹل کے دروازے میں آتے

ہوئے نیچے سے آواز دی۔

”ہمیں رسیلی دے جا۔“ چمپا نے کہا۔

”ابھی لایا۔“ باورے نے جواب دیا۔

چمپا کھڑکی سے پیچھے ہٹی اور میٹھے میٹھے سروں میں ٹھکنے لگی۔

ساون کا مہینا ہے

ساجن سے جدا رہ کر جینا کوئی جینا ہے

کتنی میٹھی تھی چمپا کی آواز۔ جیسے یکدم بہت سی سریلی بانسریاں بجنے لگیں۔

مادھو کو یوں محسوس ہوا جیسے چمپا نے اپنی کالی کالی زلفیں اس کے گرداگرد

پھیٹ کر زور سے جالی ماری ہے۔ اور وہ لٹو کی طرح زمین پر گھومنے لگا ہے۔

”مادھو میری آرسی اور بچپوے نہیں لائے۔“ چمپا نے ساڑھی کا انھل

سنجھال کر پھیری لیتے ہوئے کہا۔

”اپنا بول بچن بھول گئے نا۔“

”ہیں اپنا بول بچن بھولا نہیں کرتا چمپا۔“ مادھو نے اپنے سلو کے کی جیب

سے دس دس کے تین نوٹ نکال کر چمپا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”لو اپنی مرضی کی آر سی اور اچھے سے بچھوے خرید لینا۔“
اور چمپا خوش ہو گئی۔ مادھو کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔
”تم بڑے اچھے ہو مادھو۔“

اتنے میں بادرا سیلی کی بوتل لے آیا۔ اور رس گھلنے لگا۔ کوئل کی کوک کے
کوندے لپکتے رہے۔ گھٹائیں کھل کھل کر برستی چلی گئیں۔ پروا کی پائل کے گھنگرو
دہ رہ کر چھٹکے۔ اور سیلی کے رسیا پیتے پیتے خود بھی رسنے لگے۔

رسیلی کا رس مادھو کے حلق سے نیچے اترتے ہی پس بن گیا تھا۔ آج تک
اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ وہ پینے پر آتا تھا تو کافی پی جاتا تھا۔ مگر آج تو
دو ہلکے ہلکے ہوروں نے اس کی رگ رگ کو کھینچ کھینچ کر توڑ دیا تھا۔ کتنی آگ تھی
رسیلی میں۔ مادھو دو گھونٹ بھی نہ لے سکا۔ سر سے لے کر پاؤں تک پسینے
میں شرابور ہو گیا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ رسیلی اس کے دل کو چاٹ رہی تھی۔

اس کے دل کا رس چوس رہی تھی۔ انسان کا دل ایک آم ہی تو ہے۔ جس میں ساری
زندگی کا رس رکتا ہے۔ اور جب یہ رس نہیں رہتا تو انسان بالکل چوسے
ہوئے آم کی طرح ہو جاتا ہے۔ چھلکے اور گھٹلی۔ ہڈیاں اور مردہ گوشت۔ جس میں
خون نہ ہو۔ رس نہ ہو۔ رونق نہ ہو۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا آم۔ مردہ جسم۔ پیچ و
خم کھاتا ہوا ناگ نکل جاتا ہے۔ اور اس کی سپید کچلی رہ جاتی ہے۔

ایکا ایک مادھو کا جی متلانے لگا۔ اس نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی۔ مگر نہ
سنبھل سکا۔ اُسے ابکاٹی آرہی تھی۔ اس نے اچھلتی ہوئی طبیعت کو روکنے کی بہت
کوشش کی۔ لیکن نہ روک سکا۔ پاس ہی اگا لدان پڑا تھا۔ رسیلی اور آموں کا جھاگ

کی طرح ابلتا ہوا اس گنہگار ہٹ کے ایک ہی جھٹکے میں اس نے اگل گیا اس
قے کر دی۔

چمپا مسکرا رہی تھی۔ مادھو دل ہی دل میں شرم سی محسوس کر رہا تھا۔
کاٹھ بازار کا بھیم سین۔ مادھو مانی۔ جس کی شکل دیکھتے ہی ہر کسب اُسے
دور سے سلام کر دیتی تھی۔ اس سے آنکھ نہ ملاتی تھی۔ اس وقت چمپا سے
آنکھ ملاتے ہوئے شرما رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا چمپا اس کے متعلق اپنے
دل میں جانے کیا کہتی ہوگی۔ کتنی گندی چیز ہے۔ معاً اس کی نظریں ایک بار
پھر اگالڈان کی طرف اٹھ گئیں۔ بڑے اچنبہ کی بات تھی۔ اس سے پہلے
اس کے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اگالڈان
سے دبی دبی بو آرہی تھی۔ مادھو پانی سے منہ صاف کرنے کا بہانہ کر کے
سیڑھیوں کی طرف سرک گیا۔ اور چمپا نے رسیلی کے دو گھونٹ اور پیئے۔
بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ مادھو چمپا کے چہرے کے سامنے شہراتی
چھاڑی کی دکان پر کھڑا ہو گیا۔ اور اچھلتے ہوئے دل کو سنبھالنے کی غرض
سے اس نے الاچی والا پان کھایا۔ اس کا منہ سخت بد مزہ ہو رہا تھا۔ ہزار
لعنت ہے ایسی رسیلی پچہ اونچی دکان اور پھیکا پکوان۔ جھمک امرت کی اور
اندر اس کے سنگھیا۔ بوتل دیکھو تو کتنی دلکش تھی۔ اور رسیلی کی رنگت میں بھی
کافی رس تھا۔ مگر پینے سے اس نے کتنی بد مزگی اور بے چینی پیدا کر دی تھی۔
پھر کبھی بھول کر بھی رسیلی نہ پیوں گا۔ مادھو نے کان پکڑے۔ جو پھر کبھی رسیلی
پئے رام قسم اپنا خون پیئے۔ جھانسی کی یہ پھانسی بڑی خوفناک ہے۔ بڑے

پیارے سے گلا گھونٹتی ہے۔ ہڈی ہڈی سے دھواں نکال دیتی ہے۔ بس کی
بھری ناگن رام قسم بڑی زہریلی ہے۔ اب سے اپنے باوا کی بھی توبہ۔ مادھو
نے اپنے دل سے فیصلہ کر لیا تھا کہ پھر کبھی رسیل کے رس بھرے مینوں سے
نہیں لڑانے اور نہ کبھی اس کا رسیا بن کر اس کے رنگ محل میں آنا ہے۔
ایک قے اگر اوپر سے اور آجاتی تو مادھو مستحقرا پہنچ گیا تھا۔
چمپا ناگن کی طرح بل کھاتی ہوئی اکٹھی۔ کھڑکی میں چلی آئی۔ اور باورے کو
آواز دی۔

”باورے میری بات سن جا“
باورہ آیا۔ پوچھنے لگا۔ ”کیا بات ہے چمپا بانی؟“
”ہوٹل میں کابلہ غلا ہو رہا ہے؟“ چمپا نے پوچھا۔
”مادھو غل غیاڑہ کر رہا ہے۔“ باورے نے جواب دیا۔
”کیا غل غیاڑہ؟“ چمپا نے آنکھیں لٹو کی طرح گھماتے ہوئے پوچھا۔
”دکھتا ہے مالشیا بلاڈ۔ سر کے ساتھ میں بھی چکر کھا رہا ہوں۔
جلدی سے جنجر کی بوتل پلاؤ۔ میرا جی متلا رہا ہے۔ تم نے اسے
کیا کر دیا ہے بانی؟“

یہ سن کر چمپا نے ایک بے ساختہ قہقہہ مارا۔ اور روت میں لگا ہوا آم
اٹھا کر چوسنے لگی۔ اور پل کی پل میں اس نے چوسی ہوئی گٹھلی کوڑے کے
ڈھیر میں پھینک دی۔

آرک لائٹ

سٹوڈیو میں شوٹنگ ہو رہی تھی۔ کبھی اندھیرا۔ کبھی اجالا۔ کبھی دن۔ کبھی رات۔ ہیرا اور ہیروئن ایک آپ کے سٹ پر کیمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ اور سٹوڈیو کے غلام میں مختلف آوازیں گونج رہی تھیں۔

”لائٹس آن“

”لائٹس آف“

”بتی جلاؤ۔ بتی بجھاؤ“

”مس چاندنی کو ایک اور بے بی دو“

اور وہ گھبرا گئی۔ یہاں کنواریوں کو بھی بے بی دیئے جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک لائٹ کا نام تھا۔ سٹوڈیو میں آکے اُس نے بتیوں کے بھی نام سنے تھے۔ بے بی لائٹ۔ سن سپاٹ۔ سولر۔ ویٹ۔ آرک لائٹ۔

”آرک لائٹ آن“ یہ کیمرو میں کی آواز تھی۔ اور وہ پھر گھبرا کر سمٹ کر ایک تختے کے ساتھ لگ گئی۔ جیسے آندھی آ رہی ہو۔ آرک لائٹ۔ روشنی کے طوفان کا دوسرا نام تھا۔ لائٹ قلی جب اس لائٹ کو جلاتے تھے تو روشنی کا طوفان سا اٹھ آتا تھا۔ اس کی روشنی اتنی تیز اور گرم تھی کہ کپڑوں کے علاوہ گوشت اور ہڈیوں کو چیرتی ہوئی جسم کے پار نکل جاتی تھی۔ آرک لائٹ کا دوسرا نام پنجرہ بھی تھا۔ کیونکہ جلتے وقت اس کے اندر روشنی کا سرخ پنجرہ سا بھڑک

انٹ سے انٹی تک

اٹھتا تھا۔

کسی زمانے میں جبکہ وہ جاسوسی نامی پڑھا کرتی تھی۔ تو اس قسم کے نام اس کی نظر سے گزرا کرتے تھے۔ خونی پنچہ۔ آدم خور پنچہ۔ فولادی پنچہ۔ شیر کا پنچہ۔ موت کا پنچہ۔ بھوت کا پنچہ۔ لیکن آرک لائٹ کا بھڑکتا ہوا پنچہ سب سے زیادہ خوفناک تھا۔ سٹوڈیو کے اندھیروں اور اجالوں میں فلمی پنچے بڑے خوفناک کھیل کھیلتے ہیں۔

برکت ایکسٹرا سپلائی دوسری ایکسٹرا لڑکیوں کے ساتھ کل جب اُسے پہلی بار فلم میں ایکسٹرا کا کام کرانے کے لئے سٹوڈیو میں لایا۔ تو اس نے اس کا تعارف بڑے سیٹھ کے سائے چھوٹے سیٹھ سے کرایا تھا۔

”د سیٹھ جی نیا چہرہ۔“ برکت نے چھوٹے سیٹھ سے کہا۔

”بڑا اچھا فیس ہے۔“ چھوٹے سیٹھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ

چھوٹا سیٹھ ہونے کے علاوہ پروڈکشن انچارج بھی تھا۔

”نگہت ہے اس کا نام۔“

”بڑا اچھا نام ہے۔“

”نویں جماعت پاس ہے۔“

”ہوں۔“

”بڑے اچھے گھرانے کی لڑکی ہے۔“

”ہوں۔“

”پچاری کا باپ مر گیا ہے۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے۔“

”بیچاری کی ماں بہت بیمار ہے۔“

”بڑے افسوس کی بات ہے۔“

”روٹی پانی کا کوئی آسرا نہیں۔“

”اوہو۔“

”گھر کا سامان بیچ کر دقت گزار رہی ہیں۔“

”ہوں۔“

”اس کی ماں میری ماں کی بہن بنتی ہوئی ہے۔“

”اچھی بات ہے۔“

”میری ماں نے اس کی ماں کو بڑا مجبور کر کے اس کام پر راضی کیا ہے کہ نگہت میری سپرداری میں فلموں میں کام کرے۔ آخر روٹی پانی تو چلے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”سیٹھ جی بڑا اچھا فیس ہے۔ اپنی کسی کچھڑ میں ہیروئن کا رول دلوا

دونا۔ ستارے چمک اٹھے تو بیچاری کی زندگی بن جائے گی۔“

”اچھا تو میں بڑے سیٹھ سے بولوں گا۔“ چھوٹے سیٹھ نے کہا۔

”جاؤ تم کینٹن کے بیرے کو بولو چائے لائے۔“

برکت اس کا پڑوسی تھا۔ پرستان پارک میں اس نے ایک فلمی دفتر

کھولا ہوا تھا۔ جو فلمی شوق رکھنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے دن رات

کھلا رہتا تھا۔ جہاں سکرین پر ناچنے گانے والی پریاں فلمی اڈن کھٹولوں میں بٹھا کر

نگار خانوں کے اندھیروں اور اجالوں میں اتاری جاتی تھیں۔ سیٹھ کے ساتھ چائے پی رہی تھی کہ ڈار کٹر کا حکمنامہ آیا۔

”د ایکسٹرا لڑکیاں میک آپ کر کے پانچ منٹ میں تیار ہو جائیں۔“ اور میک آپ روم کا دروازہ بند تھا۔ فلم کے بڑے ایکٹر بڑے ٹھاٹھ سے بڑے بڑے آئینوں کے سامنے فٹری کیسل اور پیئر نمبر فٹری کے سگار ٹوں کے دھوئیں کے بادلوں میں بیٹھے سٹرونک چائے اور کافی پیتے ہوئے میک آپ کو رہے تھے میکس فیکٹر کے ایرومینک شیڈوں اور ٹکنی کلر فیس پوڈروں کی خوشبودار وارہ بند ہونے کے باوجود باہر تک پھیلی ہوئی تھی۔

ایکسٹرا لڑکوں اور لڑکیوں کی حیثیت سٹوڈیو میں فلم سٹاروں کے نزدیک بالکل اچھوت کی سی ہوتی ہے۔ لہذا آخر کی اس بھرتی کو سٹوڈیو کے ایک کونے میں جھونک دیا گیا تھا۔ اور اسسٹنٹ میک آپ مین جس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی۔ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے ایک بتی اپنی طرف کھینچ کر ٹوٹاپان کے ان پتوں پر کھتا چونا لگانے لگا تھا۔ ہر میک آپ مین۔ میک آپ مین ہونے کے علاوہ ایک ایسی شین ہے جو سٹوڈیو میں گہرے کے سامنے آنے والے چہرے کا بے جھجک اچھی طرح پوسٹ مارٹم کر سکتی ہے۔ کل جب شوٹنگ شروع ہوئی تو آرک لائٹ کا رخ اس کے چہرے کے بالکل سامنے تھا۔ اور پھر جب طوفانی بتی میں سرخ پنچہ بھڑکا تو اسے چکر آنے لگے تھے۔ اور چکروں کا یہ سلسلہ تو چھوٹے سیٹھ کی پیش کی ہوئی چائے پینے کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ سٹ کے اس پار چھوٹا سیٹھ لائٹ

قلیوں کی ایک ٹولی کے ساتھ کانا پھوسی کانفرنس کر رہا تھا۔ سٹوڈیو میں اس اتنی گہری خاموشی تھی کہ سوٹی گرنے کی آواز بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ کھسکھسپ کی آوازیں سن کر ڈاکٹر کے غصے کی آواز بھی بھڑک اٹھی تھی۔ وہ بے تحاشا گالیاں بکنے لگا تھا۔ اور پھر جب کمرہ دوبارہ سٹارٹ ہوا تو سٹوڈیو لائٹ چل گئی تھی۔ سب بتیاں بجھ گئی تھیں۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا تھا۔ جیسے آواز لائٹ کے بجھے ہوئے پنچے نے اس کی کلائی پکڑ کر اندھیرے کے اٹھاہ سمندر میں غوطہ مار دیا ہے۔ اور وہ یکدم بوکھلا گئی تھی۔ گہرا گئی تھی۔ اس نے چنچنا چاہا لیکن ڈاکٹر کی گالیوں کے خوف سے چیخ اس کے حلق ہی سے چپک گئی تھی۔ اور آواز لائٹ کے طوفانی پنچے باری باری اس پر جھپٹتے چلے گئے تھے۔ اور اس نے اپنے دل میں یہ بات پکی کر لی تھی کہ آئندہ کبھی بھول کر بھی سٹوڈیو میں نہ آئے گی۔ لیکن صبح ہوتے ہی وہ دس روپے جو اسے اس کی مزدوری کے ملے تھے دس منٹ میں خرچ ہو گئے تھے۔ اس کی ماں کو پھر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر بلایا گیا تھا۔ چھ روپے اس کی فیس کے چلے گئے۔ اور بقایا چار روپے جب ان کے پیٹ میں بھوک کی آواز لائٹ کا پنچہ بھڑکا تو تبسم ہو گئے تھے اور اُسے مجبوراً پھر سٹوڈیو میں آنا پڑا تھا۔

آج وہ بہ نسبت کل کے بڑی چوکس ہو رہی تھی۔ اس کی نظر چاروں طرف بڑی ہوشیاری سے کام کر رہی تھی۔ مٹی جلی آوازیں سٹوڈیو میں بدستور گونج رہی تھیں۔

”چودہ نمبر اوپر لو۔“

اور اس نے اپنی ہر چیز ٹوٹتے ہوئے اپنا جائزہ لیا کہ وہ کہاں ہے؟
اور یہ یا نیچے؟ زمین پر یا آسمان میں؟ لیکن وہ جہاں تھی ابھی تک وہیں تھی۔ لیکن
ہیرو اور ہیروئن کا کچھ پتہ نہیں وہ اب کہاں تھے؟ اندھیرے میں اُسے کچھ
دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”چودہ نمبر۔“ پھر وہی آواز گونجی۔

اور اُس نے بڑے غور سے اپنے آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ کہ یہ
چودہ نمبر کیسے کون ہیں؟ اس سے پہلے اس نے صرف دس نمبر کیسے دیکھے
ہوئے تھے۔ وہ اپنے کو کھٹے کی منڈیر سے لگی کھڑی تھی تو سپاسی چارپانچ
آدمیوں کو ہتھ کڑی لگائے لئے جارہے تھے، اور اس کی ماں نے اُسے
بتایا تھا۔

”یہ اس علاقے کے دس نمبر کیسے ہیں۔“

ستائیس نمبر کو ہار ڈکرو۔“ معلوم نہیں یہ کس کی آواز تھی لیکن کافی سے
زیادہ ہار ڈکھتی۔

”ہار ڈ۔ اور ہار ڈ۔ سوفٹ کرو۔ اور سوفٹ کرو۔

بس ٹھیک ہے۔“

”نمبر اٹھارہ میں کپڑے کا ڈفیوزر ڈالو۔ نہیں شیشے کا۔“

اس کا خیال تھا کہ شاید اب گوشت کے ڈفیوزر کی باری آئے گی۔ اور

گوشت نہ جانے کس کا اور نہ جانے کہاں سے لیا جائے گا۔ لیکن آواز یکدم

خاموش ہو گئی اور اُسے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ڈفیوزر کپڑے کا ڈالا گیا یا شیشے کا؟

کپڑے کس کے اتارے گئے؟ اور شیشے کس شیش محل کے تھے؟ اُسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

”رہرسل“ یہ ایک نئی آواز تھی۔

”کیمبرہ ریڈی“

”لیس ریڈی۔ اوکے“

”آل لائٹس“

”رہرسل“

ساونڈ ٹرک کی سیٹیاں ”خاموش۔ خاموش“

”میڈم چاندنی اور سورج کمار ریڈی“

اور فلمی دنیا کے چاند سورج ڈائلاگ بولنے لگے۔

”بستی کے پرہ دار سو گئے ہیں“ ہیرو نے کہا۔

”کتے بھی سو گئے ہیں“ ہیروئن نے کہا۔

”بھگوان بھی سو گیا ہے“

”انسان بھی سو گیا ہے“

”شیطان جاگ رہا ہے۔ یہ کبھی نہیں سوئے گا۔ یہ کبھی سو ہی نہیں

سکتا“

”چلو بھاگ چلیں“

”کدھر؟“

”کھلتے۔ تم رس گلے کھانا۔ میں بارہ من کی دھوبن دیکھوں گی“ اور پھر

ساؤنڈ ٹرک کی دو سیٹیاں بھیں۔ ”اد کے۔“

”مس چاندنی کی لپ اسٹک ٹھیک کر دو۔“

اور اس کا خیال تھا شاید مس چاندنی کا اور بھی کچھ ٹھیک کیا جائے گا لیکن معاملہ لپ اسٹک سے آگے نہ بڑھا۔

”سورج کمار کی ناک چمک رہی ہے۔“ یہ ڈائریکٹر کی آواز تھی۔ جسے اُس وقت شاید ہیرو کی ناک ہی نظر آ رہی تھی۔ ورنہ اس نامراد کی تو اس وقت آنکھیں بھی بلی کی طرح چمک رہی تھیں۔

”فوکس۔“

”پانچ فٹ ساڑھے گیارہ اپنچ۔“

یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ معلوم نہیں مس چاندنی کی لپ اسٹک ناپی گئی یا سورج کمار کی ناک۔

”لینز بدلو۔“ یہ کیمرو مین کی آواز تھی۔

اور یہ جملہ بھی اس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ لینز کیمرو کے بدلے جا رہے ہیں یا ڈائریکٹر کی عینک کے۔

”سیونٹی فور لگاؤ۔“

یہ بھی ایک معمہ سی بات تھی۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نمبر کسی انسان کو لگایا گیا یا گاڑی کو؟

”خاموش۔ وی آر شوٹنگ (we are shooting)“

”ساؤنڈ ریڈی۔“

ساؤنڈ کیا وہاں بھی ریڈی تھے۔ اور وہ بھاگ کر سٹوڈیو سے باہر نکل گئی۔
وہ اپنے گھر جانا چاہتی تھی۔ آسمان کی آرک لائٹ پسیدے کے لائٹ سے
درختوں کے اُس پار افق کے کنارے پر بکھر رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں
اس کی ماں کی تصویر ابھرائی۔ پتی۔ دُہلی۔ زرد بڑھیا۔ زندگی کی بھی ہوئی آرک
لائٹ جس کے دل کو نہ جانے کس خونی پنجے نے دیوچ لیا تھا۔ اگر آج اُسے
یہاں سے اس کے سارا دن کام کرنے کی مزدوری دس روپے نہ مل سکے۔
تو اس کے گھر میں دل کو پکڑ کر ہانپتی ہوئی آرک لائٹ ہمیشہ کے لئے بکھ جانے
کا اندیشہ تھا۔ معاً اُسے خیال آیا۔ ڈاکٹر صبح اس کی ماں کو پھر ٹیکہ لگانے آ رہا تھا
اور وہ فلم کمپنی کے بیرونی دروازے سے واپس لوٹ آئی۔ قسمت کی بھی
ہوئی آرک لائٹ۔

”ایک کے بعد ایک“

[اس افسانے کا عنوان کانگریسی تھا۔ لیکن محترم بھائی
اشفاق احمد صاحب سابقہ ایڈیٹر لیل و نہار نے
اس کا عنوان ایک کے بعد ایک کر دیا۔ لہذا
اس افسانے کو اس مجموعہ میں شامل کرتے ہوئے
میں نے ان کے عنوان کو نہیں بدلا۔]

ہر چیز کمر میں چھپی ہوئی تھی۔ جھیل کے چاروں طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے
چنار کے درخت، صنوبر کے درخت، ان کے پس منظر میں اونچے اونچے
برف پوش پہاڑ اور جھیل کا نیلا نیلا پانی بھی۔ ہر چیز کمر میں چھپی ہوئی تھی۔ کئی
روز سے لگاتار پہاڑوں پر برف گہری رہی تھی۔ اور سردی پہلے سے زیادہ
بڑھ گئی تھی۔

بوڑھے رحمان نے فرغل کا چاک بند کیا۔ جھیر جھیری لی۔ چند یا کو تاخوں سے
کھیر کھیر کر بیدا۔ پیال کے ڈھیر پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نے ڈونگے
سے باہر نظر دوڑائی۔ کمر کے بادل اور زیادہ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔
انہ جھیرا بڑھ رہا تھا۔ اس نے جیب سے ماسک نکال کر بتی جلائی۔ اور فرغل کی
جیب سے ایک خط نکال کر بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ برف چاٹ کر
آتی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں تیز تیز چلنے لگیں۔ اور کمر کے بادل کھیریلوں سے

سرک سرک کر ڈونگے کے اندر آنے لگے۔

بوڑھے رحمان نے کانگری ٹی اٹھا کر گود میں رکھ لی۔ نسوار کی چٹکی بھر کر منہ میں ڈالی اور چند یا کو کہہ دیتے ہوئے کمر کے بادلوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے خیالات اس کی کھوپڑی میں کمر کے بادلوں کی طرح پھیل رہے تھے۔ کافی دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ اور پھر جھرجھری لیتے ہوئے اٹھا۔ ایک ہاتھ سے فرغل کے چاک کے دونوں کنارے سینے پر سمیٹ لئے۔ اور دوسرے ہاتھ سے کانگری ٹی اٹھاٹے چل دیا۔ کانگری ٹی میں آگ دھک رہی تھی۔

تیز تیز چلتا ہوا وہ ڈونگے کے اس کمرے میں پہنچ گیا۔ جہاں بیگیاں بیٹیاں اور ان کی بوڑھی نانی ایک بہت بڑی کانگری ٹی کے پاس کھیل میں لپٹی پڑی تھیں۔ ایک ایک بڑھیا کو کھانسی اٹھی اور وہ کھانستے کھانستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ اس نے بلغم کا لچھا حلق سے کھینچ کر حلال میں اچھالا اور کانگری ٹی کی طرف سرک گئی۔ اگر رحمان جلدی سے آگے نہ نکل جاتا تو بلغم کا گولا سیدھا اس کے وجود سے چمٹ جاتا۔

”دیدہ۔“ رحمان نے رپی آواز میں بڑھیا کو پکارا۔ ”دیدہ۔“
”کیا ہے رحمان؟“ بڑھیا چونک پڑی۔ اور اس نے اکھڑے اکھڑے سانس لیتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“

”لاہور سے قادر بھائی کا خط آیا ہے۔“ رحمان نے بڑھیا کو خوشخبری

سنائی۔

”قادر کا خط۔“ بڑھیا کا زرد چہرہ خوشی سے یکدم دمک اٹھا۔
”میرے قادرے کا خط آیا ہے۔“ بڑھیا نے اچھے اچھے سانسوں کو
سنہیالتے ہوئے کہا۔ اور کبل سے باہر نکل کر کانگری کی پاس بیٹھ گئی۔
”ہاں دیدی۔ قادر بھائی کا خط آیا ہے۔“ رحمان نے کہا اور کانگری کے
پاس ہی بیٹھ گیا۔

”کیا لکھا ہے خط میں؟“ بڑھیا نے پوچھا۔
”بڑی خوشی کی بات لکھی ہے خط میں۔“ رحمان نے جواب دیا۔
”وہ کیا؟“ بڑھیا نے جوش مسرت سے ہانپتے ہوئے پوچھا۔
”جلدی بتا مجھے کیا لکھا ہے خط میں؟“
”اچھے گرمیوں میں ہم کم سے کم چار ٹونگے بنا سکیں گے۔“ رحمان نے کہا۔
”وہ کیسے؟“ بڑھیا نے چہرے پر مسرت اور حیرت کے ملے
جلے اثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”قادر نے لاہور سے روپیہ بھیجنے کو لکھا ہوگا۔“
”نہیں۔ میں لاہور جا رہا ہوں۔“ رحمان نے مختصر سا جواب دیا۔
”کیا قادر نے بلایا ہے؟“ بڑھیا نے پوچھا۔
”ہاں۔“ رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
”قادر بھائی نے لکھا ہے خط دیکھتے ہی چلے آؤ۔ اور بیگیاں کو ضرور
غور اپنے ساتھ لیتے آنا۔“

”اور کیا لکھا ہے خط میں؟“ بڑھیا نے متبسم لہجہ میں پوچھا۔
”قادر بھائی نے دو تانگے بنائے ہیں۔“ رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”ایک مکان خریدا ہے۔ اور آٹھ سو روپیہ ڈاکٹرانے میں جمع ہے۔“
”اچھا۔“ بڑھیا کا منہ ہلکے کی چوہ کی طرح کھل گیا۔
”اب تو امیر کبیر بن گیا ہے میرا قادر۔“ بڑھیا نے کہا۔
”اور میں کنگال ہی رہا دیدی۔“ رحمان نے دونوں ہاتھوں سے سر پٹتے ہوئے کہا۔

”اپنی اپنی قسمت ہے دیدی۔“
”تو نے خط کس سے پڑھایا ہے رحمان؟“ بڑھیا نے معنی خیز نظروں سے رحمان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں۔ کیا بات ہے دیدی؟“ رحمان نے سوال کیا۔
”کچھ ان پڑھ جان کر تیرے ساتھ کسی نے ٹھٹھانہ کیا ہو پگھے۔“ بڑھیا نے کہا۔

”منشی جی سے پڑھوایا ہے میں نے خط۔“ رحمان نے کہا۔
”بس تو پھر سمجھ لے یہ بات سچ ہے۔“ بڑھیا نے بڑے وثوق سے کہا۔ منشی جی نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ پیر فقیر کے ماننے والے ہیں۔ اور بتا
کیا لکھا ہے خط میں؟“

”اور لکھا ہے بھابی کل دامن ابھی تک اچھی نہیں ہوئی۔ ایک ٹیکہ دن میں

لگتا ہے اور ایک رات میں۔ گرم اور کھٹی چیز کا ڈاکٹر نے پرہیز بتایا ہے۔ ایک ہاتھ اور ایک ٹانگ سوکھتی جا رہی ہے۔“
”ہائے میری بیٹی گل دامن۔“ بڑھیا کی آواز ایک ایکی حلق میں لہندھ گئی۔
بولی۔

”سدا کی روگن ہو گئی۔ اچھا ہودہ یہاں چلی آئے۔ اچھی ہو جائے گی تو دیکھا جائے گا۔ دنیا کے دھندے تو زندگی کے ساتھ ہیں۔“
”یہاں کیسے چلی آئے۔“ رحمان نے کہا۔ ”کام بڑا تیز جا رہا ہے۔“
”رحمان مجھے نسوار دے۔“ بڑھیا نے نسوار کی پوٹ نچلے ہونٹ تلے دباتے ہوئے پوچھا۔ ”تراکیا خیال ہے؟“
”میں تو سویرا ہوتے ہی بیگماں کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“ رحمان نے جواب دیا۔

”بڑی سردی ہے رحمان۔“ بڑھیا نے کہا۔
”سردی کیا ہمارے پاؤں پکڑے گی۔“ رحمان نے کہا۔
”دور ف سے سارے راستے بند ہو رہے ہیں۔“ بڑھیا نے کہا۔
”ہم پھاڑی ہیں دیدی۔“ رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
”ماں کی گود سے نکل کر ان برفوں ہی کی گود میں پلے ہیں۔ بس یہاں سے بیس میل تک راستہ خراب ہے وہاں سے ہم ریل میں بیٹھ کر لاہور پہنچ جائیں گے۔“
”تو پھر بیگماں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ بڑھیا نے کہا۔

”اکیلی یہاں اداس ہو جائے گی۔“

”اگلے سال۔“ رحمان نے کہا۔ ”ایک نجومی نے مجھے کہا ہے ریشیا رانی بنے گی۔ بڑی اچھی قسمت ہے اس کی۔ اگلا سال اس کے لئے اچھا ہے۔“

”خدا کرے۔ خدا کرے۔“ بڑھیا نے پینترا بدلتے ہوئے کہا۔
”نسوار کی ایک چٹکی مجھے اور دے۔“

رحمان نے بڑھیا کو نسوار دی اور ریشیا نے ایک لمبا خراٹا بھرتے ہوئے کروٹ بدلی۔ اور پنڈلی کھجانی لگی۔ ریشیا کے گوشت کی رنگت اور کانگری میں دہکتے ہوئے چیل کے کھوپے جیسے ایک ہور ہے تھے۔ بڑھیا اور رحمان اپنے اپنے خیالوں میں محو کافی عرصہ تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔
”اب سو جا رحمان۔“ بڑھیا نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔
”سویرے تجھے سفر پر جانا ہے۔“

”مجھے نیند نہیں آرہی دیدی۔“ رحمان نے کہا۔

”بس اب تو لاہور پہنچ کر ہی مزے سے سوؤں گا۔“

”خدا تجھے خیر سے لاہور پہنچا دے۔“ بڑھیا نے دعا دی۔

رحمان اپنی گنجی ٹانٹ کو کھجائے ہوئے اپنے بچھونے کی طرف سرک گیا۔ بڑھیا نے بڑی کانگری میں چیل کے دو تین کھوپے اٹھا کر پھینکے اور کبل تان کر سو گئی۔ رحمان ساری رات بچھونے پر اکڑوں بیٹھا رہا۔ اور اس کی کھوپڑی میں اس کے خیالات کر کے بادلوں کی طرح پھیلتے رہے۔

رات تھوڑی باقی رہ گئی تھی کہ بڑھیا جاگ اٹھی اور اس نے ریشماں کو
شانے سے پکڑ کر بلاتے ہوئے کہا۔

”ریشماں - اور ریشماں۔“

”کیا ہے دیدی؟“ ریشماں نے کسی قدر برہم ہو کر نیند بھری آواز میں کہا۔
”مجھے سونے دو دیدی۔“

”اکھٹو میری بیٹی اکھٹو۔“ بڑھیا نے بڑے پیار سے کہا۔

”صبح ہونے والی ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ آج تم اپنے

بابا کے ساتھ لاہور جا رہی ہو۔ اپنے چچا قادر کے پاس۔ اپنی چچی

گل دامن کے پاس۔“

”اور کیا بیگماں بھی جائے گی؟ ریشماں نے خوشی سے لپکتے ہوئے پوچھا۔

”آہستہ بول آہستہ۔“ بڑھیا نے دبی آواز میں کہا۔

”کہیں سن نہ لے بیگماں۔ تیری چچی نے تو تجھے اپنے پاس بلایا ہے۔

بیگماں ابھی نہیں جائے گی۔“

لاہور۔ کتنا اچھا شہر ہے۔ لاہور۔ جہاں اس کا چچا اور چچی رہتے

ہیں۔ وہ لاہور کو دیکھنے کی بڑی شائق تھی۔ اپنے چچا اور چچی سے ملنے کی

بڑی شائق تھی۔ اس کا چچا شادی سے فوراً بعد اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور

چلا گیا تھا۔ اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ ریشماں کا چچا اپنی بھانج

کی موت پر بھی اپنے وطن نہ آیا تھا۔ حالانکہ اسے نارہیجا گیا تھا۔ جس کے جواب

میں اس نے ایک افسوس بھرا خط لکھا تھا اور معذرت چاہی تھی کہ کام بہت

ہونے کی وجہ سے نہیں آسکتا۔

ریشماں خوشی سے لہر کی طرح لہراتی ہوئی اٹھی اور تیار ہونے چلی گئی۔
ادھر رحمان اپنا بورہ بستر باندھنے لگا۔ بڑھیا نے اٹھ کر باجرے کی روٹیاں
پکائیں۔ شلغموں کا بھرتہ جلدی جلدی تیار کیا۔ اتنے میں بیگماں تیار ہو کر آگئی۔
آج اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں کا بنا ہوا زعفرانی جوڑا پہنا ہوا تھا۔ اوپر
پیشینے کی خاکستری فرغل اوڑھ لی ہوئی تھی۔ پاؤں میں لومڑی کی کھال کے چپل
تھے۔ جس میں اس کے گورے گورے پاؤں چھپ گئے تھے۔

بڑھیا نے ریشماں کو سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوما، گال چومے، ہونٹ
چومے، ایک جیب میں بنفٹے کی کلیاں اور دوسری میں چلغوزے اور اخروٹ
ڈال دیئے۔ اور پھر بڑھیا نے اپنی بوسیدہ فرغل کی جیب سے چھوٹی سی
ایک پوٹلی نکال کر کھولی اس میں کسیر کے پھول تھے۔ جن کو ریشم کی چھوٹی سی
تراش میں لپیٹ کر اس نے ایک تعویذ سا بنایا اور اسے ریشماں کے دائیں
بازو سے باندھ دیا۔ دعائیں دیں۔ لپک کر تین کانگرٹیاں اٹھالائی۔ ایک
کانگرٹی آگ سے بھر کر ریشماں کو پکڑادی اور دو کانگرٹیاں رسی سے باندھ کر
ریشماں کے کندھے پر ڈال دیں۔ بولی۔

”اچھی بیٹی یہ کانگرٹی تم اپنی چچی گل دامن کو دینا۔ اور یہ اپنے چچا
قادر کو۔ اور اپنی چچی سے کہتا۔ تیری دیدی تجھے بڑا یاد کرتی ہے۔
اُسے اپنے پاس بلا لے یا خود آکر اُس سے مل جا۔ بھول نہ جانا میری
باتیں۔ میرا پیغام ضرور دینا میری بیٹی کو۔“

اور ریشماں نے خوشی سے چپکتے ہوئے کہا۔

”ضرور دیدی ضرور۔“

”اب چلنا چاہئے۔“ رحمان نے کہا۔

”اس وقت کے چلے نہ جانے کب منزل پر پہنچیں گے۔“

”اچھا خدا حافظ۔“ بڑھیا نے کہا۔

”جاتے ہی اپنی خیر خیریت کا خط ضرور لکھنا۔“

”پانچویں چھٹے دن میرا خط تمہارے پاس آتا ہی رہے گا دیدی۔“ رحمان

نے کہا اور اپنا بستر اٹھا کر چل دیا۔

بڑھیا انہیں دو گنگے کے دروازے تک چھوڑنے آئی۔ اور خوشی خوشی

جاتی ہوئی ریشماں کا رخصتی بوسہ لیا۔ پیار بھرا ہاتھ سر پر پھیرا۔ اور اس عرصہ

تک دروازے میں کھڑی رہی جب تک کہ جانے والے اس کی نظروں سے

اوجھل نہ ہو گئے۔

کمر کے بادل بدستور ہر چیز پر پھیلے ہوئے تھے۔ مگر اب ان میں ہلکا ہلکا

نور گھلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کی نہ جانے کن چوٹیوں

پر شفق پھول رہی تھی۔ رحمان اور ریشماں شفق کے گلابی نور میں بڑھتے چلے گئے۔

یکے بعد دیگرے مسافت کی منزلیں طے ہوتی جا رہی تھیں۔ ہر منزل پر نئے

نئے مناظر کمرے سے نمودار ہو کر کمرے میں چھپتے جا رہے تھے۔ ندیاں، نالے،

دریا، آبشار، ہری بھری وادیاں، بنفے اور زعفران کے کھیت، مہکے مہکے

مرغزار اور پریچ گھاٹیاں قریب آ کر دور بھٹی چلی گئیں۔ رحمان اور ریشماں

ریل میں سوار ہو گئے۔

رکشہ والا انہیں بڑے بازار میں لے آیا۔ رحمان نے ایک پنوٹری سے
قادر کا پتہ پوچھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے قادر کا مکان بتا دیا کہ
بھٹی وہ رہا۔ دروازے پر پہنچ کر رحمان نے دستک دی۔ قادر سو رہا تھا۔
گل دامن جاگ رہی تھی۔ وہ ابھی ابھی ڈاکٹر سے ٹیکہ کر واکر آئی تھی۔ اور اپنا
بازو سینک رہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ باغ باغ ہو گئی۔
بھاگی بھاگی آئی۔ اور ریشماں سے لپٹ گئی۔ اُسے سینے سے لگا کر گل دامن
کو اپنی مری ہوئی بہن یاد آگئی۔ اور چچی کو دیکھ کر ریشماں کی آنکھوں میں اپنی
ماں کی تصویر ابھرائی۔ دونوں چیم چیم رونے لگیں۔ اتنے میں قادر بھی جاگ پڑا۔
نیچے اتر آیا۔ سامنے رحمان کھڑا تھا۔ دونوں بھائی ہنسکراتے ہوئے
ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

اسی رات قادر نے آنے والوں کی خوشی میں جشن منایا۔ گراموفون پر فلمی
ریکارڈ بجائے گئے۔ قہوے کے کئی دور چلے۔ اور سلفے کے بادلوں نے
تو کمر کا سماں باندھ دیا۔ رحمان کو یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اپنے ڈونگے
میں بیٹھا ہے۔ دوسرے دن گل دامن اپنے پشاور کی تانگے میں ریشماں کو
لاہور کی سیر کرنے لے گئی۔ دونوں سارا دن سیر کرتی رہیں۔ شام کو سینما
دیکھا۔ اور پھر گھر واپس آتے ہی ایک اور جشن منایا گیا۔ ریشماں کو کیک پیٹری
اور کستوری دالے پان کھلائے گئے۔ جن سے اس کو ہلکا ہلکا سرور سا
ہو گیا۔ اور وہ پنڈلیوں کو کھجاتے ہوئے ٹھاہ ٹھاہ ہنستی رہی۔

گل دامن نے ریشماں کے لئے دو ریشمی جوڑے سلوارے لے دی۔ رولڈ گولڈ کے زیورات بھی خرید دیئے۔ جنہیں پہن کر ریشماں عین بین اُن جل پر یوں کی تصویر معلوم ہونے لگی۔ جو موسم بہار کی چاندنی میں جھیل میں لہروں پر ناچتے ہوئے سیپ کے ساز بجا کر تی ہیں۔

اسی اثنا میں قادر نے ایک علیحدہ چوبارے کا انتظام کر لیا۔ اسے فلمی پریوں کی تصویروں سے سجایا۔ اور ایک رات جب کہ ستارے آسمان میں پوری سچ دھج سے چمک رہے تھے۔ چوبارے کی کھڑکی کھلی اور اُس میں ایک فانوس لٹکا دیا گیا۔ رحمان بہت خوش تھا۔ اس کے ڈونگے کے لئے سونے چاندی کے تختے تیار ہو رہے تھے۔ رحمان کے تصور میں جھیل کی انتہا گہرائیوں میں تیرتے ہوئے ڈونگے کے سنہری بادبان پھڑپھڑا رہے تھے۔

دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن۔ وقت کا چکر یوں ہی چلتا رہا۔ فانوس جلتا رہا بجھتا رہا۔ جھونکے آتے رہے جاتے رہے۔ اور ریشماں بیمار ہو گئی۔ ڈاکٹر کہتا تھا پرہیز کر و ریشماں۔ اور رحمان کہتا تھا گہمیوں کا موسم قریب آ رہا ہے۔ اور ریشماں کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی گئی۔ وہ اٹھنے بیٹھنے سے بھی لاچار ہو گئی۔ اس کی چارپائی اٹھا کر چوبارے کی برساتی میں رکھ دی گئی۔ سارا دن وہیں پڑی رہتی تھی۔ وہ اڑ کر اس چوبارے سے کہیں دود نکل جانا چاہتی تھی۔ مگر اس میں سکت باقی نہ تھی۔

ایک دن بیماری کی حالت میں ریشماں کو پو پھٹنے سے پہلے ہی چوبارے کو چھوڑنا پڑا۔ اس دن کوئی تہوار تھا۔ گلی میں خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ کھڑکی میں

بیٹھے بیٹھے اچانک ریشماں کی نظر آسمان کی طرف اٹھ گئی۔ کچھیم کی طرف سے اس نے کونجوں کی ایک ڈار آتی دیکھی۔ اور ریشماں کے سینے میں چھپی ہوئی کورج بھی پھڑپھڑانے لگی۔ کونجیں اپنے دیس کو جا رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کب جائے گی اپنے دیس۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

چوبارے کے چھجے تلے رحمان اپنی بھیلی نکالے ٹٹول رہا تھا۔ اور کچھ کچھ بے چین سا معلوم ہوتا تھا۔ ڈونگے بنانے کے لئے ابھی اُسے چاندی سونے کے بہت سے تختوں کی ضرورت تھی۔ اور ریشماں بہت بیمار ہو گئی تھی۔ رحمان رہ رہ کر بھیلی کو ٹٹول رہا تھا اور ریشماں نیلے نیلے پھیلے ہوئے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ کونجوں کی ڈار بہت دور نکل گئی تھی۔

ریشماں کسی ہیجانی کیفیت میں تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور چارپائی پر دھم سے گری۔ اور پھر جب اُسے ہوش آیا، تو اس کی چچی گل دامن اس کے پاس بیٹھی تھی۔ ریشماں کا پیٹ درد سے پٹا جا رہا تھا۔ اور ہاتھ پاؤں برف کی طرح رخ تھے۔

”کیوں ریشماں کیا بات ہے؟“ گل دامن نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔

”اب کیا تکلیف ہے تجھے؟“

اور ریشماں نے اسے اشارے سے بتایا کہ میرے سینے میں رُک کی ہوئی روح ہچکولے کھا رہی ہے۔

”کیا تجھ سے بولا نہیں جاتا ریشماں؟“ گل دامن نے اس کے ماتھے

یہ ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

اور ریشماں نے سر ہلاتے ہوئے اشارے سے کہا۔

”نہیں بولا جاتا۔“

گل دامن نے رحمان سے کہا۔ ”جاؤ جلد ہی سے ڈاکٹر کو بلا لاؤ۔“ وہ ڈاکٹر کو بلا نے چلا گیا۔ اور ریشماں نے اکھڑے اکھڑے سانس لینے شروع کر دیے۔ کھڑکی سے باہر سائے گرے ہوتے جا رہے تھے۔ ریشماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دو ندیاں بھپوٹ کر بہنے لگیں۔ اور لانی لانی زعفرانی پکیں آپس میں مل گئیں۔ ریشماں کا بدن جو اس سے پہلے برف کی طرح سخت تھا خود بخود گرم ہونے لگا۔ حرارت لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگی۔ اور اس نے گل دامن کو اشارے سے کہا۔

”نیچے سے کانگریسی ہٹالو۔“

کانگریسی ہٹالی گئی۔ ریشماں نے جھجھکری لی۔ پھر پیسے بہ پیسے کٹی کر دیں بدلیں، اور برف کا تودہ بن گئی۔ حرارت جو اس کے جسم میں یکدم عود کر آئی تھی آناً فاناً گافور ہو گئی۔ ریشماں مر گئی۔ گل دامن بین کرنے لگی۔ اور ریشماں کے بازو سے بندھا ہوا زعفران کا تعویذ مردہ جھینگر کی طرح ٹھنڈے جسم سے چمٹ گیا!

ہر چیز کمر میں چھپی ہوئی تھی جھیل کے چاروں طرف حد نظر تک پھیلے ہوئے چنار کے درخت۔ صنوبر کے درخت۔ ان کے پس منظر میں اونچے اونچے برف پوش پہاڑ۔ اور جھیل کا نیلا نیلا پانی بھی۔ ہر چیز کمر میں

چھپی ہوئی تھی۔

رحمان گردن جھکائے چپ چاپ ڈونگے میں داخل ہوا۔ بیگیاں اور اس کی نانی کبل تانے کانگریڈی کے پاس پڑی تھیں۔ بیگیاں سو رہی تھیں۔ بڑھیا جاگ رہی تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے اٹھی۔ اور رحمان کے گلے سے پیٹ کر رونے لگی۔ بڑھیا کوتار کے ذریعے ریشیاں کی موت کی اطلاع دے دی گئی تھی۔

وہ دونوں کافی دیر تک روتے رہے۔ اور پھر جب خوب رو چکے تو رحمان نے بڑھیا کو تھیلی دیتے ہوئے کہا۔

”پورا دو ہزار ہے دیدی۔“

”دو ہزار سے تو کیا چار ڈونگے بنائے گا؟ بڑھیا نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔

”اس سے تو چار ڈونگوں کے پندرہ بھی نہیں بنیں گے۔“

”تو فکر نہ کر دیدی۔“ رحمان نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اب کے جب میں آؤں گا تو دس ڈونگوں کی قیمت لے کر آؤں گا۔

سویرا ہوتے ہی میں بیگیاں کو ساتھ لے کر لاہور جا رہا ہوں۔ ریشیاں

تو ہمیں بیچ منجھھار چھوڑ گئی۔“

بڑھیا تھیلی سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔ ڈونگے میں گری خاموشی چھا گئی۔

جس میں چنار کے درختوں کی سرسراہٹ کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔

کمر کے بادل بدستور ہر چیز پر پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن اب ان میں ہکا بکا

گلابی نور گھلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کی نہ جانے کن

چوڑیوں پر شفقت پھول رہی تھی۔ بیگیاں ڈونگے سے باہر نکلی
 نال میں لپٹی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے اُسے الوداعی لمبہ دیا۔ اور دہکتی ہوئی
 کانگریسی اس کے ہاتھ میں دے دی۔ جس میں انگاروں کی شفقت پھول رہی تھی۔

”گل رخ“

گل رخ۔ کتنا خوبصورت نام ہے۔ اور وہ خود بھی بڑی خوبصورت تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا سرخ گلاب تھا۔ وہ آہو چشم تھی۔ اس کے کالے کالے چمکدار بال اس کے کولہوں کو چھوتے تھے۔ اور اس کا بوٹا سا قد سر سے لے کر پاؤں تک ترشا ہوا تھا۔

گل رخ نے اپنے گاؤں کے چرواہے مدامیر سے عشق کیا۔ تاروں بھری رات میں وہ ندی کنارے بادام کے پیڑ تلے رہا تب بجاتا تو گل رخ کے من میں چھپا ہوا مودنا چنے لگتا۔ اس کے گورے گورے گوشت میں ابھری ہوئی نیلی نیلی رگوں میں کچھوے سے رنگنے لگتے۔ اور اس کے سانسوں سے فنا کے پھولوں کی مہک آنے لگتی۔ وہ مدہوش ہو جاتی اور اسی مدہوشی میں ایک دن رات کے اندھیرے میں چادر کی لکڑی مار کر چپکے سے وہ مدامیر کے پاس چلی آئی۔ بادام کے پیڑ کی تنگی شاخوں میں شگوفے اور کوئلیں بھوٹ رہی تھیں چاند ایک چٹان کے پیچھے قندیل کی طرح خلا میں لٹک رہا تھا۔ مدامیر کو معلوم تھا کہ گل رخ اسے پیار کرتی ہے۔ برسات کی وہ بھیگی بھیگی شام اُسے بھولی نہ تھی۔ جبکہ اُس کی بھیڑی ندی کے اُس پار سبزہ زار میں گھاس چر رہی تھیں اور کسی چٹان پر سے عقاب اس کی ایک بھیڑ پر چھپا تھا۔ لیکن اس نے بڑی پھرتی سے بھیڑ کو اس کے پنجے سے چھڑا لیا تھا۔ گل رخ ندی سے پانی لینے جا رہی تھی۔

زخمی بھیڑ کی گردن ادر پیٹھ سے لمبو رہا تھا۔ گل رخ نے جلدی سے اپنا دینا
پھاڑ کر اس کے زخموں پر پٹی باندھ دی۔ اور پھر دیر تک مدا میر کے پاس
کھڑی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ مدا میر کو معلوم تھا کہ اس کے رباب کے
جادو نے گاؤں کی سب سے حسین لڑکی کے دل میں محبت کی ٹیسیں بھر کر اسے
آنا مجبور کر دیا ہے کہ وہ اندھیروں میں ایک بہت بڑے اندھیرے کی نکل مار
کر اس کے پاس چلی آئی ہے۔

گل رخ اپنے دل کے ساتھ آخری فیصلہ کر کے آئی تھی کہ وہ اب گھر
واپس نہ جائے گی۔ مدا میر اسے جلدی سے اپنے گھر میں لے گیا۔ سویرا
ہوتے ہی وہ اپنی بھیڑوں کو بیچنے جا رہا تھا۔ پو پھٹنے سے بہت پہلے وہ گل رخ
کو ساتھ لے کر اپنے ریلوے کو ہانکتا ہوا سورج کے طلوع ہونے تک گاؤں
سے بہت دور نکل گیا۔ منڈی میں مال کی بڑی مانگ تھی۔ اس کے سارے مال
کا وہیں سودا ہو گیا۔ رقم بھتی میں ڈالتے ہوئے مدا میر نے حنا کے پھول سے کہا۔
”تم یہاں بیٹھو میں ایک بیوپاری کے ساتھ باتیں کر کے ابھی آتا ہوں۔“

پر وہ نہ آیا۔ صبح سے شام ہو گئی۔ اجا لے اندھیروں میں بدل گئے۔
گل رخ اسے تلاش کرنے کو اٹھی۔ لیکن اسے روک لیا گیا۔ وہ فروخت ہو
چکی تھی۔ رباب کا جادو اسے دو ہزار روپے میں فروخت کر گیا تھا۔ بھیڑوں کے
ساتھ حنا کا پھول بھی بک گیا تھا۔ فقط دو ہزار روپے حنا کے پھول کی قیمت۔
گل رخ کی قیمت۔ محبت کی قیمت۔ اس دنیا کے بازار میں انمول چیزیں
بے مول بھی بک جاتی ہیں۔ اور گاؤں کا چرواہا نئی بھیڑوں کا ریلوے منڈی میں لانے

کے لئے واپس چلا گیا تھا۔ تاروں بھری رات میں ندی کنارے بادام کے تنے بیٹھ کر کسی اور گل رخ پر رباب کا جادو چلانے کے لئے واپس چلا گیا تھا۔ گل رخ کے خریدار کا نام خونسے تھا۔ خونی آنکھوں والا۔ گھر سے بھاگی ہوئی منہ کالی بھیڑوں کا ایک بہت بڑا بیو پارٹی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اُسے دور ایک اور شہر میں لے آیا۔ اور خنجر خان کے پاس پانچزار روپے میں فروخت کر گیا۔

خنجر خان۔ یہ کسی سہتیار کا نام نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا نام ہے۔ جو اُس بازار کا ایک بہت بڑا آدمی ہے۔ اُس بازار کے کونے پر پرانے وقتوں کی ایک مسجد ہے۔ جس کے نیچے دکانیں ہیں۔ اور مغرب کی جانب ایک پھاٹک ہے۔ جس کے سامنے کچھ زمین تنکوں کی شکل میں خالی پڑی ہے۔ یہ پھاٹک خنجر خان نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ اس کا دروازہ سارا دن مقفل رہتا ہے۔ لیکن شام کے وقت خنجر خان کے بلڈاگ پھاٹک کا دروازہ کھول کر تنکوں کی زمین پر چھپر کاڈ کرتے ہیں۔ اور چار پاٹیاں بچھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کلیان گرم ہو جاتے ہیں۔ پشوری تمباکو کے دھوئیں سے سارے ماحول میں کلوروفارم کی سی خوشبو پھیل جاتی ہے۔ چائے اور قہوے کے دور چلتے ہیں۔ اور پیل کی شاخوں سے لٹکتے ہوئے پنجرہ میں خان کے بٹیر پٹا ختے ہیں۔ یہ پیر تنکوں کے سرے پر اگا ہوا ہے۔ اور نہ جانے کب سے اگا ہوا ہے۔ اس کی کہانی خان کی کہانی سے بھی پرانی ہے۔

خنجر خان بٹیر باز ہے۔ مرغ باز ہے۔ اس نے انسانی برید کے کتوں

کے علاوہ وہ کتے بھی لٹرایا کرتا ہے۔ اس پھانک میں اس کے لٹرائے گئے کتے اور اخیل مرغ رہتے ہیں۔ وہ ریس کھیلتا ہے۔ سٹہ کھیلتا ہے۔ چرس، افیون اور شراب خوب پیتا ہے۔ کم سے کم دو تین سو روپے روزانہ کی آمدنی ہے۔ جس کا اُسے کوئی ٹیکس نہیں دینا پڑتا۔ اُس بازار میں اس کی بہت سی نوچیاں بیٹھی ہیں۔ جو اُس کے لئے چاندی پیدا کرتی ہیں۔ اور خان انہیں صرف کھانے کو روٹی دیتا ہے۔ اور پہننے کو کپڑا۔ اور ان کی نگرانی کے لئے اس نے انسانی نسل کے بلڈاگ رکھے ہوئے ہیں۔ جو کھولی کا دروازہ بند ہونے پر پہلے سے زیادہ چوکس ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ اُس بازار میں چھپ چھپ کر آنے والے شریفوں کے بھیس میں کبھی کبھی بد معاش بھی آ جاتے ہیں۔ اور واپس جاتے ہوئے گسبن کا گوشت بھی نوچ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُس بازار میں خاص کر ایسے لوگوں کو تو خوفناک بھڑیئے سمجھا جاتا ہے۔ جو کسی منہ کالی بھڑو کو باتوں میں لگا کر کسی بارے سے بھگا لے جاتے ہیں۔ خنجر خان ایسے منہ کالی بھڑوں کے بیوپاری انسانی بریڈ کے بلڈاگ خاص کر ایسی بھڑوں کی دیکھ بھال کے لئے ہی رکھتے ہیں۔ جو ان کی بھڑوں کی ہر طرح رکھوالی کرتے ہیں۔

خنجر خان کی چاندی کی لیشم والی بھڑیں صبح کے وقت باغ کی سیر کرنے جاتی ہیں۔ اور اداس سے بھگے ہوئے ہرے ہرے ٹھنڈے ٹھنڈے گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلتی ہیں۔ وہ سب ایک ادھیڑ عمر کی عورت کی سپرداری اور حفاظت میں سیر کرنے جاتی ہیں۔ جس کا نام گل قدم ہے۔ وہ ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کہ کوئی بھڑ باغی ہو کر کہیں بھاگ نہ جائے یا کسی طرف سے کوئی بھڑ یا کسی بھڑ پر

حملہ نہ کر دے۔

گل قدم نشیلی نسوار کی رسیا ہے۔ پل پل بعد نسوار کی چٹکی بھر کر منہ میں ڈالتی ہے۔
اور پرچ پرچ پیک کی پچکاریاں چھوڑتی ہے۔ ادھیڑ عمر کی یہ پنیر گتیا ہاتھ میں موٹا
ساڈنڈا لٹے اپنے آقا کے ریوڑ کو ہانک کر باغ میں لے جاتی ہے۔ خان اس
پر بڑا خوش ہے۔ اس پر اسے پورا پورا اہتمام ہے۔ وہ اس کی ٹہنی کی ڈیبا میں
نشیلی نسوار کبھی کم نہیں ہونے دیتا۔ اور کبھی کبھار اُسے چٹکی بھی لگوا دیتا ہے جس کے
نشے میں اس کی پنیر گتیا کھردری آواز میں گایا کرتی ہے۔

داسا پڑسانے زماں بہرے خدا یا را

مکڑا دا جور وستم یا رہائے ہائے

اور پھر نہ جانے کس گاؤں کا۔ کس قبیلے کا رباب بجانے والا کوئی چرواہا
یاد آ جاتا ہے گل قدم کو۔ جس کے تصور میں نہ جانے کس ندی کے کنارے
بادام کے پیڑوں میں شگوفے پھوٹتے دکھائی دیتے اُسے اور اس کی آنکھوں
سے بادام جتنے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اور خان کے بلڈاگ اپنی
نیبان باہر نکال کر اس کے رخساروں پر رکھے ہوئے آنسو چاٹتے ہیں۔ گل قدم
ان کے لئے گاڑھی لسی کا بھرا ہوا مرتبان ہے۔ وہ جب زندگی کی تیش سے
ہانپتے ہوئے آتے ہیں تو اپنی پیاس بجھانے کے لئے اُس مرتبان میں اپنی لپکتی،
ہانپتی، کپکپاتی زبان ڈال دیتے ہیں۔

گل رخ اپنی خوشی سے منڈیوں اور بازوؤں میں جکھنے والی عورت نہ تھی۔ اُس نے
اس دھندلے میں پڑنے سے انکار کر دیا۔ تو خان نے اُسے بڑی سخت سزا میں دیں۔

کئی کئی دن تک اُسے کھانے پینے کو صرف اتنی روٹی اتنا پانی ترپا کر دیا گیا۔ جس سے وہ صرف زندہ رہ سکے۔ اس کے بال باندھ کر اُسے چھت سے لٹکایا گیا۔ پاؤں باندھ کر کنویں میں ڈالا گیا۔ اس کے ساتھ اور بہت سی بدسلوکیاں کی گئیں۔ اور وہ بکنے پر مجبور ہو گئی۔ خان کے پانچزار روپے تو ایک ہی مہینے میں وصول ہو گئے۔ اس کے بعد منافع ہی منافع تھا۔ بے چاری گل رخ کے لئے عجیب مصیبت تھی۔ اُسے ڈبل رول ادا کرنا پڑتا تھا۔ صبح سے لے کر رات کے بارہ بجے تک اُسے اُس بازار میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اور پھر جب اُسے اس کے ڈربے میں سونے کے لئے بند کیا جاتا۔ تو خان کے بھوکے بٹیرے پٹا خنے لگتے۔ اور اس کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ اور اکثر ایسا ہوتا کہ خان اُسے اپنے پاس بلا کر اپنی ٹانگیں اس کے سامنے پھیلا دیتا اور کہتا۔

در گل رخ میری ٹانگیں تو دیاؤ۔“

اور باقی رات اس کی ٹانگیں دبا۔ نے میں ڈھل جاتی۔ وہ چپکے چپکے خون کے آنسو روتی۔ وہ اب بھی مراد میر کو بہت یاد کیا کرتی تھی۔ اس کی برائی اس کے ساتھ سرہی۔ وہ ابھی تک اُسی کی تھی۔ اُسے ابھی تک اس کا انتظار تھا کہ وہ آجائے۔ لیکن مراد میر تو نہ آیا۔

ایک دن اس بازار کا بد معاش مانی جاٹ کا بھیس بدل کر اس کے پاس آگیا۔ رات کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے۔ رم جھم ہر رہی تھی۔ مانی نے محبت کی مصوری شروع کر دی۔ اس کی کالی کالی زلفوں کی لٹ کا برش ہاتھ میں لے کر اس کے چہرے کے کھلے ہوئے گلا بول کے رنگ سے

اپنے دل پر حنا کے غنچے۔ گلابوں کے غنچے کھینچے تو گل رخ نے اپنی صدی زندگی کی تکون اس کے سامنے رکھ دی۔ اور مانی نے اُس سے ایک وعدہ کیا۔ اس کے رخساروں پر لہراتی ہوئی لٹ کو مٹا کر کہا۔

”تم ذرا فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اس پنجرے سے نکال کر لے جاؤں گا“
اور پھر ایک طوفانی رات میں جبکہ بادل گر ج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ جھکڑ بڑے زور سے چل رہا تھا۔ مانی نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ خانی اور اس کے بلڈاگ گہری نیند سو رہے تھے۔ اس بازار کا بھڑیا چکے سے خانی کی بھڑوں کے باڑے میں گھس آیا۔ اور بڑے ڈرامائی انداز سے گل رخ کو لے کر فرار ہو گیا۔

خنجر خان اس کا تعاقب کرتا اور ضرور کرتا لیکن اچانک اس پر ایک بہت بڑی مصیبت آن پڑی۔ ایک بیوپاری مدنی بھڑیا اس کے پاس فروخت کر گیا۔ ان کے لواحقین کھوج لگاتے لگاتے انہیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ پولیس کی معیت میں انہوں نے خانی کے باڑے پر چھاپہ مارا۔ اور مدعا یہ آمد ہو گیا۔ پولیس خانی کو گرفتار کر کے لے گئی۔ مقدمہ چلا۔ مجرم کو تین سال قید با مشقت کی سزا ہوئی۔

خانی ابھی زندہ ہے۔ اور بقول اس کے وہ اس عرصہ تک زندہ رہے گا۔ وہ اس عرصہ تک کبھی نہیں مرے گا۔ جب تک کہ وہ گل رخ سے اپنا تیس ہزار روپیہ وصول نہیں کرے گا۔ وہ فرار ہوتے وقت اس کی جیب سے چابی اڑا کر یہ رقم سیف سے نکال کر لے گئی تھی۔ خانی کو پورا پورا یقین ہے

کہ وہ اُسے اس کی زندگی میں کہیں نہ کہیں ایک بار ضرور ملے گی۔ اور وہ اس کے
اپنی پائی پائی وصول کرے گا۔ جب سے خان قید سے چھوٹ کر آیا ہے،
بلاناغہ پانچوں وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بٹیر کی بجائے ہر
وقت تسبیح دیکھنے میں آتی ہے۔ اور جس دن وہ کوئی نئی بھیر خریدتا ہے پرانی
تسبیح بدل دیتا ہے۔

موم بتی

سورج نکل آیا تھا۔ بڑے سیوں کی دیوار پر پردوں کو پھڑپھڑاتے ہوئے
مرغا بولا تو بابا ابراہیم جاگ گیا۔ لیٹے لیٹے اُس نے جھانکی۔ اور پھر آنکھیں ملے
ہوئے اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں نیم کے پیر پر چڑیاں تھیں۔ وہی تھیں۔
اونچے اونچے مکانوں کی مٹیوں اور منڈیروں پر سورج کی سنہری کرنوں کے پھول
کھلنے لگے تھے۔ ہر چیز جاگ اٹھی تھی۔ اس کی سوئی ہوئی سوچیں بھی جاگ اٹھیں اور
وہ سوچنے لگا کہ سورج کی کرنوں کے سنہری پھول اونچے مکانوں کی منڈیروں
پر ہی کھلتے ہیں۔ اس کی زندگی کے گھرے اندھیروں میں سورج کی کرن کا کبھی کوئی
سنہری پھول نہیں کھلا۔ ان اندھیروں ہی میں اس کی گھر وال اس سے بچھڑ گئی۔
اور اپنی نشانی پانچ سال کی ایک بچی اس کے پاس چھوڑ گئی۔ جس کو اس نے بڑی
مشکل سے پالا پوسا۔ جو ان کیا۔ بالی تھا جس کا نام۔ جس کے بارے میں وہ ہر
وقت یہی سوچا کرتا تھا کہ خدا اگر کوئی سبب بنا دے تو وہ اسے جلدی سے کہیں
بیاہ دے۔ بیٹیاں اپنے گھر ہی بھلی لگتی ہیں۔ اور پھر وہ محلہ جہاں بابا رہتا تھا ٹھیک
نہیں تھا۔

گلی کے موڑ پر چائے والے کی دکان تھی۔ جہاں محلے کے آوارہ گرد اٹھتے بیٹھتے
تھے۔ ایک دن بابا نے بالی کو منڈیر پر ایک آوارہ لونڈے کے سامنے کھڑے
دیکھ لیا۔ وہ رومال ہلاتے ہوئے فلمی گیت گارہا تھا۔ بابا ابراہیم نے اس دن

بالی کو بڑا ہی مارا۔ بالی نے کان پکڑے اور ناک سے زمین پر گریں نکالے ہوئے توبہ کی کہ پھر کبھی ایسا نہ کروں گی۔

چائے کی دکان سے آگے ایک کوچوان کا ڈیرہ تھا۔ جس کی جو رو کا نام بی بی تھا۔ اس کا رنگ تو سانولا تھا لیکن نقش بڑے تیکھے۔ تیز تلوار۔ سر سے لے کر پاؤں تک سانچے میں ڈھیلی ہوئی۔ وہ بڑے تنگ ریشمی کپڑے پہنا کرتی تھی۔ محلے کے ہر معاملے میں سب سے آگے نظر آتی تھی۔ اس ڈیرے کے ساتھ ہی ایک ڈیری فارم تھا۔ جہاں دودھ سے مکھن نکالتے تھے۔ وہاں ایک عورت ماجھی مکھن والی بڑی مشہور تھی۔ وہ مکھن بہت کھاتی تھی۔ عمر تو اس کی چالیس سے اوپر تھی لیکن ڈیل ڈول اور قد کاٹھ سے انیس تیس برس کی معلوم ہوتی تھی۔ بڑی نٹ کھٹ۔ بڑی کابیاں۔ ڈیری فارم میں صبح شام گوالے دودھ لیکے آتے تھے۔ اور ماجھی مکھن والی ان کی ٹہل سیوا کیا کرتی تھی۔

اس محلے کو چھوڑنے کی بابا نے بڑی کوشش کی لیکن اتنے کم کرائے پر اس کو اور کہیں ایسی جگہ نہ ملتی تھی۔ ایک کوٹھری اور اس کے آگے آنگن جس میں نیم کا ایک پیڑ۔ جس پر چڑیوں کا چمکنا بابا کو بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس کے ایلے دم کی بات ہوتی تو بابا کسی سڑک پر ہی ڈیرے ڈال دیتا۔ مگر مشکل تو ساری اس کے لئے بالی کی تھی۔ وہ مشکل اب حل ہوتی نظر آرہی تھی۔ بابے کو پکڑی پر ایک دکان مل رہی تھی۔ جہاں بابا صبح کے وقت نہاسی اور دوپہر کو بھلے پکوڑیاں بیچنا چاہتا تھا۔ اور دونوں ہی میں معقول رقم جوڑ کر بالی کا کہیں بیاہ کر دینے کے خیالی خاکے تیار کر رہا تھا۔ بابا بڑے بازار میں بیوپاریوں کی کاتھیں اٹھایا کرتا تھا۔ ایک بیوپاری کے ساتھ

اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ لہذا اس نے دکان کا معاملہ طے کرنے کے لئے اپنے دوست بیوپاری سے کہا۔ وہ اُس دن بڑا مصروف تھا۔ بولا۔
دو بابا کل بات کروں گا دکاندار کے ساتھ۔ فکر نہ کرو تمہارا کام ہو ہی جائے گا۔

آج کا دن بابا کی زندگی میں بڑا ہی اہم دن تھا۔ آج اس کی قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ بابا کے بیوپاری دوست نے دکان دار کے ساتھ بات چیت کرنا تھی دکان کے لئے۔ بابا نے جمائی لی اور چارپائی سے اٹھا۔ اُسے خدا کے گھر سے امید تھی کہ آج اس کا کام ہو جائے گا۔ اس نے مٹی کے پیالے میں پانی لے کر منہ پر پھینٹے مارنے شروع کر دیئے۔ اتنے میں بالی بھی جاگ گئی۔ گھر میں آٹا ختم ہو رہا تھا۔ بابا نے جلدی سے اُسے بازار سے آٹا لا دیا۔ اور اللہ کا نام لے کر کام پر چل دیا۔

سورج کافی پڑھ آیا تھا۔ بابا ڈیری فارم کے پاس سے گزرا تو وہاں بہت سے رہڑے کھڑے تھے۔ دودھ سے بھرے ہوئے ڈولہنے نیچے اتارے جا رہے تھے۔ ماجھی چولہے کے پاس بھیٹی گوشت بھون رہی تھی۔ ہونٹوں پر دندا مل رہی تھی۔ ایک گوالا اُسے ٹکڑا کر دیکھتے ہوئے مست ہوا بیٹھا تھا۔ کچھ ہوش نہ تھا اس کو۔ حقے کی نڑی منہ سے نکال کر نکتھوں میں لے رہا تھا۔ ایک اور گوالا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ ماجھی کی کاجل سے سنواری ہوئی آنکھوں کی اندھیرنگری میں آنکھوں کے ساتھ ساتھ اڑا جا رہا تھا۔ اپنی آنکھوں میں بھی سرمہ ڈالنے کے لئے بڑے چاؤ سے اس نے واسکٹ کی جیب سے سرمہ دانی

نکالی۔ سرچو نکالا۔ سلائی بھر کر ہاتھ اٹھایا۔ دھیان تھاڑھول مکھن میں لگا ہوا۔
اس کو اس کا احساس ہی نہ ہوا کہ آنکھیں کہاں ہیں۔ سرے کی بھری بھرائی سلائی کان
میں گھسیڑ لی۔

ایک اور گوالا جو مرلی بغل میں دبائے شاید رانچھا بنا کھڑا تھا۔ ڈھول مکھن کو
ٹٹکٹکی لکائے دیکھے جا رہا تھا۔ ایک ایک اس کو اپنی ٹیڑھی ہوئی وارٹھی کا خیال آیا سامنے
سے حجام چلا آتا تھا۔ اس کے آگے بیٹھ گیا۔ کہنا تھا وارٹھی موزڈو سے بولا ٹنڈ کر دو۔
رانچھا بالنا تھ کے ٹیلے پر پہنچا تھا تو سب سے پہلے انھوں نے اس کی ٹنڈ ہی
کی تھی۔ جوگ کی پہلی سیڑھی۔ اور وہ گوالا اس وقت مکھن کے ٹیلے پر جا رہا تھا عشق
کی پہلی سیڑھی۔ مکھن کھاؤ اور مرلی بجاؤ۔ اس گوالے کو بھی اپنی مرلی یاد آگئی جو اس نے
بغل میں دبائی ہوئی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں ڈوبی ہوئی تھیں مکھن کی مورت میں۔ پاس ہی
کھڑے ہوئے رہڑے میں سے مکی کا ٹانڈا کھینچ کر اُسے بجائے لگا۔ بخود دی کے
عالم میں اس کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مرلی بول رہی ہے یا نہیں۔ عشق کے ٹیلوں پر یہی
ہوتا ہے۔ مرلی تو بڑی مختصر سی چیز ہے وہاں کسی وقت مرے بھی نہیں بولتے۔ مگر
عشق حقیقی کے ٹیلوں کی اور بات ہے۔ وہاں وہی پہنچ سکتے ہیں جو انگ بھینھوت
رما کے۔ کان چھدوا کے جوگ لیتے ہیں۔ اور سارے جگ کی چوٹیں اپنے سر پر
سنتے ہیں۔ وہ عشق مجازی نہیں۔ پھسلن بازی نہیں کہ مکھن کھاتے جاؤ اور پھسلتے جاؤ۔
پھسلنا یہاں پاپ ہے۔ مگر اتنا اونچا کون آتا ہے۔

ہمیں جب ڈیری فارموں میں مل جائیں تو عشق حقیقی کے ٹیلوں پر جا کے کان
چھدوانے کی کیا ضرورت ہے۔

بابا ابراہیم کو چوان کے ڈیرے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ مالشیا ایک گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ کو چوان کی جو رد بی بی رونس کے نیچے موڑھے پر بیٹھی تھی۔ ہاتھوں اور پیروں کو مہندی لگائی ہوئی تھی۔ منہ میں پان تھا۔ اس کی نظریں گھوڑے کا گوشت ٹٹول رہی تھیں کہ کہاں موٹا کہاں تپلا ہے۔

گرم دن جھکائے چلتے چلتے بابا ذرا اور آگے بڑھتا ہوا اسے فیروزاں مل گئی۔ وہ اپنے بھائی کی بچی کو ڈاکٹر کے پاس لائی تھی۔ بابا کو دیکھ کر رک گئی۔ کسی زمانے میں بابا اس کی کسٹری میں اس کا کرایہ دار رہ چکا تھا۔ فیروزاں جب کبھی اور جہاں کہیں اُسے ملتی تھی بالی کا ضرور پوچھتی تھی۔ فیروزاں نے اس کے ساتھ اس دن بڑی ہی باتیں کیں جن میں بار بار بالی کا ذکر آتا رہا۔

بابا اپنے دوست بیوپاری کی دکان پر پہنچا تو اس نے بابا کو خوشخبری سنائی۔ ”بابا تمہارا کام ہو گیا ہے۔ دکاندار تین سو روپیہ بگڑی مانگتا ہے۔ تمہارے پاس کیا ہے؟“

بابا نے کوڑی کوڑی کر کے دو سو روپیہ جمع کیا ہوا تھا کہنے لگا۔ ”میرے پاس تو کل دو سو روپے ہیں۔“

”اچھا تو ایک سو روپیہ میں اپنے پاس سے دے دوں گا۔“ بیوپاری نے کہا۔

اور بابا نے اُسے بڑی ہی دعائیں دیں۔ سارا دن خوشی خوشی وہ اپنا کام کرتا رہا۔ شام ہوئی تو گھر کو لوٹا۔ وہ ڈیری فارم کے پاس پہنچا تو گوالے ماجھی مکھن کو تانگے میں ڈالے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہے تھے۔ وہ اندھی لیٹی چنچتے ہوئے

انا پ شتاب بک رہی تھی۔ آس پاس کی رہنے والیاں کواڑوں کی چھینکتی ہوئی معلوم دیکھ رہی تھیں۔ مابھی شراب کے نشے میں سارا دن دل پشوری کرتے کرتے اب پشادری نسوار بن گئی تھی۔ تانگہ جدھر سے گزرتا تھا ہر چیز چھینکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

بابا بھی چھینکتا ہوا کوچوان کے ڈیرے کے پاس سے گزرا تو روس میں دیا جل رہا تھا۔ جس کی سوتی جاگتی بو میں کوٹھری کا دروازہ کھٹ سے کھٹا۔ بی بی باہر آئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ قمیض الٹی پہنی ہوئی تھی۔ ننگے پاؤں۔ قدم ڈگمکا رہے تھے۔ جلدی سے اس نے گھوڑے کی گردن میں باہیں ڈال دیں۔ اور گھوڑے کا منہ چومتے ہوئے گانے لگی۔

چلی پیار دی ہوا مستانی گھنڈ لہگئے کلیاں دے

بابا ہنسنا۔ اور تیز تیز چلتے ہوئے اپنے گھر کے آنگن میں آگیا۔ اندھیرے میں اُسے یوں معلوم ہوا جیسے چھت پر کوئی دبے دبے پاؤں چل رہا ہے۔ وہ بھی دبے دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس کے پاؤں خود بخود رک گئے۔ بالی کسی کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔

”کئی موٹی ہو گئی اسے تیری دینی۔ تو کبھی کھانا ایسے؟“ یہ بالی کی آواز تھی۔

”میں کھانا کھن تے پینا بادام۔ پر میں کیا آج دس کوروپے مینوں ضرور

دے۔ اور مینوں بڑی ٹور اسے۔“ یہ دوسری آواز تھی۔

”سو نہ تیری ہیں تے میرے کول کچھ دی نہیں ہیگا۔ با بے میں اندر نہ دیر

دوسو روپیہ دیا ہو یا سی۔ میں کڈھ کڈھ تینوں دیندی رہی آں۔

ہن تے اوتھے کچھ دی ٹہیں ہیگا۔" یہ بالی کی آواز تھی۔

امد بابا کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی رگوں میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی۔ کھڑکاسن کر اندھیرے میں ایک سایہ لمبا ہو کر نیم کے پیڑ پر سے رینگ گیا۔ بالی جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی۔ بابا اندر کو کھڑی میں نکرے کی زمین کرید رہا تھا۔ اس نے ہنڈیا نکالی۔ اس میں کچھ نہ تھا۔ اسے ایسا چکر آیا کہ بیٹھا بیٹھا لٹو کی طرح گھوم گیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی منگی بھی بالکل خالی ہو گئی ہے۔ اس کے آس پاس پھیلے ہوئے اندھیرے اور گرے ہو گئے۔ اس کا دل ٹھجنے لگا۔ اگر اس کی کھوپڑی میں سوپچ کی ایک نئی کونپل نہ چھوٹتی تو اس کا وہیں کلیان ہو جاتا۔ وہ اٹھا اور جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ اور اس کا سامان ہی کیا تھا۔ دو چار پائیاں۔ دو تین برتن۔ بوسیدہ سا ایک ٹنک۔ مٹی کا گھڑا تو اس نے وہیں پھوڑ دیا۔ ایک چار پائی الٹی کر کے دوسری چار پائی پر رکھ دی۔ صندوق اور برتن ان کے اوپر لٹکائے۔ امد بابا کو لے کر چل نکلا۔ گلیوں اور بازاروں سے گزرتا ہوا وہ ایک بار رونق بازار میں آگیا۔ جہاں ہر طرف روشنی کے خوارے چھوٹ رہے تھے۔ بڑی چیل پہل ہو رہی تھی۔ ہر شے اگر بتی کی طرح سلگ رہی تھی۔ خوشبوؤں کی لپٹیں آرہی تھیں۔ گھنگر و چھنک رہے تھے۔ سریلی سروں کی بھپوار سی پڑ رہی تھی۔ اونچے اونچے مکان۔ حویلیاں۔ چوبارے اور ان کے سجے سجائے دریچے۔ حسن کی قندیلیں اندھیروں میں جل رہی تھیں۔ بالی چور آنکھوں سے انہیں دیکھ دیکھ مسکرا رہی تھی۔

ایک حلوائی کی دکان کے پاس آکر بابا نے بالی کو ایک طرف کھڑا کیا۔ امد

چپکے سے حلوائی سے کچھ پوچھا۔ اس نے بابا کو بڑے غور سے
اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ مسکرایا۔ بولا۔

”اے جتنے لال بتی بل رہی اے۔ جتنے بھیڑ بکھا ہوا اے فیروزاں
دامکان اے۔“

پچھلے ہٹ کر بابا نے بالی کو دیکھا۔ وہ چوک میں کھڑے ہوئے لونڈوں کی مٹھی
کو دیکھ رہی تھی۔ بابا نے اس کو آواز دی۔
”انی کڑیئے ٹرپو۔“

بالی جلدی سے بابا کے پاس آگئی۔ بابا نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور ایک ہی
جھونک میں جلدی سے دروازے کے اندر گھس گیا۔ آسمان میں چلتی ہوئی
قندیلیں بادلوں میں چھپ گئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی بوندیں زمین پر اتر رہی تھیں چوک
میں کھڑے ہوئے لونڈروں کی مٹھی سے آواز آئی۔

”بابے وی موم بتی بالی اے۔“

دلربا

غم غلط کرنے کے لئے دلربا افیون کھاتی تھی۔ دورتی طلوع آفتاب سے پہلے اور دورتی غروب آفتاب کے بعد۔ اُدھر شفق سے افق کے اداس کنارے رنگین ہو جاتے اور اُدھر افیون کے نشے سے دلربا کی اداس آنکھیں۔ افیون کا پانچہ علق سے نیچے اترتے ہی نشہ ہولے ہولے سلگنے لگتا اور دلربا بن بٹھن کر اپنے پالتو طوطے گلغام کو کندھے پر لئے اپنے اڈے پر بیٹھ جاتی۔ حقے کی زطی منہ میں رے کر لمبے لمبے کش لگاتی۔ بنارسی متبا کو افیون کے نشے میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتا۔ ہلکی ہلکی پھریریوں کی گود میں ہلورے لیتے ہوئے دلربا مزے میں آنکھیں بند کر لیتی۔ اور اُسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے اس کی مضرور جوانی واپس لوٹ آئی ہے۔ جیسے وہ پھر جوان ہو گئی ہے۔ اس کی ڈھکی ہوئی چھاتیوں میں پھر وہی پہلا سا تناؤ آگیا ہے۔ اور اس کی ابھری ابھری نیلی نیلی رگوں میں کچھوے سے رنگنے لگے ہیں۔

کتنا دلفریب۔ کتنا طربناک تھا وہ احساس۔ جو کہ افیون کھانے کے بعد بڑھا پے میں دلربا کے دل میں پیدا ہو جاتا۔ افیون کا سرور ہوتا ہی اس کے خیالوں کے دھندلکوں میں گزری بیتی جوانی کے رنگین سپنے جگنو بن کر ٹمٹاتے چلے جاتے۔ اور دلربا ان کا تعاقب کرتی۔ فضائے تصور میں ان کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی۔ کبھی سپنے چھپ جاتے کبھی دلربا چھپ جاتی۔

کتنا اچھا تھا وہ زمانہ۔ کتنے سہانے تھے وہ دن۔ کتنی حسین تھیں وہ راتیں۔
کتنا پیارا تھا وہ مہکا مہکا ماحول جس میں ہر شب دلربا کو اگر بتی کی طرح سلگایا
جاتا۔ ایک گلدستے کی طرح ایک مرمی دریچے میں سجا دیا جاتا۔ ایک بکاؤ
گڑیا کی طرح ایک شوکیس میں لگا دیا جاتا۔ جبکہ وہ کستوری کے نافے اور گلاب
کے پھول کی طرح ایک کھڑکی میں کھلا کرتی۔ جبکہ محبت کے مریض اُسے صندل
کی طرح گھس کر دل پر لیپ لگایا کرتے۔ اور فضا میں مشکبار ہو جاتیں۔ جبکہ
اس کی ہلکی ہلکی مسکراہٹ۔ آنکھوں کے دبے دبے شوح اشارے۔ سینے
کے ابھار کی دوپٹے میں چھپی چھپی کپکپاہٹ۔ چوڑیوں کی چھنکار۔ صندل پیشانی پر
چمکتے ہوئے جھومر کی جگمگاہٹ۔ اور اس کی آرمی کے ننھے ننھے کوندے
رک رک کر چلتی ہوئی ہواؤں کو اپنے جادو سے تیز کر دیا کرتے تھے۔

کتنا اچھا تھا وہ وقت۔ کتنے سہانے تھے وہ دن۔ کتنی حسین تھیں وہ راتیں۔
کتنا بہار آفریں تھا وہ ماحول جس میں دلربا کے سانس بھی بہار بن کر مہک جاتے
تھے۔ اور سازندے اپنا اپنا ساز لے کر بیٹھ جاتے۔ رات اپنی تمام رنگینیوں کو
ساتھ لئے اُس بازار میں اتر آتی۔ رنگواندر سے بڑی باٹی کا بڑا سا گنگا جمنی
پاندان اٹھلاتا۔ اور اُسے گاؤ تکیے کے پاس رکھ کر چلا جاتا۔ بڑی باٹی انگن
میں بچھے ہوئے تخت پوش پر آلتی پالتی مارے بیٹھ جاتی۔ لوبان سلگاتی۔ اور
چکے چکے جلدی جلدی منہ میں کچھ پڑھنے لگتی۔ اور دلربا دریچے میں آنے سے
پہلے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر بڑی گہری نظر سے اپنے بناؤ سنگار کا
آخری جائزہ لیتی۔ اُس بازار کا پہلا تازہ گجرے، ہار اور گلدستے لے آتا۔ گجرے

اور ہار دلربا کے لئے اور گلہ ستے اس کے مکرے کی سجادٹ کے واسطے۔
 سازندے اپنے اپنے سازوں کے سُر ملا نے لگتے۔ مختلف ساز۔ مختلف
 آوازیں۔ نغموں کی ہم جھم۔ سُر علی سروں کے تانے بانے۔ طبلے کی دھمک۔
 سازنگی کی جھنکار۔ تانپورے کی گونج۔ ہار موہیم کی تانیں۔ سرگم۔ الپ۔ میٹھے
 میٹھے بول۔ انترے اور استھائیاں۔ راگ راگنیاں۔ اُن کا مکھ بلاس۔
 ان کی آروہی امروہی۔

سارے گاما پا دھانی سا

سانی دھاپا ماگا رے سا

سات سُر۔ دس ٹھاٹھ۔ چھ راگ۔ ساراسنگیت انہی میں ہے۔ لیکن
 بڑی بائی کہا کرتی تھی۔ سنگیت کے سات نہیں آٹھ سُر ہیں۔ اوردہ آٹھواں
 سُر ہے لا۔ یعنی جو کچھ تیری جیب میں ہے اُدھر لا۔ بڑی بائی کہتی تھی زندگی
 کے سنگیت کا یہ آٹھواں سُر بڑا ضروری ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا سنگیت
 نامکمل ہے۔ اس سُر کے بغیر زندگی کی سب آوازیں بے سُر ہیں۔ اس کے
 بغیر زندگی کا کوئی راگ، کوئی راگنی جنم نہیں لے سکتی۔ کوئی ٹھیکہ، کوئی تال پیدا
 نہیں ہو سکتا۔ تین تال سب تالوں کی ماں ہے۔ سب تال اسی سے جنم لیتے ہیں۔
 تین تال کے سولہ ماترے ہوتے ہیں۔ اور ایک روپیہ کے سولہ آنے۔ دو اٹھتیاں
 چار چوہنیاں۔ آٹھ دونیاں۔ یہ دولت کے ماتروں کی تقسیم ہے۔ یہ سب زندگی
 کے تال کے ماترے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو زندگی بے تال ہے۔ بے گڑ ہے۔
 اس کا کوئی سم نہیں ہے۔ بڑی بائی اس آٹھویں سُر کو ہر رنگ میں بڑی استاد

اور خوبصورتی سے لگاتی تھی۔ اسی لئے تو رنگوں نے اُس سے پیت لگائی تھی۔
رنگو۔ چھبیس ستائیس سال کا ایک خوبصورت لونڈا۔ گورا رنگ گھنگریالے
بال۔ چوڑا چکلہ سینہ۔ بازو بڑے مضبوط۔ موٹی گردن۔ گوشت سے بھری ہوئی،
لٹکتی ہوئی رانیں۔ جیسے شہر سے بھرے ہوئے چھتے لٹکتے ہیں۔ سر سے پاؤں
تک روغنی تھا رنگو۔ روغنی بڑی بانی کی زبان میں اس کو کہتے تھے جس میں خون اور
چربی بکثرت ہو۔ اور تازہ تازہ ہو۔ جوانی کی گرمی اور رنگوں سے بھرپور۔

بڑی بانی کو دے کی بیماری تھی۔ حکیم جی نے دوائی کے ساتھ چوزوں کی
یخنی تجویز کی تھی۔ رنگو بڑی بانی کو اُس بازار میں ایک دن لاوارث چوزے کی
طرح آوارہ گردی کرتے ہوئے مل گیا۔ بڑی بانی نے بڑی ترکیب سے اُسے
پکڑ لیا۔ فاقوں کا مارا ہوا تھا رنگو۔ بڑی بانی نے دانہ ڈالا۔ دُورے پھینکے۔ اور
گھیر گھار کر دل کے ڈربے میں بند کر لیا کہ کہیں اڑ نہ جائے۔ بس کھانے پینے
کے وقت ہی اُسے نکالا کرتی تھی۔

رنگو کے صرف دو کام تھے۔ بڑی بانی کی مالش کرنا اور شام کو جب دلربا
سنگار کرنے لگتی تو وہ بڑی بانی کا پاندان گانے بجاتے والے کمرے میں اٹھا
لاتا۔ اتنے میں بڑی بانی پانی چباتے ہوئے آجاتی۔ اور ساندندوں سے ذرا ہڈ
کر کاؤتیکے سے کمر لگا کر بیٹھ جاتی۔ پاندان کھول کر سرونا نکالتی۔ چھالیاں نکالتی۔
اور بڑے خزانے سے خزانے سے مزے مزے انہیں کترنے لگتی۔ ساندندوں کی سریلی
آداندوں میں سروستے کی کٹ کٹ یوں معلوم ہوتی۔ جیسے کتا ہڈی چبا رہا ہو۔
بڑی بانی بانجھ تھی۔ پنجر زین۔ جس میں کبھی کوئی دانہ نہ آگ سکا حالانکہ چلہ سننے

دالوں نے اچھی طرح ہل چلائے۔ سہاگے پھیرے۔ وقت پر پورا پورا پانی دیا۔ کوئی دانہ نہ اگ سکا۔ جو بھی جنس بوئی گئی مٹی میں مٹی ہو گئی۔ اب کوئی کیا کرتا نہیں ہی ایسی تھی۔ کھراٹھی زمین۔ جس میں قلمی شورے کی مقدار بہت زیادہ تھی۔ اتنی تیار کہ بڑی بائی کے پسینے سے بھی قلمی شورے کی بُو آتی تھی۔ جسے دبانے کے لئے وہ دن میں کئی بار خوشبودار صابن سے نہایا کرتی۔ خوشبوئیں لگایا کرتی۔

بڑی بائی نے اپنی کوکھ کو ہرا کرنے کی بڑی کوشش کی۔ کوئی دائی۔ کوئی دوا، کوئی حکیم، کوئی ڈاکٹر نہ چھوڑا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ اسی کشمکش میں وہ وقت بھی آگیا۔ جبکہ اُسے اپنی زندگی کے دروازے پر بڑھا پے کی دستک صاف صاف سنائی دینے لگی۔ اور وہ گہری سوچوں کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔ جہاں وہ تھی وہاں تو بڑھا پے کے تصور ہی سے رنگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وہاں بڑھا پاپا ایک بہت بڑے عذاب کا نام ہے۔ اُس بازار میں بوڑھا باسی گوشت نہیں بکتا۔ وہاں جھریوں سے بھرے ہوئے، کھانستے ہوئے، بچھے ہوئے پیروں کو گر مجبوشی سے نہیں دیکھا جاتا۔ وہاں اندھیروں کے نہیں چاندنی راقوں کے سوداگر آتے ہیں۔ وہاں چاندستاروں کے سودے ہوتے ہیں۔ وہاں پرانے نہیں نئے چراغوں کو چاہست سے دیکھا جاتا ہے۔ اُس بازار کے پردانے بڑے چوکس ہوتے ہیں۔ بچھتے ہوئے چراغوں پر فدا نہیں ہوتے۔ لہذا اندھیروں سے بچنے کے لئے وہاں پرانے چراغ بچھنے سے پہلے ہی نئے چراغ جلا دیئے جاتے ہیں۔ بڑی بائی کے پاس اپنا کوئی نیا چراغ نہ تھا۔ وہ زندگی کے ایک بانہار سے ایک نیا چراغ لے آئی۔ نیا چراغ۔ نئی شمع۔ دلربا۔ جسے کوئی بڑی پردے دار

بڑے پردے سے جن کو نہ جانے کن پردوں میں چھپ گئی تھی۔ اور بڑی بانی
بڑے صاحب کو ڈالی دے کر اُسے حرامی بچوں کے ہسپتال سے لے آئی۔ اس کا
نام دلربا رکھا۔ بڑے نازوں سے اُسے پالا پوسا۔ لکھایا پڑھایا۔ اور پھر سنگیت کی
ایک کوئل سُر بنا کر راک رنگ کے رنگ محل میں بٹھا دیا۔

شام کے وقت آسمان میں ستارے طلوع ہوتے تو دلربا نت نئے نئے شہوار
پہن کر اُس بازار کے ایک خوشنما دریچے میں طلوع ہوا کرتی تھی۔ اور بازار میں
سرگوشیاں ہونے لگتیں۔ لوگوں نے اس کے کئی نام رکھے ہوئے تھے۔ اُسے
کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔

چاند ستاروں کی جھنکار تو سنائی نہیں دیتی۔ لیکن دلربا کی پازیب کی جھنکار تو
بازار کے اس سرے سے لے کر اُس سرے تک سنائی دیا کرتی تھی۔ سلگتے
ہوئے عنبر اور کشتورہ کی خوشبو خوابناک ہی سہی۔ لیکن جب دلربا اس جھنکتے اور
لگناتے ہوئے ماحول میں اگر بتی کی طرح سلگا کرتی۔ تو چلتے پھرتے لوگوں پر جھنکتا
اور لگناتا ہوا جادو چل جاتا۔ اور انہیں یوں محسوس ہوتا جیسے وہ نیند میں چل رہے
ہیں۔ وہ سب چلتے چلتے ادنگھنے لگتے۔

دلربا دریچے میں آتی تو پھر بے بازار میں زلزلہ سا آ جاتا۔ لوگ اس کے حسن کے
جلووں میں کھو جاتے۔ اس کی اچھوتی اور انوکھی جوانی کے تذکرے ہونے لگتے۔
ہمکتے ہوئے جادو کے اندھیروں اور اجالوں میں سوتے جاگتے لوگ نہ جانے
کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ ایک شمع اور لاکھ پر دانے۔ ایک عورت کئی افسانے۔

ایک دلربا اور کئی دیوانے۔ اس کی کاجل سے سنواری ہوئی آنکھیں بند ہوتی ہیں۔
جائیں بے شمار بھوک کی پیاسی نظریں ان کا تعاقب کرتیں۔
بے شمار آنکھیں۔ بے شمار ہونٹ۔ مسکراتے ہوئے ہونٹ۔ گنگنا تے
ہوئے ہونٹ۔ لمبے لمبے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس لیتے ہوئے ہونٹ۔ بد نما بھی
خوش نما بھی۔ اور مونچھیں۔ نقلی اور اصلی مونچھیں۔ ہر قسم کے لمبے چوڑے پتلے
موٹے ناک۔ داڑھیاں۔ چھوٹی بڑی داڑھیاں۔ کوئی سادہ۔ کسی پر دمکے ہندی
یا خضاب کا کوٹ۔ داڑھش۔ کالے گورے چہرے۔ چنگبرے چہرے۔ اجنبی
چہرے۔ جانے پہچانے چہرے۔ اس پاس پھیلے ہوئے اندھیروں اور اجالوں
میں دلربا کی آنکھیں بے شمار صورتیں۔ بے شمار نقوش۔ بے شمار خاکے تصویریں
اور سائے۔ ابھرتے ہوئے۔ اجاگر ہوتے ہوئے۔ اپنے قریب آتے ہوئے
دیکھتیں۔ دلربا کی آنکھیں۔ جیسے کسی نہتہ سحری جھیل میں دو کنول کھلے ہوں۔ جیسے
کسی کان میں دو ہیرے جگمگا رہے ہوں۔ اور دلربا بھی حسن کی کان بھتی۔ جس میں
حسن و جمال کے بڑے نایاب ہیرے تھے۔ کئی علی بابے۔ کئی چالیس چور انہیں
چرانے آئے لیکن دلربا کھل سم سم کے الفاظ سے کھٹنے والا دروازہ نہ کھتی۔ وہ
لور لاک کا بڑا مضبوط صیغہ تھی جس کا قفل توڑا نہیں جاسکتا تھا۔ جو صورت اپنی
چابی سے کھلتا تھا۔ اور وہ چابی بڑی بائی کے پاس رہتی تھی۔ وہی اسے کھولتی اور
بند کرتی تھی۔ لور سے کو لوہا کا شتا ہے۔ دولت کو دولت اپنی طرف کھینچتی ہے۔
چوہوں کا دہاں کیا کام تھا۔ اور پھر دلربا خود حسن و دولت کی چور تھی۔ حسن وہ
خدا کے نگار خانے سے چرالائی تھی۔ اور دولت دنیا کی چرار ہی تھی۔ وہ بڑا دلیر

چور تھی۔ وہ دن کے اجالے میں بھی چوری کرتی تھی۔ وہ اپنے ہنر میں بڑی ماہر تھی۔ وہ بغیر کسی ریزر اور قینچی کے بڑی سے بڑی فولادی جیب کو کاٹ کر موزا بنا دیتی تھی۔ بڑی نٹ کھٹ۔ بڑی کایاں۔ بڑی چوکس تھی دلربا۔ وہ جو اسے چوپٹ سمجھتے تھے گھن چکر تھے۔ بے رنگ۔ پٹی ہوئی۔ پرانی اور اداری کھداری زدہ کو تو وہ اپنے کسی خانے میں آفس میں نہ دیتی تھی۔ وہ بڑے بڑے شاپروں کے ہاتھ باندھ کر انہیں ایک طرف کنارے پر یوں بٹھا دیتی تھی۔ جیسے مداری بندر کو بکرے پر بٹھا دیتا ہے۔ وہ جب کوڑیاں اپنے ہاتھ میں لیتی تھی تو بس پھر انہیں چھوڑنے کا نام ہی لیتی تھی۔ بڑی چیزے باز تھی دلربا۔ اپنے متوالوں کے ساتھ بڑے چیزے لیا کرتی تھی۔

حسن کے بازار میں آنے والے لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کے پاس سوائے اپنے آپ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بیچارے مجبور ہوتے ہیں۔ دل لگی کے لئے کسی صورت کے چارے کے سامنے۔ چھجے کے نیچے یا کسی کھجے سے لگ کر آنکھیں سینکتے ہیں۔ دل سینکتے ہیں۔ سینے کو ٹکور کرتے ہیں۔ دور ہی دور سے اُس صورت کو سونگھتے ہیں۔ بت بنے ٹکٹکی لگاٹے۔ جب تک ان کی ٹانگیں لگاتار کھڑے رہنے سے تھک کر خود بخود ٹپ ڈانس نہ کرنے لگیں بس وہیں کھڑے رہتے ہیں۔ اور پھر جب وہ صورت لگاتار دیکھتے رہنے سے نسواریں کر ان کے دماغ کو چڑھ جاتی ہے تو چھینکتے ہوئے ہوا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دلربا اپنی زبان میں گرد گھمے یا لاٹو لوگ کہا کرتی تھی۔ اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں۔ جو کہیں سے مفت کی پی کر چسے آتے

ہیں۔ سگریٹ اور پان بھی کسی سے ادھار لیتے ہیں۔ کپڑے بھی کسی سے مانگ
- مانگ کر ہی لیتے ہیں۔ باتیں بڑی کرتے ہیں۔ پر لمبے درجے کے باتوں کی باتوں کے
- سیا۔ باتوں کی آٹومیک مشین۔ آتے ہیں تو راستے میں کہیں رکھتے نہیں ہیں۔
اپنی جھونک میں ادھر ادھر گر دیں گھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ کسی کی نہیں سنتے۔ بس
اپنی سنائے جاتے ہیں۔ ہر پر ی کو باتوں ہی باتوں میں اپنی پاکٹ میں ڈالنے کی
کوشش کرتے ہیں۔ اُسے اپنی باتوں کے سبز باغوں میں لئے پھرتے ہیں۔ اور جو
وہ پر ی پوچھے لے مسٹر پیسے کتنے ہیں تمہارے پاس؟ ذرا پنا پر س تو رکھنا۔ تو
مسٹر یکدم پاؤں پھیل کر زمین پر ایٹھٹھنے لگتے ہیں۔ جیسے انہیں مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔
دلربا ایسے لوگوں کو سبز باغیے کہا کرتی تھی۔

تیسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جن کے پاس دولت ہوتی ہے۔ جو اس
بازار میں آکر اپنی مرضی کی مونا لڈا خریدتے ہیں۔ اپنی پسند کی ایک رات کی قلو پٹرا
کا سودا کرتے ہیں۔ اس بازار کے ہر شوکیس میں ایک گڑیا۔ ایک پتلی۔ بولتی چالتی
ایک تصویر۔ ایک گڑیا گار بو۔ ایک ایوا گارڈن۔ ایک روزینا پوڈسٹا۔ ایک
بیلڈار دی۔ ایک جینا کوکوبیر جڈا۔ ایک رونڈا فلیمنگ۔ ایک ہیلن۔ ایک
پدمنی۔ ایک دیول دیوی۔ ایک ہیر۔ ایک سوہنی۔ ایک سسی۔ اپنے صرف
ایک رات کے مہینوال۔ پنوں اور رانچے کا انتظار کرتی ہے۔ لیکن اس بازار
میں ہر حسین جسم۔ ہر حسین چہرہ۔ ہر حسین رات۔ ہر حسین دن صرف دولت
سے خریدا جاتا ہے۔ جہاں ہر چیز بکاؤ ہے۔ جس کے پاس پیسے ہوں خریدے۔
دلربا ان دولت مند لوگوں کو سوداگر کہا کرتی تھی۔ بیوپاری کہا کرتی تھی۔ بیوپاری

لوگ۔

اور چوتھی قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں۔ جو ان سوداگر دن کے سونگھے ہوئے
مسلمے ہوئے پھول اٹھا کر اپنی جھولی بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نوکر بن کر۔
دوست بن کر۔ مسخرے بن کر۔ خیر اندیش بن کر۔ ان کے مہادت بن کر۔ بہر حال
ان کے کچھ نہ کچھ بن کر انہیں پناستے ہیں۔ سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے
دہتے ہیں۔ ان کا بچا کچھا کھاتے پیتے ہیں۔ ان کی اتریں اوڑھتے ہیں۔ ان کی مسلی
ہوئی سیجوں پر اگر موقع ملے تو یہ موقعہ شناس چپکے سے سو بھی جاتے ہیں اور
ان کی خریدی ہوئی گڑ یا کو ان کی غیر موجودگی میں اپنی محبت کے گلگلے کھلانے کی
کوشش کرتے ہیں۔ دلربا ایسے لوگوں کو چمچ پڑیا پشیے کہا کرتی تھی۔ پس پینے والے۔
تلچھٹ پینے والے۔ کھرچن کھانے والے لوگ۔

اس بازار میں آنے والے لوگوں کی ان چار اقسام کے علاوہ دلربا بنے ایک
اور قسم بھی نکالی تھی۔ پانچویں قسم کے ان لوگوں کو وہ کارٹون لوگ کہا کرتی تھی۔
کارٹون لوگ یہ نام دلربا کی اپنی اختراع تھا۔ کارٹون لوگ چال ڈھال میں۔ بول
چال میں۔ شکل و صورت سے۔ قد کاٹھ میں۔ کھانے پینے اور پہننے میں ایک
اچھے خاصے کارٹون ہوتے ہیں۔ انہیں اپنے کارٹون ہونے کا خود بھی احساس
ہوتا ہے۔ وہ اس احساس ہی میں زندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی
کو اس فریم میں جڑ لیا ہوتا ہے۔ اور کسی صورت میں بھی اس سے باہر ہونے کو
تیار نہیں ہوتے۔ ان کے خیال میں زندگی یوں بھی گزر جاتی ہے۔ یوں بھی گزر سکتی ہے۔
بہر طور گزر سکتی ہے۔ زندگی کے متعلق ان کا یہ نظریہ بلند ہو یا پست بہر حال ایک

نظر یہ ضرور ہے۔ ان کا اپنا نظریہ۔ دلربا کے رنگ محل میں آنے والے کارہون لوگ یہ تھے۔

(۱) صوفی جی عرف کالا جادو۔

(۲) مسٹر اخبار

(۳) چچا غالب کی روح

(۴) پنڈت سورج گہرمن چاند گہرمن

(۵) جانی کیا بیہ عرف چپلی کباب۔

یہ نام دلربا نے اپنے رنگ محل میں آنے والے کارٹون لوگوں کی ہر بات کے عین مطابق سوچ سمجھ کے رکھے تھے۔ صوفی جی عرف کالا جادو عامل روحانی تھے۔ تعویذ گنڈا ٹوٹہ ٹکا کرتے تھے۔ سحر و پریخوانی میں بھی بقول ان کے وہ لا جواب تھے۔ ہر جمہرات کو دلربا کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور آتے ہی دوزخ ہو کر بیٹھ جاتے۔ آنکھیں بند کر لیتے۔ اور منہ میں جلدی جلدی کچھ پڑھتے ہوئے دلربا کو رہ کر روحانی پھونکیں مارا کرتے۔ اور ہر پھونک پر ذرا سا سرک کر اس کے قریب قریب ہوتے جاتے۔ پائوری یا کی بیماری تھی انہیں۔ منہ سے ان کے بڑی بدبو آتی تھی۔ بس ایک ہی بھیکے سے دلربا کا دماغ پریشان ہو جاتا۔ بوکھلا کر کسی بہانے اٹھ جاتی۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ اور صوفی جی کا روحانیت کے اسٹیشن پر شنٹ کرتا ہوا انجن بغیر وسل دیئے ایک لائن سے دوسری لائن پر ہو جاتا۔ وہ بڑی بائی کے پاس جا بیٹھتے۔ دلربا کے دھندے کی ترقی کے لئے تعویذ لکھتے اور بڑی بائی قوام کا انہیں ایک پانچیش کتنی جس کے نشے میں وہ اپنے مرشد کا مرتبہ ادیا پھر معرفت میں ڈوبی ہوئی کوئی نعت پڑھتے۔

اور ساتھ ساتھ روتے بھی جاتے۔ اتنے موٹے موٹے آنسو ان کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگتے۔ ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلتا وہ روتے تھے تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی آنکھوں میں لگا ہوا آنسوؤں کا کوئی پائپ پھٹ گیا ہو۔ آواز ان کی ایسی تھی جیسے کسی ٹرک کے پھٹے ہوئے ہارن کی۔ آس پاس بسنے والوں کے بچے بالے چونک کر چہینے لگتے۔ مگر صوفی جی کہا کرتے تھے۔
”میری آواز پر پریاں عاشق ہیں۔“

مسٹر اخبار ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ جب آٹابیس اسی قسم کی باتیں اس کی زبان پر ہوتیں۔

”دلربا اب کے میں نے تمہارے دانتوں کی تعریف میں سات صفحے کا ایسا ایڈیٹوریل لکھا ہے کہ تمہارے حریفوں کے سارے دانت کھٹے ہو جائیں گے۔ آنے والے شمارے میں پہلے اور آخری صفحے پر تمہاری چار تصویریں ہوں گی۔ چار تصویریں۔ چار مختلف پوز۔ فرنٹ۔ پروفائل۔ سیمی پروفائل۔ کلوز اپ۔ چار بڑے چار منگ پوز۔ ایک ساری میں۔ ایک فراک اور شلوار میں۔ ایک برجس اور جیکٹ میں۔ اس پوز میں تمہارے سر پر جیک کیپ ہوگی۔ اور چوتھا چوڑی دار پا جائے اور ڈھاکے کی ٹمل کی قمیض میں۔ دیکھو مجھے جھاڑنا جھڑکنا نہیں میں تمہارے ریشمی الجھے ہوئے بالوں کے معھے سلجھانے لگا ہوں۔“

مسٹر اخبار باتوں کے کالم پر کالم چھاپے چلا جاتا۔ اور دلربا بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سنا کرتی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز ہنسی کھیل اُڑتی۔ جس کا

مطلب یہ ہوتا کہ میری پزار جھاڑتی جھڑکتی ہے کسی کو۔ بہر حال تم جی بھر کر حرکت
جھاڑ لو۔

اور پھر مسٹر اخبار جیب سے کھڑا نکال کر نیٹ ہی پینے لگتا۔ اور جیب نشہ
تیز ہو جاتا تو پاؤں سے گھنگر و باندھ کر ساندوں سے کہتا ساندہ بجاؤ۔ اور خود
نشے میں نا چنے لگتا۔ دلہا سے کہتا۔

وہ دیکھو دلہا آج تمہیں کبیرت ناٹیم۔ منی پوری۔ کھٹا کلی اور کھٹک ناچ
کے وہ نمونے دکھاتا ہوں کہ اودھے شنکر۔ میگھ رنجنی۔ گد مبری اور
ناگ سور اولی کو بھول جاؤ گی۔ اگر تم میرے آگے اپنی شیرینی دھر دو تو
ساری نرت و دیا صرف نو دن میں تمہاری ٹانگوں میں بھر دوں گا۔ یہ
دیکھو کیسا پوز ہے۔ یہ رمبا۔ یہ فوکس ٹراٹ اور یہ ٹینجو۔ تمہیں اس
لباس میں دیکھ کر آج میری طبیعت بڑی خوش ہوئی ہے۔ بانی گاڈ
تم اس لباس میں اس صدی کی حوا معلوم ہوتی ہو۔ دل ہی چاہتا ہے
کہ آج تمہاری شوگر کو بس دیکھتا ہی رہوں۔ اور ناچتا رہوں۔ ان ریشمی جھاؤں
سے جھانکتی ہوئی تمہاری گوری گوری پتیلیوں کا مجھ پر ایسا جادو چلا ہے
کہ جی چاہتا ہے ناچتا ہی چلا جاؤں۔ اور تم بھی اب تر ب چال چلاؤ۔
اکاڈگی۔ صرف دو پتے۔ دو دل۔ دو پنچھی۔ امد یہ تمہارا طبعی سالہ پانی
کا غلام۔ مونچھیں دیکھو مردود کی۔ چینی جادو گر۔ رقیب روسیہا۔ تمہارے
چہرے اور میری آنکھوں کے درمیان سالہ بے رنگی روند کی طرح پھیلا
ہوا ہے۔ اسے کہو اکھٹی کرے اپنی تاش۔ اب یہاں چوٹ چلے گی۔

کیرم چلے گی۔ کالی اور سپید گوٹوں کا کھیل۔ اور تم کوٹین ہو۔ دلہہ ہاتھ مل
کوٹین ہو۔ لو میں چلانے لگا ہوں سٹرائیکر۔ کوٹین میری ہے۔ میری
پوکٹ میں جائے گی۔ داد دو۔ دلہہ ہاتھ ملے داد دو کیسا سڑوک دکھایا
ہے۔“

اور دلہہ ہاتھ ملے ہوئے کہتی۔

”صرف داد ہی نہیں۔ مسٹر ڈیر اخبار میں تمہیں جیل اور بھگند بھی دیتی
ہوں۔ واقعی اس وقت تمہاری ٹانگیں اور تمہارے پاؤں رہنے کی طرح
چل رہے ہیں۔ ناچتے ہو کم اور گھاس زیادہ کھودتے ہو۔ ایسا
سست ناچ آجکل پسند نہیں کیا جاتا۔ ذرا رفتار دکھاؤ اپنے ناچ کی۔“
اور مسٹر اخبار یہ سنتے ہی بے تحاشا گھومنا شروع کر دیتا۔ جیسے کسی لٹوکو پوسے زور
سے جالی مار دی جائے۔ اور وہ تیز تیز گھومنے لگے۔ اور پھر گھومتے گھومتے
اخبار پھٹ جاتا۔ بیہوش سا ہو کر زمین پر گر جاتا۔ اور ہانپنے لگتا۔ بچا پامسٹر اخبار ایوننگ
ایڈیشن۔ دلہہ ہاتھ ملے۔ جس کی ساری سرخیاں، ساری خبریں دلہہ ہاتھ ملے کے گرد
گھومتی تھیں۔

اور دلہہ ہاتھ ملے اخبار کو بچے کی طرح تھپکتے ہوئے۔ اس کی طوطے کی سی ناک
پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی۔

”جاگو۔ مسٹر اخبار جاگو۔ صبح ہو گئی۔ اس وقت تو تمہیں گلیوں اور بازاروں
میں دھڑا دھڑا بکنا چاہئے۔ اور تم یہاں ڈھیر ہو رہے ہو۔ مائی ڈیر
پیرٹ جاگو۔ سب بچھی جاگ اٹھے۔ تم ابھی تک نیند میں ہو۔ آنکھیں

کھولو۔ مائی ڈیئر پیرٹ۔ آنکھیں کھولو آنکھیں۔ اللہ اللہ کہ وہاں
مسمو۔“

چچا غالب کی روح دلربا نے ایک شاعر کا نام رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی غزلیں
اور گیت دلربا کو گانے کو دیا کرتا تھا۔ نام نہ جانے کیا تھا اس کا مگر تخلص صحرائی
تھا۔ اور شکل و صورت سے بھی وہ بالکل صحرائی ہی معلوم ہوتا تھا۔ چہرے اور
سر کے بال بڑھے ہوئے۔ پیٹ بھی حد سے زیادہ بڑھا ہوا۔ گفتگو بھی شعروں
میں کیا کرتا تھا۔ بولتا کم اور روتا زیادہ تھا۔ ایک بات اور دس آنسو۔ اور کبھی
کبھی تو رونے کا اُسے اتنا شدید دورہ پڑتا کہ زخمی بھڑیئے کی طرح چنچنے لگتا۔
آنکھیں اس کی سادوں بھادوں کی جھڑپاں لگا دیتیں۔ روتے روتے اس کی کھگھی
بندھ جاتی۔ کمرے میں بچھے ہوئے قالین پر مرغ لبمل کی طرح تڑپتا۔ اور
پھر یکدم سناٹے میں چلا جاتا۔ جیسے شعروں کی تلاش میں دھرتی سے بہت
دور نکل گیا ہو۔ اور دلربا اس کی توند کو سہلاتے ہوئے کہتی۔

”صحرائی صاحب آپ کا یہ دیوان تو بڑا بھاری بھر کم ہے۔ بڑا انجیم
ہے۔ اس میں غزلیں کتنی ہیں؟ رباعیاں کتنی ہیں؟ قصیدے کتنے ہیں؟
اور نظمیں کتنی؟“

اور صحرائی صاحب فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ اور دلربا کو رباعیاں سناتے۔ اپنی
رباعیاں۔ عمر خیام کی رباعیاں۔ فرخی کی رباعیاں۔ رودکی اور عنصری کی رباعیاں۔
پنڈت سورج گروہن چاند گروہن جو قشتی تھا۔ بخومی تھا۔ آتے ہی جنتیری کھول لیتا۔
پرشن لگاتا۔ رائے تیار کرتا۔ دلربا کا گورا گورا سنبھل سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر

ستاروں میں چلا جاتا۔ اس کی روپ ریکھا کی بھول بھلیاں میں کھو جاتا۔ اور اس کی ہفتیلی کی لکیروں پر انگلی پھیرتے ہوئے کہتا۔

”تم بڑی بھاگوں ہو دلربا۔ بھگوں تجھے بڑا دھن دے گا۔ تو بھی روپ

وان دیا کر۔ کسی دن رات کو میرے جوش کُنڈ میں آنا۔ جوش کے بڑے

بڑے چمٹکار دکھاؤں گا۔ ستاروں سے تمہاری باتیں کراؤں گا۔“

اور پھر وہ اس کا دوسرا ہاتھ بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ کہتا۔

”سُندر ناری۔ سُندر دلربا۔ تیرے اندر ایک اور دلربا سوئی ہوئی

ہے۔ جب منگل بدھ ستار اکنجہ راسی میں آئے گا تو وہ جاگے گی۔

اور تو کسی کے ساتھ اس گھر سے بھاگے گی۔ اور جس دن یہ ہوگا سورج

کو گم ہن لگا ہوگا۔“

یہ جملہ سُنتے ہی بڑی بائی چونک جاتی۔ سروتا پنڈت سورج گم ہن کی کمر پیدے مارتی اور دھاڑتی۔

”ارے او پنڈت چاند گم ہن سورج گم ہن۔ بند کہ اپنی بکواس۔ بھاگے

گی تیری جو رو میری دلربا کیوں بھاگے گی۔“

بڑی بائی کی جلی کٹی سس کر پنڈت سورج گم ہن کو گم ہن لگ جاتا۔ وہ اپنا سر اپنے

کالے دوشالے میں چھپا لیتا۔ اور سیڑھیوں کی طرف سرک جاتا۔ بڑی بائی کا سروتا

آنے سے پہلے ہی اس کی سپاری کٹ چکی ہوتی تھی۔ وہ تو بس دلربا کے گورے

گورے ہاتھوں کے ساتھ گھڑی دو گھڑی کھیلنے آتا تھا۔ بس اسی میں اس کا کام

ہو جاتا تھا۔

جاتی کیا بیٹے عرف چہلی کباب کی دکان بڑی بائی کے چہارے کے بالکل سامنے
تھی۔ وہ لنگڑا تھا اور کانا بھی۔ یعنی اس کے چہرے کے گیرے کا صرف ایک
لنگڑا تھا۔ جس کا فوکس جب تک دلربا دریچے میں بیٹھی رہتی فقط اس کے چہرے
پر ہی رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے کسی جنم میں سانپ ہو۔ دلربا کو ٹٹکی لگائے
دیکھتے ہوئے اس کی اکلوتی آنکھ تھکتی ہی نہ تھی۔ بس مسلسل دلربا کو ٹٹکر دیکھے جاتا۔
کئی بار ایسا ہوا کہ اس نے انگلی کو سیخ سمجھتے ہوئے کباب اس پر لگا دیا۔ اور
آگ پر دھردی۔ آپرخ سے اس کا اپنا گوشت جلا تو چونک پڑا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ
کباب سیخ سے اتار کر چٹنی کے کٹورے میں ڈال دیا۔ اور خالی سیخ کا ہک کے
آگے رکابی میں رکھ دی کہ نوش کیجئے۔ دلربا اس کی ایسی حرکتیں دیکھ کر ٹھاٹھ
ہنسا کرتی تھی۔ ایک دن دلربا کے ماتھے پر چمکتے ہوئے جھومر کو دیکھنے میں جانی
کباب یہ ایسا محو ہوا کہ آپرخ کو تیز کرنے کے لئے اٹھاتا تھا کوئلہ اور اٹھا کر اپنی جوتی
آگ میں رکھ دی۔

دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن۔ وقت کا چکر یوں ہی چلتا رہا۔ اور
دلربا کے اندر سوئی ہوئی دلربا چپکے سے جاگ اٹھی۔ اُس دن سورج کو گرہن لگا
ہوا تھا۔ دلربا ایک پٹھان خوبرو خان کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی۔ خوبرو خان
اُسے اُس بازار سے بڑی دور کو بہت سی علاقے کے مرغزاروں میں لے آیا۔ لیکن
کچھ عرصہ کے بعد دلربا بیمار ہو گئی۔ اور ایسی بیمار ہوئی کہ اس کے بچنے کی کوئی
امید نہ رہی۔ خوبرو خان نے اس کے علاج معالجے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر کچھ
افاقہ نہ ہوا۔ ایک دن خوبرو خان نے اُس سے کہا۔

”دلربا یہ کوہستانی علاقہ۔ یہ اونچے اونچے برف پوش پہاڑ گنجان جنگل۔ اور ان ندیوں کا نمکین پانی تمہیں راس نہیں آیا۔ میں تمہیں راس نہیں آیا۔ یہ پیار تمہیں راس نہیں آیا۔ چلو میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔“

اور دلربا رخصت ہو گئی۔ خوب روخان اُسے اس کی ماں کے پاس چھوڑ گیا۔ دلربا کو دیکھتے ہی پالنے پوسنے کی محبت بڑی بائی کے سینے میں کھولنے لگی۔ چند دن ناراض رہی اور پھر پہلے کی طرح اس کے ساتھ گھل مل گئی۔ لیکن اب اس کی زندگی کے دن بہت کھوڑے رہ گئے تھے۔

ایک دن اچانک وہ بیمار ہو گئی۔ دو دن بچا آیا اور تیسرے دن مر گئی۔ اور ایک اچھا خاصا مکان اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔ جس کے نیچے تین چار دکانیں۔ اور اوپر کے حصہ میں بڑی بائی کی رہائش۔ سو سوا سو روپیہ ماہوار دکانوں کا کرایہ آتا تھا۔ اب دلربا اُس مکان کی واحد مالک تھی۔ رنگو بڑی بائی کی موت کے بعد زندگی میں ایک بار پھر لاوارث ہو گیا۔ اس کا خیال تھا اب وہ اس گھر سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن دلربا نے اُسے اپنے دل کے ڈربے میں بند کر لیا۔ کیونکہ وہ بڑی بائی کے پیار کی نشانی تھا۔ دلربا کی صحت پہلے سے دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ کوہستانی آسیب اُسے چھوڑ چکا تھا۔ وہ ایک بڑے قابل ڈاکٹر کے زیر علاج تھی۔

رنگو کو فلک سیر کھانے کی عادت تھی۔ بڑی بائی فلک کی سیر کرنے کے لئے انیسویں کی ایک معجون بنایا کرتی تھی۔ جو بہت سی چیزوں کا مرکب تھی۔ کشتوری، عنبر،

موتی، طباشیر، الایچیاں، سو نے چاندی کے ورق اور نہ جانے کیا کیا کھانے پینے کے افیون میں ملا کر معجون تیار کیا کرتی تھی بڑی بائی۔ وہ رنگو کو بھی فلک کی سیر کرانے کے لئے فلک سیر کھدیا کرتی تھی۔ رنگو نے دلہا کو بھی فلک سیر کی چاٹ پر لگایا۔ اور کچھ عرصہ کے بعد وہ دونوں شراب بھی کثرت سے پینے لگے۔ جس کی وجہ سے دلہا کو دق ہو گئی۔ اور راگ رنگ کے متوالے اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ رنگو بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ وہ بھی بے وفائے دلہا کے زیور اور نقدی لے کر نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ امداسی دوران میں سب سے بڑی مصیبت تو دلہا پر یہ ٹوٹی کہ برسات میں لگاتار بارشیں ہونے سے دلہا کے مکان کو سخت نقصان پہنچا۔ پرانی عمارت تھی۔ بیشتر حصہ گر کر زمین پر آ رہا۔ دلہا کو نقل مکانی کی مصیبت آپڑی۔ مکانہ کائنیں خالی کر گئے اور آمدنی کا وہ ذریعہ بھی جاتا رہا عجیب مصیبت تھی۔ بیماری دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کتا کتا لگ کر علاج کرو۔ اور اس کے لئے دولت کی ضرورت تھی۔ دلہا اس جگہ کو بیچنے پر مجبور ہو گئی۔ بے کسی نے کیا دینا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں اور پرانی مٹی کے ڈھیروں کا کسی سے کیا مل جاتا تھا۔ صرف زمین کا مول پڑا۔ اس نے رقم لے کر پیسے باندھی اور اپنا باقا وعدہ علاج کرانے لگی۔

متواتر سات سال وہ اپنی بیماری کے ساتھ لڑتی رہی اور آخر کامیاب ہو گئی لیکن اب جوانی بیت چکی تھی۔ حسن و شباب شبنم کی طرح اڑ گیا تھا۔ عجیب انقلاب تھا۔ نہ وہ شمع رہی نہ پروانے۔ نہ وہ دلہا رہی نہ دیوانے۔ نہ راگ رنگ آمد نہ وہ رنگ محفل۔ اُسے کئی کئی روز کے فاقے آنے لگے۔ مالک مکان الگ آئندوں

مکان کے کرائے کا تعاضا کرتا تھا۔ آخر تنگ آکر اُس نے وہ مکان چھوڑ دیا۔ کسبنوں کی گلی میں ایک کھولی میں آگئی۔ کہاں چبارے میں رہنے والی دلربا اور کہاں کھولی میں رہنے والی حقیر کسبنیں۔ جن کی قدر و قیمت ہی کیا ہوتی ہے وقت و وقت کی بات ہے۔

دلربا کو اپنی جوانی کے بیت جانے کا بڑا غم تھا۔ جسے غلط کرنے کے لئے وہ افیون کھایا کرتی تھی۔ دورتی طلوع آفتاب سے پہلے اور دورتی غروب آفتاب کے بعد۔ ادھر شفق سے افق کے اداس کنارے رنگیں ہو جاتے اور ادھر افیون کے کیف سے دلربا کی اداس آنکھیں۔

افیون کا کچھ حلق سے نیچے اترتے ہی نشہ ہو لے ہو لے سلگنے لگتا۔ اور دلربا بن ٹھن کر اپنے پالتو طوطے گلہام کو کندھے پر لئے اڑے پر بیٹھ جاتی۔ اور حقے کی ٹڑی منہ میں لے کر لمبے لمبے کش لگاتی۔ بنارس میں تبا کو افیون کے نشے میں ایک عجیب کیف پیدا کر دیتا۔ ہلکی ہلکی پیرریوں کی گود میں ہورے لیتے ہوئے دلربا مزے میں آنکھیں بند کر لیتی اور اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کی مغرور جوانی واپس لوٹ آئی ہے۔ جیسے وہ پھر جوان ہو گئی ہے۔

کتنا دلخیز۔ کتنا طربناک تھا وہ احساس۔ اس کے خیالوں کے دھندلوں میں گزری بیتی جوانی کے مہکے مہکے سپنے جگنو بن کر ٹمٹماتے چلے جاتے اور دلربا ان کا تعاقب کرتی۔ اسی ترنگ میں افیون کا نشہ انتہائی عروج پر پہنچ جاتا۔ پینک میں دلربا کا سر جھکتے جھکتے سینے سے جا ٹکراتا۔ اور وہ ہڑبڑا کر چونک اٹھتی۔ اور اس کا گلہام پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے اڑتا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

”ڈر گئیں دلربا؟“

”ڈرنا ڈنا سہنا تو نہیں دیکھا؟“

”مقدار سے زیادہ تو نہیں کھالی آج؟“

”نصیب دشمنان طبیعت ناساز تو نہیں آج؟“

اور دلربا ہنس دیتی۔ اور اپنے ہونٹ اپنے گلہام کی سرخ چوہچ سے ملا تے ہوئے بڑے پیار سے کہتی۔

”تیرے صدقے۔ تیرے داری۔ تیرے قربان۔ ایک بوسہ تو دے

میرے گلہام۔“

اور دلربا کا گلہام اپنی سرخ چوہچ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیتا۔ اور دلربا کا پالتو کتا جس کا نام اُس نے مجنوں رکھا ہوا تھا۔ کھولی کے کسی کونے کنارے سے نکل کر جسم کو جھاڑتے ہوئے جوش رقابت سے بھونکنے لگتا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

”شہد سے زیادہ میٹھے اور لذیذ بوسے اور اس طوطے چشم، سبز

قد مے کو یوں فیاضی سے دیئے جا رہے ہیں۔ ایسے نخلی بوسوں کی

بارش اور اس ٹیڑھی چوہچ پر۔ بڑی بد ذوق ہوتی جا رہی ہو دلربا۔

دیکھنا اس ٹیڑھے نشتر سے تمہارا نخل سا ہونٹ کہیں زخمی نہ ہو جائے۔

میں بھی تو تمہارا شہید ہوں۔ ایک بوسہ دردش کو بھی مل جائے۔ دیکھو

تو کیا حالت ہو رہی ہے تمہاری محبت میں۔ سوکھ کر کاٹا ہو رہا ہوں۔

پتھر نکل آیا ہے۔ پوچھ لے دل والوں سے بھی وفادار کہیں گے تیرے

دیوانے کو۔ نادان نہ بنو دلربا۔ پتھی کے پیار کا کیا بھروسہ۔ پیت لگا کر

اڑ جاتے ہیں بچھی۔ پہلے زخم کیا مٹ گئے۔ جو نئے فشتروں سے
کھیلنے لگیں؟“

دلربا کا مجنوں کٹی ہوئی دم کو ہلاتے ہوئے اس کی ٹانگوں میں اکھٹتا۔ اور وہ اُسے
تھپک تھپک کر لوریاں دینے لگتی۔

سو جا مجنوں سو جا

سو جا چندا سو جا

سو جا جانی سو جا

اور دلربا کا مجنوں برساتی کھنک کی طرح سمٹ کر وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ میٹھانا سہی
میٹھی سی بات ہی سہی۔ گر نہیں بوسہ تو بوسے کی سی بات تو ہے جسم سے دور سہی
دل سے تو دور نہیں۔ سوال تو صرف قربت کا ہے۔

کہتے ہیں گیدڑ کی شامت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔ اور دلربا کے مجنوں
کی جو شامت آئی تو ایک دن کھولی سے نکل کر ٹھٹھا ٹھٹھا گلی سے باہر بازار میں پہنچ
گیا۔ اور ناگہاں اس کی موت کے فرشتے آ گئے۔ اس دن کمیٹی کے کتے مارا دارہ
گر وکتوں کو نہ ہر دیتے پھر رہے تھے۔ پروا چل رہی تھی۔ دلربا کا مجنوں جھونکوں
سے مست ہو کر مورچال چلتا ہوا سامنے کوڑے کرکٹ کی ڈھیری پر پڑھ گیا اور
گنگنا تے یعنی کوں کوں کرتے ہوئے اگلے پنجوں سے مٹی کریدنے لگا۔ اتنے میں
اس کی قضا کے کارندے آ گئے۔ کتے کی ہیبت کڈائی سے انہوں نے یہی اندازہ
لگایا کہ بادلا ہے۔ اور حدود اور بعد ہی کچھ ایسا تھا دلربا کے مجنوں کا۔ پتلا دُ بلا۔
آنکھیں پھٹی پھٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی۔ لٹکے ہوئے جبرٹے۔ اور ان سے ٹپکتی

ہوئی رال۔ جھاگ۔ دونوں طرف کی پسلیاں ابھری ہوئیں۔ اور ان پر کاغذی بادام کے جھیلکے کی مانند گوشت پوست۔ پھپھی ٹانگوں کے درمیان دم کے نیچے لٹکتے ہوئے چھپرے دوں کے کچھے۔ سب کتے ماروں نے متفقہ طور پر یہی کہا خطرناک کتا ہے ختم کر دے گا۔ وہ کوندے کی طرح لپکے۔ چاروں طرف سے زغے میں لے کر وہیں دھڑلایا۔ یکے بعد دیگرے ملائی میں زہر کی چار گولیاں داغ دیں۔ چند ہی لمحوں میں دلہ با کا مجنوں وہیں اٹھ گیا۔ دم چونکہ پہلے ہی اچھی خاصی کٹی ہوئی تھی لہذا کمیٹی کے بہادر کان کاٹ کر لے گئے۔ تاکہ سندر ہے۔

دلہ با ابھی اڑے پر بیٹھی ہی تھی کہ چند چمار آگیا۔ اور کان پکڑ کر لگا رام رام کر سنے۔ چند و گلی کی نکر پڑا ڈھ لگاٹے جوتیاں گانٹھا کرتا تھا۔
”دخیر تو ہے لالہ رام نام جب رہے ہو؟“ دلہ بانے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”انیاٹے۔ گھور انیاٹے۔ پاپ۔ مہاپاپ۔“ چند و نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔

”دلہ با تیرے مجنوں کو زہر دے کر مار دیا۔“
”کس نے؟“ دلہ با یہ سنتے ہی یکدم بوکھلا گئی۔ اس کی آواز غم سے بھرا گئی۔

”کس نے مارا میرے مجنوں کو؟“
”کمیٹی کے پامپوں نے۔“ چند و نے جواب دیا۔

”دیکھو تو کل جگ میں کیا کیا ہو رہا ہے“

”کہاں ہے میرا مجنوں؟ کہاں ہے میرے دل کا ٹکڑا؟ دلربا نے غم و غصہ سے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

”کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ کدھر ہے؟“

”نانو کھڑے کی دکان سے ذرا دُورے گوت موت کی ڈھیری پر یوں سوکھی لکڑی بنا پڑا ہے۔ گوت موت میں سنا ہوا،“ چندو نے جواب دیا۔

”چل تو دکھا مجھے۔“ دلربا شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔

”مردود کہیں کے۔ کیا ظلم کرتے پھر رہے ہیں۔“

اپنے مجنوں کے قاتلوں کو گالیاں دیتے ہوئے دلربا اس کے مقتل میں پہنچی۔ خوش قسمتی سے کتے مارا اس وقت کہیں دوزنکل گئے تھے۔ دلربا کا مجنوں بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کے بادلوں کے نیچے اینٹھا پڑا تھا۔ منہ سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ دلربا نے اس کی لاش پر کھڑے ہو کر کتے ماروں کو وہ کوسنے دیئے۔ وہ تختے سنائے۔ جو آج تک کسی نے نہ سنے ہوں گے۔ ان کی ماں بہن کی پور پور ناپتی چلی گئی۔ یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گندی گالیوں کی چلتی پھرتی ایک بہت بڑی لغت سے۔ چندو چمار اڑے پر پیٹھا ایک فوجی کا قل بوٹ گا نکھٹتے ہوئے اُسے داد دیتا رہا۔

”جیو۔ دلربا جیو۔ طبیعت صاف کر دی۔ ایسوں کے ساتھ ایسا ہی

ہونا چاہئے۔ آج کتنوں کو زہر دیتے پھر رہے ہیں۔ کل کتنے ختم ہو

جاؤں گے تو انسانوں کی باری آئے گی۔ پتے دُبلے۔ یوں الف ننگے

انسانوں کی باری۔ جن کا نہ گھر نہ گھاٹ۔“

اسی اثنائیں شفیادہاں سے گزرا۔ شفیادہاں۔ ایک پاگل۔ مجنون۔ جو اُس بازار میں ہر وقت بالکل ننگا گھوما کرتا تھا۔ الف ننگا ایک سایہ۔ اُسے دیکھتے ہی چندو نے آواز دی۔

”بھاگ جا۔ شفیئے بھاگ جا۔ دیکھتا نہیں قتل عام ہو رہا ہے۔ ننگا

بھوکا، پیلا دُبلا آج کوئی نہ بچے گا۔“

اور شفیادہاں کو لہوں پر ہاتھ دھڑکے یوں تن کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا۔

”رکتے ماروں کی ماں۔“

”ارے آہستہ بول آہستہ۔“ چندو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اگر اکھنوں نے سن لیا تو بس تیری بھی خیر نہیں۔“

”کیوں لالہ میں نے کیا جرم کیا ہے؟“ شفیئے نے آواز دی۔

”میں نے کس کی جو رو کو ہاتھ لگایا ہے؟“

”شرم نہیں آتی تجھے شفیئے۔“ چندو نے کہا۔

”عورتوں کے سامنے ننگا پھرتا ہے۔“

یہ سن کر شفیئے نے ایک پُر زور قہقہہ مارا۔ کہنے لگا۔

”لالہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ اور عورت یہاں کون ہے۔ ان

کھولیوں میں بیٹھنے والیوں کو کیا تم عورتیں سمجھتے ہو۔“

”عورتیں نہیں تو کیا ہیں یہ؟“ چندو نے پوچھا۔

”بہر حال کچھ بھی ہوں۔“ شیفے نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
 درشفیا ان سے بہت دور۔ دھرتی سے بہت دور ہے۔ یہ شہر۔
 یہ گلیاں۔ یہ بازار مجھ سے بہت نیچے رہ گئے ہیں۔ جہاں میں ہوں
 وہاں سے ساری دنیا مجھے ایک اندھیری گلی نظر آتی ہے۔ سونی اجاڑ
 گلی۔ جہاں کوئی نہیں ہے۔“

اور وہ قہقہے پر قہقہہ مارتے ہوئے آگے نکل گیا۔ دلربا اپنے مجنوں کی لاش کو
 ڈھیری پر سے اٹھا لائی۔ کافی دیر تک بین کرتی رہی۔ پھر اپنے مجنوں کو ماسری کے
 پیڑ تلے دفن کر دیا۔ اپنے مجنوں کی موت کا اس کے دل کو بڑا صدمہ ہوا تھا۔ تین
 دن متواتر اس کی کھولی کا دروازہ بند رہا۔ اس نے چراغ نہ جلایا۔ چارپائی چھوڑ کر
 زمین پر سوتی رہی۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا گلفام بھی اس کے ساتھ غمناک
 رہا۔ اپنے رقیب کی موت کے خیال سے نہ سہی دلربا کی غمناکی کے خیال ہی سے
 سہی۔

اس دن دیوالی تھی۔ مکانوں کے منڈیروں پر چراغ جل رہے تھے اور
 ان کے اوپر پھینے ہوئے آسمان میں ستارے۔ دلربا بن کھٹن کراڈے پر اکڑ بیٹھی
 سی تھی کہ الی باہر والا آگیا۔ بولا
 ”چائے لاؤں دلربا؟“

”نہیں۔ اس وقت دل نہیں چاہتا۔“ دلربا نے جواب دیا۔
 ”آج دیوالی ہے دلربا۔ دیکھ کتنے چراغ جل رہے ہیں۔“ الی نے کہا۔
 ”جتنے دے۔“ دلربا نے کہا۔

”یہاں اپنے دل کے داغ جل رہے ہیں۔ تو یہ بتا سنے دن نظر نہیں آیا الی“

”میں گاؤں چلا گیا تھا۔“ الی نے جواب دیا۔

”خیر تو کتنی؟“ دلربا نے پوچھا۔

”بہن بیمار ہو گئی تھی۔“ الی نے جواب دیا۔

”اب کیسی طبیعت ہے تیری بہن کی؟“ دلربا نے پوچھا۔

”اب تو اچھی ہے۔“ الی نے کہا۔

”دو میں نے سنا ہے تمہارا جنوں مر گیا۔“

”مرا نہیں مارا گیا ہے۔“ دلربا نے کہا۔

”سچے عاشق مرا نہیں کرتے۔“

”بڑا افسوس ہے میاں جنوں کی موت کا۔“ الی نے کہا۔

”اس کھولی کی رونق تھا۔“

”مگر اس ظالم دنیا کو کسی کے گھر کی رونق سے کیا؟“ دلربا نے درد

بھرے لہجہ میں کہا۔

”کوئی تاپے کسی کا گھر جلے۔ کوئی مرے کوئی مہار گائے۔“

”وہ تم کمیٹی کے بڑے صاحب کے پاس جا کر ان کی شکایت کرو۔“ الی نے

مشورہ دیا۔

”بڑا صاحب بڑا وہ ہے۔“ دلربا نے کہا۔

”ایک بار نہیں کئی بار گئی اس کے پاس کرتا کرتا کچھ نہیں تسلی دے کر

ٹال دیتا ہے۔“

”اچھا دلربا صبر کرو۔“

”ہاں بھیا صبر کے سوا اہم لوگوں کے پاس اور ہے بھی کیا۔“ دلربا نے ایک لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا اور خاموش ہو گئی۔

افیون کا نشہ دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ بنارس میں تباہی کے ہلکے ہلکے کش ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہے تھے۔ دلربا آنکھیں بند کئے پٹیک میں ہلورے لے رہی تھی۔ اس کے آس پاس بکھرے ہوئے اندھیروں اور اجالوں میں گزرنے والے لمحوں کے بگولے سے اٹھنے لگے تھے۔ جن میں کچھ گزری جیتی رتیں۔ کچھ خواب شاخ سے ٹوٹے ہوئے خشک سوکھے پتوں کی طرح ادھر ادھر اڑتے ہوئے صاف صاف نظر آ رہے تھے۔ شاخ ماضی سے ٹوٹا ہوا ایک پتہ۔ ایک خواب اڑتا ہوا اس کے قریب آیا۔ تو دلربا سانسے اس میں ایک جانی پہچانی صورت دیکھی۔ پنڈت چاند گربھن سورج گربھن کی صورت۔ اور پھر وہ صورت اس سے باتیں کرنے لگی۔

”دلربا۔ میں لنکا سے آ رہا ہوں۔ رادون کے دیس سے آ رہا ہوں۔ ایکے میں نے لنکا میں جنم لیا ہے۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔ چل تجھے لنکا دکھا لاؤں۔ لنکا کے لنگور دکھا لاؤں۔ لنکا میں ہر کوئی بادن گز کا ہے۔ لنکا کے بادن گزے دیکھ کر تو بہت خوش ہوگی۔ اور انسان کو ہمیشہ خوش ہی رہنا چاہئے۔“

”لنکا کیسی ہے؟“ دلربا سینے میں پنڈت چاند گربھن سورج گربھن سے باتیں کرنے لگی۔

”بڑی اچھی ہے۔“

”وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟“

”بہت اچھے ہیں۔ رنگ مگر کالے ہیں۔“

”افیون ملتی ہے لنکا میں؟“

”بہت۔ اور بہت سستی۔ دو آنے تولہ۔“

”نامراد دو تین سیر سوغات کے طور پر ہی لے آتے۔“

”تو میرے ساتھ چل افیون کے ڈبیر لگا دوں گا تیرے آگے۔ دیوار چین سے

بھی بڑی افیون کی دیوار۔ دلی رات اُسے چاٹنا کرنا۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔ لنکا کے پاڑے کھائے ہیں تم نے؟“

”نہیں کھائے۔“

”تو پھر کچھ نہیں کھایا تو نے۔“

”کیسے ہوتے ہیں؟“

”دو بڑے مزے دار۔ لنکا کے نمکین چنے بھی کبھی کھائے ہیں۔“

”نہیں کھائے۔ کیسے ہوتے ہیں؟“

”چٹخارے دار۔“

”چٹخارے دار چیزیں تو مجھے بہت پسند ہیں۔“

”چھنیا بیگم جو کھاتی ہے۔“

”کیا کروں خون میں رہ گئی ہے۔“

”ہرے ناریل کا پانی پیا ہے تو نے؟“

”نہیں پیا۔ کیسا ہوتا ہے؟“

”بڑا ہانسنے دار۔“

”مونڈی کاٹے۔ دو تین آنچورے بھر لانا اپنے ساتھ۔ میرا ہانسنہ بڑا خراب

ہو رہا ہے۔“

”تو ہانسنے کی بات کرتی ہے۔ تیرا تو سارا جیون ہی خراب ہو چکا دلربا۔“

”جو روکے بھائی مذاق کرتا ہے مجھے۔“

”نہیں دلربا میں تو تجھے پیار کرتا ہوں۔ چل بیٹھ اٹن کھٹولے میں تجھے لنکا کی

سیر کراؤں۔“

اور دلربا سینے کے اٹن کھٹولے میں بیٹھ گئی۔ جو بارلوں میں اوپر ہی اوپر اڑنے

لگا۔ نشے کی پینک میں اس وقت بڑا ہی سہانا سپنا دیکھ رہی تھی دلربا۔ اتنے میں

بے فکر دلوں کی ایک ٹولی ادھر آنکلی۔ انہوں نے چھٹر خانی شروع کر دی۔ فقرے

چست کرنے لگے۔

”کیوں جی شام دیے اسی سوں گئے اد۔“

”چھمک چھو بڑیاں بند راں آیاں نیں۔“

”بے خبرے کہیں کے چنیا بیگم کھاتی۔ چنیا بیگم۔“

”اماں چنیا کھینچ سالی کی۔“

”بوڑھی گھوڑی لال لگام۔“

”سر کے بال دسمے سے گالے کٹے ہیں کہ خضاب سے؟“

”کمانی اور نہ پھیا گاڑی جوت میرے بھیا۔“

”و نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت اور بنتی ہے سولہ برس کی۔“

”ٹاٹ کی انگیا مونج کی تنی دیکھ میرے بالم میں کیسی بنی۔“

”ہائے ری تیرے خھرے میں گرم مصالحہ۔“

”در کیوں جی بڑا اچکڑا کیتا ہویا جے دکان آگے؟“

”بدر بانیاں سننے کا شوق ہے۔“

”دوتلکن کیتی ہوئی سوپٹی کوئی تلکے تے ایہدے تروپے توڑے اگوں پچھوں۔“

”کھوڑتے چوناکھٹا بڑا لپیا ہویا اے۔“

”بلہاں تے سرخی اے کہ کسے مان مٹردا لہو پتیا ہویا اے؟“

”د مائی بچے گھٹ۔“

”د ہپیوڑین۔“

”د نانی حقی۔“

”د لو میں دکھاناں تہانوں ایس بڑھی باندری داتماشہ۔“

اور اس نے چپکے سے آگے بڑھ کر دلربا کی کھوپڑی پر ٹھاپ جڑ دی۔ وہ ہڑٹا

کہ چونک پڑی۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے سپنے کا اڑن کھٹولا لنگا پہنچنے سے پہلے

سی دھڑام سے زمین پر آگرا ہے۔ اس کا گلفام ٹرانے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

”دلربا یہ پکے حرامی ہیں۔ لچے۔ لفنگے۔ لوفر۔ اس بازار کے باون گزے۔“

جوتا پکڑ لے اور ان کے گلے چھاڑ کر رکھ دے۔“

دلربا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لپک کہ جوتا پکڑ لیا اور ان پر پل پڑی۔

”سور کے نطفو۔ کتے کے بچو۔ گدھے کی اولادو۔ بوڑھی بندیا تمہاری
ماں۔ تمہاری بہن۔ اور تمہارا باپ بھڑوا ماری۔ اکیسے ہاتھ لگا کر دیکھو
مندھی کاٹو۔“

اور وہ سب ٹھاہ ٹھاہ ہنستے ہوئے ادھر ادھر بکھر گئے۔ تھوڑی دور جا کر وہ پھر
سب اکٹھے ہوئے اور آپس میں ٹھٹھا محول کرنے لگے۔ فلمی گانے۔ فلمی قوالیاں۔ فلمی
ڈائلاگ۔ گالی گلوچ۔ دھینگا مستی۔ دھول دھپہ۔ سامنے ایک کھولی کا دروازہ
بند ہو رہا تھا۔ ایک لپک کر آگے بڑھا۔ اور دروازے کے پٹ پکھاوج کی طرح
بجانے لگا۔ اور دوسرے نے لہکتا شروع کر دیا۔ تیسرا بیڑی کاکش لگاتے
ہوئے بولا۔

”چھمیاں کی بہن کی وہ۔ رات سپینے میں دوبار خراب کر گئی۔“
چوتھے نے پان کی پیک تھوکتے ہوئے کہا۔

”بس دوبار۔ یہاں تو ساری رات سندری کو خدا کی قسم سپینے میں لٹو کی
طرح گھمایا ہے۔ جالی پر جالی۔ کبھی الٹی جالی کبھی سیدھی جالی۔“
پانچویں نے کھنکارتے ہوئے کہا۔

”تم دونوں بکتے ہو۔ سندری اور چھمیاں تو ساری رات میرے پیار کی
چھم چھم کھاتی رہی ہیں۔“

”لو وہ پھر پینگ میں جھونکیں لینے لگی۔“ چھٹے نے کہا۔

”بوڑھی بکری نے گرہن جھکا کر پھر جگالی شروع کر دی۔“

”یہ بوڑھی جونک تو لہو کی ایک بوند نہ چھوڑے گی۔“

”اور میں بھی ادھر سے غلہ چھوڑنے لگا ہوں۔ اب نہ اتنا شاد دیکھنا کہتا
مزا آتا ہے۔“

اور اُس نے جیب سے غلیل نکال کر دلربا کے گلفام کو نشانہ بنا دیا۔ غلہ بچھی کے
پر پر لگا۔ وہ چیخ کر پھڑپھڑایا۔ اور ہوا میں پلٹے کھاتا ہوا گلی میں جا پڑا۔ پاس ہی
ایک رخنہ میں کئی دنوں سے ایک بلی گلفام کو ہر روز ایسے ہی حسترتناک نظروں سے
دیکھا کرتی تھی۔ جیسے دلربا کا عاشق مرحوم جانی کہا بہ کسی زمانے میں جبکہ دلربا جوان
تھی اُسے اپنی دکان پر بیٹھا ٹکٹکی لگائے دیکھا کرتا تھا۔ بلی جھپٹی اور طوطے کی گردن
دانٹوں میں دبائے ہوا ہو گئی۔ غلہ مارنے والے ٹھاٹھاہ ٹھاٹھاہ مہنتے ہوئے آگے
نکل گئے۔ اور دلربا کھولی سے نکل کر بلی کے پیچھے بھاگی۔ الی گلی کی نکر پر کھڑا
اپنے دو دوستوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ دلربا کو یوں بے تحاشا بھاگتے دیکھا تو
سمجھا کوئی آفت آن پڑی ہے بیچارہ ہی پر۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے پے بہ
پے کئی آدائیں دیں۔ مگر دلربا نے وحشت میں کوئی جواب نہ دیا۔ بے تحاشا بھاگتی
گئی۔ بھاگتی گئی۔ بلی گلی سے نکل کر اس طرف ہو گئی جس طرف زمین دوتا نالہ بنانے
کے لئے خندق کھودی جا رہی تھی۔ یہ چونکہ اس علاقہ کا غیر آباد رقبہ تھا لہذا یہاں
رودشنی نہ تھی۔ جا بجا مٹی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ گڑھے تھے۔ ایک طرف بدرو
بہنتی تھی۔ بلی بھاگتے بھاگتے زمین دوزنا لے میں کود گئی۔ اور دلربا کے گلفام کے
پر نو چنبھ لگی۔

وہ چیخ رہا تھا۔ اور اس کی چیخیں دلربا کے دل پر چر کے لگا رہی تھیں۔ وہ بھاگتے
بھاگتے بیدم ہو گئی تھی۔ مگر وہ بھاگ رہی تھی۔ بے تحاشا بھاگ رہی تھی۔ اس کا گلفام

بیٹھ رہا تھا۔ دلربا کو بلارہا تھا۔ آواز میں دے رہا تھا۔

”بچالے۔ دلربا مجھے بچالے۔ موت نے بری طرح دبوچ رکھا ہے۔

پھڑپھڑانے بھی نہیں دیتی۔“

اور دلربا اس کی آواز پر آواز دیئے جاتی تھی۔

”میں آگئی۔ گلغام میں آگئی۔ میں تجھے مرنے نہ دوں گی۔ اب مجھ سے

بھاگا نہیں جاتا لیکن بھاگ رہی ہوں۔“

اندھیرے میں اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فقط اس کے گلغام کی چیخیں اس

کی رہنمائی کر رہی تھیں۔ اس طرف۔ دلربا اس طرف۔ اس گہرے کنویں میں موت

مجھے دبوچے بیٹھی ہے۔ اس کے دانت میری گردن میں دھنسے ہوئے ہیں۔ بولا

نہیں جاتا لیکن بول رہا ہوں۔ جیسے تجھ سے بھاگا نہیں جاتا لیکن تو بھاگ رہی ہے۔

پیار ہو تو ایسا ہو۔ اور تیز۔ دلربا اور تیز۔ بھوک کی موت بہت جلدی کر رہی ہے۔

تو بھی جلدی سے آجا۔ اور دلربا دھم سے زمین دوڑنا لے میں کود گئی۔ اور اس کے

فوراً ہی بعد گلغام کی دردناک چیخیں بند ہو گئیں۔ اتنے میں الی اور اس کے دوست

بھی دلربا کو ڈھونڈتے ہوئے ادھر آنکلتے۔

”وہ اس نالے میں ضرور دیکھ لینا چاہئے۔“ الی نے کہا۔

”ہاں ضرور۔“ اس کے ایک دوست نے کہا۔

”میں ماحس جلاتا ہوں۔“

ماحس کی روشنی میں الی اور اس کے دوستوں نے گہرائی میں جھانک کر دیکھا دلربا

تازہ می تازہ می گیلی گیلی مٹی کے ڈھیر پر لیٹی ہوئی تھی۔ اپنے گلغام کو سینے سے لگایا ہوا تھا۔

گلفام کی چوپنج اور دلربا کے ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے ۔

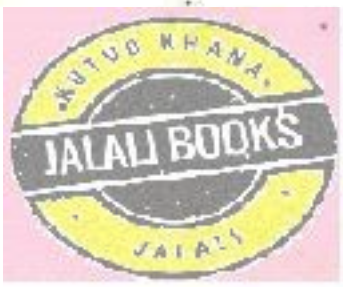
” دلربا ۔“ الی نے آواز دی ۔ ” دلربا ۔“

مگر کوئی جواب نہ ملا ۔ لمحہ توقف کے بعد الی نے پھر بلند آواز میں پکارا ۔

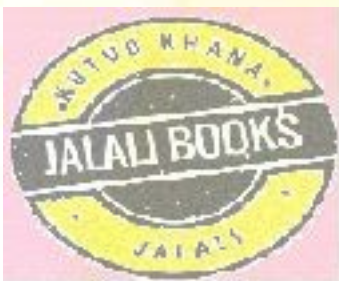
” دلربا — دلربا ۔“

اور کامل سکوت کے چند لمحے یوں ہی گزر گئے ۔

میں نے اسے دیکھا تھا



پاکستان ٹائمز پریس لاہور



ناولٹ

ریشم کا کپڑا

حرف اول

در ریشم کا کپڑا، اپنی طرز کا ایک نرانا ولٹ ہے جس میں داستان گوئی کی پرائی تکنیک کے ساتھ ساتھ نئے انداز کی مینا کاری کا سراغ بھی ملتا ہے۔ آغا اشرف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اس سے پیشتر ان کی بے شمار کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو کر قارئین کی توجہ کا مرکز بن چکی ہیں۔ لیکن زیر نظر ناولٹ فکشن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہا ہے۔ یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا کہ تبدیلی جنس کی ایک معمولی سے خبر یوں افسانے کا روپ دھار سکتی ہے اور قاری کو اس طرح اپنے آپ میں جذب کر سکتی ہے! اس ناولٹ میں جہاں جہاں تصویر کی آنکھ گوری کے کردار اور اس کے گرد و پیش پر مرکوز ہوتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا خانہ بدوشوں اور چہر واپہوں کی تصوراتی زندگی کا فلم چل رہا ہے اور دل بار بار کہتا ہے کہ انہی یوں نہیں تو یوں ہوا ضرور کرے! اسی طرح مصویر کا وجود بھی نہایت اونچے تختیوں کی پیداوار ہے۔ تختیوں کا یہ پیکر جب جنسی تبدیلی کا شکار ہوتا ہے تو پڑھنے والے کو ذرا بھی دھچکا نہیں لگتا۔ کیونکہ مصنف نے اس کا وجود ہی کچھ ایسی مٹی سے اٹھایا ہے کہ اسے کسی قالب میں بھی ڈھالا جاسکتا ہے۔

بلاشبہ آغا اشرف ایک انوکھا کوزہ گر ہے جس کے ہاتھ سا حیرانہ قوت رکھتے ہیں۔ اس کی انگلی کا ایک اشارہ اٹھنی باتوں کو ہونی میں تبدیل کر سکتا ہے اور ناممکن باتوں کو اپنے مخصوص استدلال سے ممکنات میں تبدیل کر سکتا ہے۔ آغا اشرف بلاشبہ سادہ بھی ہے اور منطقی بھی۔

میری آرزو ہے کہ وہ اپنے فن افسانہ نگاری کو اسی طرح سے جاری رکھیں تاکہ آئے دن اسے ادیبوں کو اپنی راہیں تعین کرنے میں آسانی رہے۔

ناولٹ کس حد تک مختصر ہو سکتا ہے اس کا اندازہ آپ گویہ داستان پڑھنے کے بعد ہی ہو سکے گا۔

اشفاق احمد

479/N - سمن آباد - لاہور

ریشم کا کیرا

یہاں کی رت تھی۔

اُدھرندی کے کنارے شہنوت کے پیڑوں میں ایک کہانی جنم لے چکی تھی۔
ریشم کے کیرے کی کہانی۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے ریشم کے کیرے کی کہانی اُس نے ڈی لیکس کلرز میں سکریں پر بھی دیکھی تھی۔ کہانی کا وہ حصہ تو خاص کر بڑا ہی دلچسپ تھا جس میں ریشم کا کیرا شہنوت کے پتوں میں رہتے ہوئے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد اپنی زندگی میں چھ بار سوتا ہے۔ اور چھٹی نیند کے بعد جب وہ جاگتا ہے تو اس کا سر اُسے بھاری بھاری لگتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس پر ایک جتنی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے سر کو بار بار جھٹکتے ہوئے کوئی ایسی شاخ ڈھونڈتا ہے جس پر وہ ریشم کا کون، ریشم کا غنچہ بنا سکے۔

اور پھر ایسی ہی شاخ ڈھونڈ کر وہ اس پر ریشم کا غنچہ بناتا ہے۔ شاخ سے ایک جگہ پیک کر وہ ریشم کے تار اپنے گرداگرد بنتا ہے اور ریشم کا ایک خول بنا کر اس میں بند ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جب وہ اس خول کو چیر کر نکلتا ہے تو اس کی جنس تبدیل ہو چکی ہوتی ہے۔ ریشم کا بھونڈی اور بھیانک شکل کا کیرا ایک بڑی ہی خوشنما تلی بن چکا ہوتا ہے۔

بڑی ہی دلچسپ تھی ریشم کے کیرے کی کہانی۔ اور ڈی لیکس کلرز بھی جن میں

وہ پیش کی گئی تھی کافی دلچسپ تھے۔ اور اُسے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کے اندر بھی کہیں ریشم کا کیرا اچھپا ہوا ہے۔ جو اس کے گرداگرد ریشم کے تار بن رہا ہے۔ وہ کئی دن تک ایسا ہی محسوس کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ وہ ایسا کیوں محسوس کرتا ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اور وہ احساس خود بخود اس کے اندر ہی کہیں ریشم کے کیرے کی طرح سو گیا۔ اور سوتی جاگتی رتوں کے چکر میں جب اس نے ریشم کے جیتے جاگتے کیرے شہتوت کے نئے پتوں پر ریختے دیکھے تو وہ احساس اس کے اندر پھر جاگ گیا۔

جہاں وہ رہتا تھا وہاں سے کھنڈرے فاصلے پر ایک ندی بہتی تھی۔ جس کے دونوں کناروں پر دور دور تک شہتوت کے پیڑ آگے ہوئے تھے۔ فرصت کے لمحوں میں وہ ان پیڑوں کے پاس ٹہلا کرتا۔ یہ اس کی بولی تھی۔ وہ آرٹسٹ تھا۔ طلوع و غروب کے رنگ ندی کے پانیوں میں گھلتے اور کھلتے تو کئی رنگ اس کی سمجھ میں آتے۔ رنگوں کو آپس میں ملا کر نئے رنگوں کو جنم دینے کی کئی سکیمیں اُسے سوچتیں اور وہ ایسی تصویریں بناتا جن میں وہ زندگی کے بہت قریب نظر آتا۔

وہ آرٹسٹ تھا۔ رنگوں کا کھلاڑی۔ رنگوں کے کھیل کھیلتے والا۔ رنگ اس کے کھلونے تھے۔ اور کبھی وہ خود کھلونا بن جاتا اور رنگ اس کے ساتھ کھیلتے لگتے۔ اور وہ بڑی اچھی اچھی تصویریں بنا کر انہیں بیچنے لے جاتا۔ اس بستی کے بڑے بازار میں سڑک کنارے کہیں کسی جگہ وہ اپنی تصویریں بجا کر بیٹھ جاتا۔ آتے جاتے لوگوں کا مجمع لگ جاتا اس کے پاس۔ جن میں تصویروں کے خریدار تو بہت کم ہوتے لیکن ان کو دیکھ کر دل خوش کرتے ہوئے چپکے سے آگے نکل جانے والے زیادہ۔

وہ اس بستی میں ایک کچے کوٹھے میں رہتا تھا جس میں بس ایک کمرہ تھا اور اس کے آگے چھوٹا سا آنگن۔ اس کے آس پاس اور بھی کئی اونچے نیچے کچے کوٹھے تھے۔ برکھا کے چھینٹے آتے تو ان کی گیلی گیلی مٹی سے بڑی عجیب سی مہک آنے لگتی۔ اور وہ لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے اس مہک کو بھانکنے کی کوشش کرتا۔ اس مہک کو اپنی رگ رگ میں رچانا چاہتا۔ اس مہک میں لمبے لمبے سانس لینے سے اُسے بڑا لطف آتا۔ وہ بڑا مزالیتا اس مہک کا۔

اسی مزے میں ایک دن اُسے نہ جانے کیا سوچھی کہ اس نے اپنے کچے کوٹھے کی گیلی گیلی مٹی میں کچھ رنگ گھولے اور ندی کنارے اُگے ہوئے ایک شہنوت کے تنے میں ابھری ابھری ایک تصویر بنائی۔ ایک شکل بنائی جس نے اُس پٹر کو بڑا ہی عجیب بنا دیا۔ تنے سے ملتے جلتے رنگوں سے بنی ہوئی تصویر اور اس میں بنی ہوئی ایک شکل معلوم ہوتا تھا پٹرھی کی شکل ہے بنائی نہیں گئی۔

بستی پر دور دور تک پھیلی ہوئی دھوپ چھینٹے پڑ جانے سے بڑی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ہوا کے دھیرے دھیرے بہتے جھونکوں میں بہار کے پھولوں کی بھیننی بھیننی خوشبو سی ہوئی تھی۔ کھینٹوں کے اُس پار نشیب میں جو ہڑ کے کنارے چھتری نما گھنے بوٹے تنے کوئی چرہ داہا الغوزہ بجا رہا تھا۔ اور اس کی بھڑس گر دن جھکا ئے ہری ہری گھاس چرہ رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تھوڑی دور آگے نکل گیا۔ ایک کھیت کی مینڈ پر کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف دور اور نزدیک ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے واپس لوٹ آیا سگریٹ کا

ایک ہانکا سا کش لیتے ہوئے اس نے برش پکڑا۔ اور اُس تصویر میں جہاں اس
اس سے پہلے آنکھیں بنائی تھیں وہاں ہاتھ بنا دیئے اور جہاں ہاتھ بنا ئے
تھے وہاں آنکھیں بنا دیں۔ جس سے تصویر اور اس میں بنی ہوئی شکل ایک معمہ
بن گئی۔ ایک بھارت۔ ایک پہلی۔ سامنے سے ایک گھسیارہ گھاس کی
گانٹھ اٹھائے ”من پگڑ ہو گیو“ گاتا چلا آ رہا تھا۔ اس نے شہتوت کے پیٹ
میں تصویر اور تصویر میں پیڑ اور پیڑ میں پہلی اور پہلی میں آنکھ اور آنکھ میں ہاتھ
اور ہاتھ میں آنکھ دیکھی تو گھاس کی گانٹھ ایک طرف پھینک پھانک کر ڈنڈوت
کرنے لگا۔

اُدھر سے ڈنڈا ہاتھ میں لئے ایک چرواہی بکریاں ہانکتی چلی آ رہی تھی۔
اس نے نیا نیا لچکا لگایا تھا گھگھری کے گھیرے میں۔ چاندی کی نئی چھاگل لائی
تھی وہ چندوسی کے میڈے سے۔ گھگھری کے گھیرے سے گھسٹ گھسٹ کر
چھٹک رہے تھے چرواہی کی چھاگل کے گھنگرو۔ دنیا جھومر جھومر بھونکی۔ پیڑ
کے پیٹ میں شکل دیکھ کر وہ بھی جھوم گئی۔ بکریوں کو آگے چلتا کیا۔ اور ہاتھ جوڑ
کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے تصویر کی آنکھوں میں ابھی صرف ہاتھ ہی دیکھے تھے۔
ہاتھوں میں آنکھیں نہیں دیکھنی تھیں۔ ورنہ اس کی آنکھوں کا سارا کاجل اسی وقت
بہہ جاتا۔ اور اس کے ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی مٹی میں مل جاتی۔

اتنے میں ایک پھلیرا گجرے اور ہار لئے اُدھر سے گزرا۔ اس نے
پیڑ کے پیٹ میں آنکھ اور آنکھ میں زبان لٹکتی دیکھی تو وہ بھی ہوا میں لٹک گیا۔
اپنی باٹ ہی بسیر گئی اس کو۔ آنکھیں جھپکنے لگا۔ اس کی نظر بند ہو گئی تھی۔ اس کی

زبان اس وقت منہ کی بجائے پیٹ میں دھکنے لگی تھی۔ اور پھر حسب اس کے
 نظر کھلی تو ادھر تصویر میں دوسری آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ اور اس میں ایک پوری
 ٹانگ ٹنگی ہوئی تھی۔ جسے دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں میں جھنجھکی آگئی۔ اس نے
 دنگ لگا دی۔ تھوڑی دور جا کر سر پٹ ہو گیا۔ ایک کیل لے آیا۔ بستی پر چھائے
 ہوئے بادلوں سے ایک ننھی سی بوند اس کی ناک پر گری۔ بڑا اچھا شگون تھا۔
 کیل اس نے پیٹر میں گاڑ دی۔ ٹوکری سے سارے کچرے، سارے ہارنگال
 کو کیل پر لٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھ پھیلا کر منہ میں نہ جانے کیا پھس پھس
 کرنے لگا۔

وہ چپ چاپ ایک طرف کھڑا رہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ دو گھنٹیاں
 ایک دوسرے کے تعاقب میں اس کے قدموں کے درمیان سے ہوتی ہوئی
 سامنے درخت پر چڑھ گئیں۔ پھر جب وہ سب چلے گئے تو آرٹسٹ
 ایک جگہ کھڑا ہو کر یہ دیکھنے لگا کہ ان لوگوں نے اس تصویر میں کیا دیکھا؟ انہیں
 کیا نظر آیا اس تصویر میں جو مجھے ابھی تک نظر نہیں آیا؟ اسی دیکھ بھال میں
 شہتوت کے نئے پتوں میں اچانک اس نے ریشم کے کپڑے رنگتے
 دیکھ لئے۔ اور بت بنا کافی دیر تک یہ دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟
 وہ نرم نرم کو نیلیں کھا رہے تھے۔ کھلدار رہے تھے۔ اور یہ اسے
 اس دن معلوم ہوا کہ بڑے پیٹ ہو تے ہیں ریشم کے کپڑے۔ انہیں
 تو ہر وقت اس کھانے ہی سے کام ہوتا ہے۔ نرم نرم پتوں اور کو نیلیوں
 کو چھلنی کئے جاتے ہیں۔ اور وہ سوچنے لگا یہ پتے کیوں کھاتے ہیں میٹھے

میٹھے شہتوت کیوں نہیں کھاتے ؟

وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ مگر اس گتھی کو نہ سلجھا سکا۔ بہر حال ایک اچھا شغل مل گیا تھا اُسے۔ فرصت کے لمحوں میں وہ شاخوں میں جھانکتے ہوئے چپ چاپ کھڑا ریشم کے کیڑوں کا تماشہ دیکھتا رہتا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کیڑے ریشم کا غنچہ کب اور کیسے بناتے ہیں ؟ یہ کیڑے تلی کب بنتے ہیں ؟ ان کی جون کیسے بدل جاتی ہے ؟ اُس کا اشتیاق دن بدن بڑھ رہا تھا۔ کیونکہ ریشم کے کیڑوں میں جلدی جلدی کچھ تبدیلیاں ہو رہی تھیں سو پہلی نیند کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اور پھر ایک دن جب کہ وہ ریشم کے کیڑوں سے متعلق اپنا ایک تاثر تصویر میں پینٹ کرنے جھکی جھکی شاخوں کے سابلوں میں اکھڑا ہوا تو چڑھتے سورج کی گوری گوری دھوپ میں اس نے ریشم کے کیڑوں کو گہری نیند سوتے دیکھا۔ یہ ان کی پہلی نیند تھی۔ مگر گوری کو اُس دن اُس نے دوسری بار وہاں دیکھا تھا۔ وہ کیڑے کا جھولا پیچھے لٹکائے شہتوت کے پتروں تلے بکھرے ہوئے سوکھے پتے اور جھانکڑیں اکٹھی کر رہی تھی۔ اور سوئی سوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے وہ بھی نیند میں چل پھر رہی ہو۔ نیند میں پتے اور جھانکڑیں اکٹھی کر رہی ہو۔

گوری بستی کی ایک بیوہ مائی شبو بھٹیبارن کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بڑی چنچل، بڑی ہنس مکھ۔ ہر وقت اور ہر حال میں ہنستے رہنے والی لڑکی۔ جب وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی تھی تو اس کی باتوں میں پھول کھلتے تھے۔

اسے گوری کا ہنس ہنس کر باتیں کرنا پڑا اچھا لگتا تھا۔ اور گوری کو تو آگے سے
کی کئی چیزیں بڑی پسند تھیں۔ شانوں کو چھوتے ہوئے اس کے لائے لائے
گھنگرے بالے بال، اس کی چوڑی پیشانی، ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ،
اس کے ایک گال پر کالاتل، اس کی عورتوں کی سی چال، سگریٹ سگاکر
سوچتے ہوئے اس کا ادھر ادھر ٹھٹھنا۔ عورتوں کی سی اس کی باریک آواز،
آنکھیں جھپک جھپک کر اس کا باتیں کرنا، اس کی بنائی ہوئی تصویریں۔
گوری کو اس کی کئی چیزیں پسند تھیں۔ جس کا اظہار وہ اس کے سامنے اپنی
شرارتوں میں اکثر کیا کرتی تھی۔

وہ اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ دو کوٹھے چھوڑ کر تیسرے کوٹھے میں۔
جس کے سامنے ببول کا بھوت سا پیڑ تھا۔ ایک طرف اس کا ایک
درمیانی ڈال باہر کی طرف آسیب کے بازو کی طرح زمین کی جانب ٹٹک
رہا تھا۔ جس کے نیچے مائی شبنو نے بھٹی بنائی ہوئی تھی۔ دن ڈھلے بھٹی گرم
ہوتی تو دانے بھنوانے والوں کی دہاں چہل پہل ہو جاتی۔ دانے مائی شبنو
بھوتا کرتی اور گوری بھٹی میں سوکھے پتے اور جھانکڑیں جھونکتے ہوئے ادھر
ادھر جھانکتی رہتی اور بیٹھے بیٹھے کوئی نہ کوئی شرارت کرتی جاتی۔ اسی لئے تو
اپنی ماں سے اکثر ٹپا کرتی تھی۔ مگر وہ کیا پرواہ کرتی تھی ایسی پٹائیوں کی۔
شرارت تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُسے شرارت سے روکنا پانی کے
آگے پاڑ باندھنے والی بات تھی۔ آرٹسٹ انگن میں بیٹھا تصویریں بنایا کرتا
تو وہ شیشہ سورج کے سامنے کر کے اس پر چپکارے ڈالا کرتی۔ وہ گلی میں

گزرتا تو منڈیر سے لگ کر اُسے کنکر مارتی۔ اور وہ ہنس دیا کرتا۔ شریر لڑکی۔
اس بستی کی شریر لڑکی۔

شریر لڑکی نے ایک دن اُسے بڑا ہی ستایا۔ اس کی ماں کسی کام سے
باہر گئی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی تھی گھر میں۔ آرٹسٹ آنگن میں بیٹھا تصویر بنا رہا تھا۔
وہ اندر سے شیشہ اٹھالائی اور اس پر چمکارے ڈالتی رہی۔ پھر وہ منڈیر سے
لگ کر اس کی طرف کنکر چلاتی رہی۔ پر ماحل رہی تھی۔ آرٹسٹ کام کرتے
کرتے مست ہو کر بیٹھا بیٹھا وہیں سو گیا۔ گوری کو ایک اور شرارت سو گئی۔
اس نے کڑک بھٹی ہوئی مرغی ڈربے سے نکال کر گلی میں اچھال دی۔ مرغی
پروں کو پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر آتے ہی کڑکڑاتی ایک طرف بھاگی تو
یہ بھی بھاگ کر کوٹھے سے نیچے اتر آئی اور اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگی۔
گھبر گھا کر مرغی کو ادھر آنگن میں چلتا کیا اور اُسے پکڑنے کے بہانے
چپکے سے خود بھی آنگن میں پہنچ گئی۔ آرٹسٹ پر داسے مست ہو کر ایسی
گہری نیند سو رہا تھا کہ اُسے ذرا خبر نہ ہوئی کیا ہو رہا ہے۔

گوری نے برش اٹھایا اور مصوری شروع کر دی۔ وہ ایک سیٹری
بنا رہا تھا۔ گوری نے اسے سیدھے برش چلا کر اس کا ستیا اس کے
رکھ دیا۔ بنی بنائی تصویر کو لگاڑ دیا۔ نیلے پیلے بے متکلم رنگوں کے پھیلے پھیلے
ایسے چٹاخ ڈالے کہ تصویر کو چھپک نکل آئی۔ اور پھر اس نے آرٹسٹ کے
چہرے پر بھی کھینا چاہا۔ لال رنگ میں برش بھگو کر اس کے ہونٹوں پر رکھا
ہی تھا کہ وہ ہڑبڑا کر چونک گیا۔ گوری نے مرغی کو بغل میں دیا اور کھل کھلا کر

ہنستی ہوئی ہوا ہو گئی۔ اور وہ بھی ہنسنے لگا۔ شری لڑکی۔ اس ہنستی کی شری لڑکی۔
وہ کبھی کبھی یہ سوچا کرتا کہ گوی اتنی شری کیوں ہے؟ اس کے اندر کیا چھپا
ہوا ہے؟ شرارت کے سوا اس لڑکی کو اور کچھ سوچتا ہی نہیں۔ عجیب لڑکی ہے۔
عجیب عجیب شرارتیں کرتی ہے۔ جوانی میں مائی شبو بھی شاید ایسی ہی شری
لڑکی ہوتی ہوگی۔ اور ایک دن تو اس نے مائی شبو سے یہ پوچھا ہی لیا۔
”بوا کیا تم بھی جوانی میں ایسی ہی شرارتیں کیا کرتی تھیں؟“

”نہیں بیٹا۔ میری ماں تو بڑی جدا دھتی۔ ایک بار نہ جانے کیا
شرارت کی میں نے۔ اتنا پی۔ اتنا پی کہ ابھی تک ہڈیاں دکھتی ہیں۔
یہ مودی تو اپنی موسی پر ہے۔ جوانی میں بڑی شری دھتی وہ بھی۔ آفت
کی پرکالی۔ اسی نے اسے کھٹی دی تھی۔“ مائی شبو نے کہا۔

کبھی کبھار فرصت میں جب وہ مائی شبو کے پاس بیٹھ جاتا تو وہ بھی اپنا زریل
لے کر بیٹھ جاتی۔ اُسے آپ بیتیاں، جگ بیتیاں سنایا کرتی۔ زندگی کے دکھ سکھ
اس کی باتوں سے جھانکنے لگتے۔ وہ اس کی باتوں کو بڑے غور سے سنا کرتا۔
اور گوری اس سنجیدہ ماحول میں بھی بڑی سنجیدگی کے ساتھ چپکے سے کوئی
شرارت کر دیتی۔ اور مائی شبو غصے سے کلیلا اٹھتی۔ جو کچھ اس کے ہاتھ
میں آتا دے مارتی۔ ایک دن تو مائی نے طیش میں آکر دال کو تڑکا لگانے
والا لوہے کا کڑ چھا ہی اٹھا لیا۔ مگر آرٹسٹ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔
”یہ لڑکی لگی ہے لگی۔“

مگر اس دن تو گوری نے اُسے پاگل بنا دیا تھا۔ چڑھتی ہوئی دھوپ میں اس نے

اپنے سائے میں ایک اور سایہ دیکھا تو یکدم سناٹے میں آگیا۔ اور کھلاڑی
میں بعد سپاٹ کھڑا ہو گیا۔ گوری مسکرا رہی تھی۔ اس نے آج آنکھوں میں
کا جل ڈالا ہوا تھا۔

”تم بڑی شریہ ہو گوری۔“ آرٹسٹ نے کہا۔

”ڈرا دیا مجھ کو۔“

”کیوں میں کوئی بھیت ہوں۔ چھلاوا ہوں۔“ گوری نے تبسم لہجہ میں

پوچھا۔

”اب کیا معلوم کیا ہو تم۔“ آرٹسٹ نے جواب دیا۔

”میں کیا ہوں؟“ گوری کھل کھلا کر سنس پڑی۔

”بتا دوں گی پر بوندی کے لٹو کھاؤں گی۔ کھلاؤ گے؟“

”کھلا دوں گا۔ کھا لینا۔“ آرٹسٹ نے جواب دیا۔

”شاباش۔ تم بڑے اچھے ہو۔ تم بوندی کا لٹو ہو۔“

”میں؟ بوندی کا لٹو؟“

”معافی دینا بابو۔ زبان گھپلا گئی۔ میں کہتی ہوں بوندی کے لٹو بھی

بڑے ہی اچھے ہوتے ہیں۔ نام لیتے ہی منہ میٹھا ہو جاتا ہے۔“ چٹخارہ

مارتے ہوئے گوری نے کچھ اس طرح سے آنکھیں مٹکائیں کہ اس کی آنکھوں میں

کا جل کے ڈورے بھی مٹکنے لگے۔ اور آرٹسٹ کی نظریں غیر ارادی طور پر

ایک پیڑ کی اُس شاخ کی طرف اٹھ گئیں جس پر تھوڑی دیر پہلے ایک پرندہ

چپک کر پن چکی کی طرف اڑ گیا تھا اور شاخ ہل رہی تھی۔

”بابو وہ جو تم کہتے تھے میری تصویر نہ بنائی تم نے؟“ ذرا توقف کے بعد گوری نے کہا۔

”بناؤں گا۔ ضرور بناؤں گا۔ بڑی اچھی سی تمہاری اک تصویر بناؤں گا۔“ آرٹسٹ نے جواب دیا۔

”لو میں بیٹھ گئی۔ بناؤ اب۔“

”اب۔“

”اور کب؟“

”کل۔“

”کل کس نے دیکھا ہے بابو آج کی بات کرو۔“

”آج مجھے فرصت نہیں ہے۔“

”فرصت ہی فرصت ہے بابو ایسی باتیں نہ کرو۔“

”دیکھو گوری آج میں ایک بڑی ضروری تصویر بنا رہا ہوں۔ گاہک

کئی روز سے پھیرے ڈال رہا ہے۔ اس کا کام آج مجھے

کسر ہی دینا ہے۔“

”تو میرا کام بھی کر دونا آج ہی۔ یہ ٹال مٹول اب نہ چلے گی۔“ گوری

نے کہا۔

”گوری ہسٹ نہ کرو۔“ آرٹسٹ نے کہا۔

”چلو تو ہٹاؤ بابو نہ سہی۔“

”اوہو۔ تم تو روٹھ گئیں۔“

”بس بابو بس۔ اب نہ بلاتا مجھ کو۔“ گوری نے دھمکی دی۔

”رک جاؤ گوری۔ رک جاؤ۔“

”کیوں؟ کیا ہے؟“ گوری نے رک کر تننتے ہوئے پوچھا۔

”اب کیا یاد آیا؟“

”میں تمہیں خفا نہیں کروں گا۔“ آرٹسٹ نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔ یہاں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی تمہاری تصویر بنانا ہوں۔“

”دیکھو بابو اچھی سی بنانا میری تصویر۔“ گوری نے ایک بار پھر کچھ اس

انداز کا جل بھری آنکھیں ملکاتے ہوئے کہا کہ بستی پر دور دور تک پھیلی ہوئی گوری

گوری دھوپ کچلائے لگی۔

پچھم سے کالے کالے بادل آرہے تھے۔ آرٹسٹ دوزنگوں میں

کھو گیا۔ سیاہ اور سپید۔ گوری اور کاجل۔ وہ اس کی تصویر بنانے لگا۔

ہوا کے جھونکوں سے دوپٹہ سر سے سرک جانے پر ڈھیروں کالے

کالے لائے بال اس کے شانوں پر بکھر رہے تھے۔ گوری گوری دھوپ

میں ریشم کے تار معلوم ہو رہے تھے۔ مگر گوری پتھر پر بڑے بھونڈے

انداز سے بیٹھی تھی۔ اچھی سی تصویر بنانے سے پہلے اس کا اچھا سا پوز بنانا

بہت ضروری تھا۔ اس نے اپنے ماڈل کو شانے سے پکڑ کر پہلے تو اس کا

ایک اچھا سا پوز بنایا۔ اور پھر جب اس نے اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے

بالوں کو ہاتھ میں لے کر اس کے سینے پر سجایا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ریشم

کی ملائم جھالروں میں شہنوت کے دوپتے دھڑک رہے ہیں۔ اور اس کا یہ

احساس بڑی سرعت سے بڑھنے لگا۔ گوری کے ریشم بال ریشم کر اس کے گرد اگر دکھومتے ہوئے ریشم کا ایک غنچہ بنانے لگے۔ جس میں وہ بند ہوتا چلا گیا۔

اسے نیند سی آنے لگی۔ کچھ ہو رہا تھا۔ اس کے اندر سویا ہوا کچھ جاگ اٹھا تھا اور اس کی رگ رگ میں ریگنے لگا تھا۔ اُس نے اس ناگوار احساس کو سلانے کے لئے اپنا دھیان رنگوں میں لگانے کی کوشش کی۔ مگر ایسا ایسی اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔ برش بھی کپکپانے لگا۔ رنگ بکھرنے لگے۔ بکھرتے چلے گئے۔ اب وہ کچھ نہیں بنا رہے تھے۔ ان سے کچھ نہیں بن رہا تھا۔ بے معنی — بریکار — بے سرو پا — بے مقصد دھبے — دھند — دھندلکے۔ اُسے سیاہ و سپید دو رنگوں کے آسیب نے دبوچ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں خود بخود مچنے لگی تھیں۔

اس نے کئی بار آنکھیں جھپکیں۔ سر کو جھٹکا مگر نیند کے دھندلکے اس کے ذہن پر جھکتے ہی چلے آئے۔ اور گہرے ہوتے چلے گئے۔ ایک انجانی گھڑا میں اس کے ہاتھ پر پسینے کی بوندیں قطرے لگیں۔ کائیں کائیں کرتے ہوئے کودوں کی ایک ڈار اس کے سر پر سے پچھم کونکل گئی۔ بے مقصد، بے محل وہ مکر یہ ہاتھ رکھے بائیں طرف چلنے لگا۔ حقوڑی دور جا کر دائیں طرف ہو گیا۔ ایک جھاڑی کے پاس پہنچ کر پیچھے گھوما اور لوٹ کر پھر وہیں آگیا جہاں سے چلا تھا۔ گوری ٹھاہ ٹھاہ منسنے لگی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے بابو؟“ اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“

وہ خاموش رہا۔ واقعی اُسے کچھ ہو رہا تھا جو اس کی سوچ سمجھ سے باہر تھا۔ نیند کے اتنے بوجھل باؤل اس پر جھکتے چلے آ رہے تھے کہ اب وہ ان کا بوجھ نہیں سہا رہ سکتا تھا۔ سامنے سے ایک بھانڈا کتارا بجاتا چلا آ رہا تھا گوری جلدی سے سوکھے پتوں کے ڈھیر کی طرف سر کی تو وہ موقع پا کر اپنا کینوس، برش، رنگ اٹھا کر سرپٹ ہو گیا۔ گوری اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ سوچتی ہی رہ گئی یا بوجھ تصویر بناتے بناتے بھاگ کیوں گیا؟

جب وہ ادبے نیچے نیچے کوکھٹوں کے پاس پہنچا تو بندوبستالی کے دروازے کے آگے پھیر لگی ہوئی تھی۔ بندو کی بیوی نے بچہ جٹا تھا۔ دو بیچڑے تالیاں بجاتے ہوئے ساز وں کی آواز سے مل کر گاتے ہوئے ناچ رہے تھے۔
”ہائے میرا دل دھڑکے۔“

وہ رکا۔ دیوار کی اوٹ میں اس نے اوھر جھانک کر لمبا سا سانس لیا تو دفعۃً ایک بیچڑا چک پھیری لیتے ہوئے اپنی کمر کو پکڑ کر ”اوٹی“ کہہ کر یوں بل کھا گیا جیسے اس کی کمر کی کمانی ٹوٹ گئی ہو۔ عین اسی وقت آرٹسٹ کی کمر کھپی بیساختہ ایک جھٹکا سالنگا اور اس نے یوں محسوس کیا جیسے اس کی کمر کا بھی کوئی کارآمد کل پرزہ کڑک کر کے بالکل بیکار ہو گیا ہو۔ عجیب احساس تھا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس نے ایسا کیوں محسوس کیا؟ اس نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچنا چاہا مگر کچھ نہ سوچ سکا۔ نیند کے جھونکے پہلے سے بہت تیز ہو گئے تھے۔ وہ جاگ رہا تھا مگر وہ سویا ہوا تھا۔ وہ نیند میں

چل رہا تھا۔ اس قسم کی یہ اس کی پہلی نیند تھی۔ یہ احساس زندہ گی میں پہلی بار اس میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے ایسا کبھی محسوس نہ کیا تھا عجیب احساس تھا۔ جسے اس کے نامکمل حواس بیان نہیں کر سکتے تھے۔ اپنے گھر میں گھسٹتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اور سو گیا۔

بستی کے ایک عطر فروش نے بالوں کو ریشم کی طرح ملائم، چمکدار اور لمبا کرنے والا ایک تیل ایجاد کیا تھا اور اس کا نام رکھا تھا ”کالی گھٹا ہیر آئل“ جس کی مشہوری کرنے کے واسطے وہ بستی میں منادی تو کرا چکا تھا۔ اور اب وہ اخباروں اور رسالوں میں کالی گھٹاؤں کی تصویر دینے کے لئے کوئی اچھا سا ڈیزائن بنوانا چاہتا تھا۔ جس میں ایک خوبصورت عورت کی تصویر ہو اور اس کے لمبے لمبے بال گھٹاؤں کی طرح ہوں۔

وہ آرٹسٹ کے پاس آیا۔ دیکھا تو دروازہ بند تھا۔ اس نے آوازیں دیں۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اس نے زور زور سے دروازہ تھپتھپایا، کنڈی کھڑکائی تو اندر سٹر سٹر کی آوازیں سنائی دیں۔ کھڑکی دیر میں دروازہ کھلا۔ آرٹسٹ آنکھیں ملتا اور جمائی پر جمائی لبتا ہوا باہر آیا۔ رسمی جملوں کے بعد اس نے آرٹسٹ سے کہا۔

”میں ایک تصویر بنوانا چاہتا ہوں۔“
”کیسی تصویر؟“ آرٹسٹ نے پوچھا۔

”ایک بڑی ہی خوبصورت عورت کی تصویر۔ جس کے بال یہاں

ایڑی تک لمبے، چمکدار، ریشم کی طرح ملائم اور بس کالی گھاسوں نے پوچھا
”بنادو گے ایسی تصویر؟“ عطر فروش نے پوچھا
”کیوں نہ بناؤں گا؟“ آرٹسٹ نے جواب دیا۔

”دراجرت کیا ہوگی؟“ عطر فروش نے پوچھا۔
”یہ بات تصویر تیار ہو جائے گی تو ہوگی۔“ آرٹسٹ نے کہا۔

”پھر بھی کچھ اندازہ تو ہو۔“ عطر فروش بولا۔
”سائیز کیا ہوگا اس تصویر کا؟“ آرٹسٹ نے پوچھا۔

”بس مناسب سائیز۔“ عطر فروش نے کہا۔
”چالیس روپے دے دیتا؟“ آرٹسٹ نے کہا۔

”کچھ کم کرو۔“ عطر فروش نے کہا۔
”رعایت تو میں نے پہلے ہی کر دی ہے۔“ آرٹسٹ نے کہا۔

”یہ نو پینتیس روپے اور بس ٹھیک ہے۔“ عطر فروش نے کہا۔
”چالیس سے کوڑی کم نہ ہوگی۔“ آرٹسٹ نے کہا۔

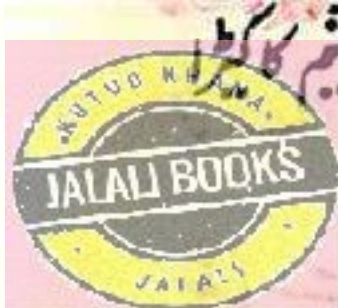
”بڑی محنت کا کام ہے۔“

”چلو میاں چالیس ہی سہی۔“ عطر فروش نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تصویر لا جواب ہو۔ جو دیکھے بس تصویر ہی بن جائے۔“

”تصویر کتنے رنگوں میں ہو؟“ آرٹسٹ نے پوچھا۔

”تصویر اچھی بنے رنگ چاہے جتنے ہو جائیں۔“ عطر فروش نے کہا۔



”اچھا میاں کر دیں گے تمہارا کام“ آرٹسٹ بولا۔

”سنو میں تمہیں ایک مشورہ دیتا ہوں۔“ عطر فروش نے کہا۔

”کیا مشورہ دو گے؟“ آرٹسٹ نے پوچھا۔

”یہاں تمہارے پڑوس میں ایک بھٹیاریں رہتی ہے۔“

”جانتا ہوں۔“

”اس کی ایک لڑکی ہے۔“

”ہاں ہے۔“

”تم نے اُسے دیکھا ہی ہو گا؟“

”دیکھا ہے۔“

”بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ اس کے بال دیکھے ہیں تم نے؟“

”دیکھے ہیں۔“

”بالکل ایسے ہی بال ہوں تصویر میں۔ بال اتنا فرق بھی نہ ہو۔“

”نہیں ہو گا۔“ آرٹسٹ نے بڑے ذوق سے کہا۔

”اور سنو۔“ عطر فروش نے کہا۔

”بس سنی لیا۔ تصویر پرپسوں تیار ہو جائے گی۔“

”پکی بات۔“

”پکی بات۔“

اس کے جاتے ہی وہ پھر رنگوں کے خلا میں لٹک گیا۔ رنگوں کے پھیننے سے سمٹنے سے، رنگوں کے آپس میں گھلنے ملنے سے بہت کچھ بن

سکتا ہے۔ بہت کچھ بن جاتا ہے۔ وہ تصویر بنانے بیٹھ گیا۔ پہلے اس نے چہرہ بنایا۔ چہرے میں بھوئیں، پلکیں، آنکھیں، ناک، ہونٹ۔ رنگ پر رنگ لگاتے ہوئے چہرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے سینہ بنایا تو اس کے ذہن میں کچھ اور ہی بننے لگا۔ سینے پر سجے ہوئے کالے ریشم بالوں کی جھالروں میں شہتوت کے دو پتے دھڑکنے لگے۔ اس کے ذہن میں کچھ اور ہی بننے لگا۔ اور تصویر کچھ اور ہی بن گئی۔ وہ اکتا گیا۔ اُسے بڑی سخت بھوک لگ رہی تھی۔ اس کے اندر چھپا ہوا پیٹوریشم کا کیرا کھانے کو مانگ رہا تھا۔ سب کچھ اسی حالت میں وہیں چھوڑ چھاڑ کر اس نے دروازہ بند کیا اور بستی کے بڑے بازار کو چل دیا۔

پڑوس میں کسی کی چو لہے پر پڑی ہوئی ہنڈیا کا مصالحوہ چل رہا تھا جس کی تکیلی تکیلی دھانس ہوا میں گھل کر اس کے ننھنوں میں اتر گئی۔ بھوک اور تیز ہوئی۔ اس کے اندر ایک عجیب سی کھلبلی مچنے لگی۔ سامنے پڑی پر کیلے بیچنے والا بیٹھا تھا۔ وہ ایک درجن کیلے کھا گیا۔ چلنے لگا تو کیلے کے چھکے پر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اُسے چوٹ تو نہ آئی ڈکار آ گیا۔ بھوک اور تیز ہوئی۔ ایک درجن کیلے اس کے پیٹ میں اترتے ہی نہ جانے کہاں لٹک گئے تھے۔ وہ ابھی اور بہت کچھ کھانا چاہتا تھا۔ اس کے قدموں نے قدرے تیزی پکڑ لی۔ جلدی سے چوک پار کر کے وہ چاٹ داڑے کی دکان پر آ گیا۔ پانچ روپے کی چاٹ کھا گیا۔ مگر وہ ابھی تک بھوکا تھا۔ ساتھ دالی دکان سے کبابوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ ادھر کو سرک گیا۔ تین چار سنجیس اٹھا کر ایک

پورے کباب کا بس ایک ہی لقمہ کیا۔ ایک ڈبل ڈیکر سامنے سرکل پر رکھ دیا۔ گزری۔ چند سواریاں کھڑکیوں میں سے جھانکتے ہوئے اُسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے چار۔ لی چپلن کی کوئی فلم دیکھ رہی ہوں۔ چھ سات سیخیں صاف کر کے اب وہ تھالی میں رکھی ہوئی مولیٰ کا پتہ توڑ کر کھا رہا تھا۔ اس کے بعد اُس نے سمو سے اور گلاب جامن بھی کھائے۔ اور اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کے پیٹ میں ریشم کا پیٹو کپڑا پیٹ بھر کر کہیں سو گیا ہے اور اس کے فوراً ہی بعد اُسے بھی نیند سی آنے لگی۔ وہ گھر کی طرف چل دیا۔ راستے میں ایک لڑکا اُبلے پر دھواں چھوڑتا اُپلا رکھے گنگنا تا چلا جا رہا تھا۔ اُبلے پر ایک اور اُپلا اور اس سے اٹھتا ہوا دھواں۔ دیکھنے میں کچھ نہیں سوچنے میں بہت کچھ تھا۔ اور اُسے پھر اُسی اجنبی احساس کی سوئیاں سی چھبنے لگیں۔ پھر وہی گھٹن۔ بے چینی۔ دھند۔ دھند۔ نیند کا شدید احساس کمرے میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی اور بستر پر لیٹ گیا۔ کھڑکی ہی دیر میں سو گیا۔ اور پورے میں گھنٹے سویا رہا۔

گاہک کو تصویر بنا کر دینے میں صرف ایک دن باقی رہ گیا تھا۔ وہ برش ہاتھ میں لے کر پھر کینوس پر جھک گیا۔ دو تین رنگوں کی آمیزش سے اس نے تصویر میں سینے کا اکھاڑ بڑی چابکدستی سے مکمل کیا تو ایک ایک اس کی نظر کو نے میں لپکتے مکڑی کے جالے پر جا پڑی۔ مکڑی نے ایک مکھی کو اپنے تاروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے برش ہاتھ سے رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر ہلکے ہلکے

کش لیتے ہوئے یہ تماشا دیکھنے کے لئے چہرے کا رخ اس کوئی کی طرف کر لیا۔ مگر نہ دیکھ سکا۔ شہتوت کے پتوں میں ریگتے ہوئے ریشم کے کیڑوں کو دیکھنے کی خواہش اُپے پر رکھے ہوئے اُپے کے دھوئیں کی طرح اس میں پیچ و خم کھانے لگی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے کی طرف چل دیا۔

گندے نالے پر بنے ہوئے لکڑی کے چھوٹے سے پل پر سے گزرتے ہوئے وہ سڑک کے کنارے پر لگے ہوئے سبز جنگل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا بچوں کے سکول کی طرف نکل گیا۔ سکول کے ساتھ ہی ٹوٹی پھوٹی غیر آباد ایک عمارت تھی۔ اس سے ذرا آگے چند دکانیں۔ لکڑی کا ایک ٹال۔ جس کے پچھلی طرف گھاس کے پلاٹ کے کنارے پیپل کا پیڑ۔ جس کے نیچے خانہ بدوش ڈیرہ ڈالے پڑے تھے۔

وہ خانہ بدوشوں کے خیمے دیکھنے کے لئے ایک جگہ رک گیا۔ جو باہر سے بالکل کپڑے کی قبر نظر آ رہے تھے۔ کپڑے کی قبر۔ کپڑے کی اندھیری کوٹھڑی۔ جس میں کوئی ستون، کوئی شہتیر، کوئی کڑی، کوئی دیوار، کوئی کھڑکی نہیں ہوتی۔ بس آنے جانے کو چھوٹا سا ایک راستہ ہوتا ہے۔ جسے دروازہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ زمین میں بانس کی کمان سی چھڑیاں گاڑ کر اس پر پھٹے پرانے کپڑے، چیتھڑے، تپڑ، بوریاں، گھاس پھوس رکھ رکھا کر ایک اندھیری کوٹھڑی بنائی جاتی ہے زندگی بسر کرنے کے لئے۔

وہ سوچنے لگا۔ کتنی عجیب ہیں کپڑے کی یہ قبریں جن میں زندہ انسان

رہتے ہیں۔ روتے ہیں۔ گاتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ اور معاً اس کی نظر کٹر
کی ایک قبر کے دروازے کی طرف اٹھ گئی۔ جس کے اندر ایک خانہ بدوش
جوان عورت سینہ ننگا کئے اپنے ننھے کو دودھ پلا رہی تھی۔ ننھا ماں کا تھن
منہ میں لئے چسکیاں لگا رہا تھا۔

ادھر لکڑیوں کے ٹال میں بھی اس وقت یہی کچھ ہو رہا تھا۔ گائے گتا
کھا رہی تھی۔ اور اس کا بچہ اس کا تھن منہ میں دبائے چسکیاں لگا رہا تھا۔
وہ مسکرایا۔ ایک عورت اور ایک گائے آپس میں کتنی ملتی جلتی ہے۔ اور
ایک عورت اور ایک مرد میں بھی چند مخصوص چیزوں کا فرق ہے۔ اور اسے
یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے سے بھی ایک ننھا چٹا ہوا کچھ ٹوٹ رہا
ہے۔ کتنا عجیب احساس تھا۔ اور وہ مسکرایا اس احساس پر۔ وہ اپنے
آپ پر بھی مسکرایا۔ کتنا حساس تھا وہ۔ ادھر خانہ بدوش عورت کی گود میں
اب اس کا ننھا بھی مسکرا رہا تھا۔

وہ ایک عورت اور ایک گائے کے درمیان کھڑا تھا اور جھانک رہا تھا۔
کبھی ادھر کبھی ادھر۔ اس کے احساس میں ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان
بھی کچھ کھڑا تھا۔ مگر اُسے صاف صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ خانہ بدوش عورت
نے اپنے بچے کو اب نیچے زمین پر لٹا دیا تھا اور ایک ہاتھ سے اپنی چھاتی دبا
دبا کر دودھ کی ننھی ننھی دھاریں نکال رہی تھی، اچھا ل رہی تھی۔ دودھ کی ان
ننھی ننھی پھواروں کے نیچے اس کے ننھے کا چہرہ تھا اور ننھا مسکرا رہا تھا۔ دونوں
ہاتھ پھیلائے غوں غاں کر رہا تھا۔

”باپو اک پیسہ دو۔“

یہ ایک بوڑھے خانہ بدوش کی آواز تھی جو لاکھٹی کے سہارا لئے اس کی پچھلی طرف کھڑا تھا۔ اور وہ جھینپ گیا۔ اپنی ٹھوڑی سینے پر جما کر ایک ہی جھونک میں کافی دور نکل آیا۔

سورج اس کے سر پر آگیا تھا۔ چمکتی دھوپ میں ندی کنارے پیڑوں
کے پتے ہل رہے تھے۔ اب ان میں لالہ لالہ نے رس بھرے شہتوت بھی
لٹک رہے تھے۔ شہد کی مکھیاں ان سے چمٹ کر رس چوس رہی تھیں۔
اس نے پتوں میں جھانک کر دیکھا تو ریشم کے کیڑے آج پھر سو رہے تھے۔
یہ ان کی پانچویں نیند تھی۔ اس سے پہلے وہ انہیں حقوڑے حقوڑے وقفوں
کے بعد چار بار سوتے دیکھ چکا تھا۔ اُس اب آخری نیند باقی تھی۔ اس کے بعد انہوں
نے ریشم کے غنچے بنانے تھے۔ اور پھر ان کو پیرتے ہوئے ان میں سے
”مٹی بن کر اڑ جانا تھا۔“

”بابو۔ جھٹلے بابو۔“ یہ گورمی کی آواز بھتی۔

وہ کپڑے کا جھولا پیٹھ پر لٹکائے اس کی طرف مسکراتی چلی آرہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں خنچل پن کے ساتھ ایک تنکھی تنکھی طنز اور چوٹ بھی تھی۔ اُسے گوری کی آواز اپنے دل پر بھیٹی سی ایک چھلکی معلوم ہوئی۔ وہ پھر شرما گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ گوری کو دیکھ کر شرما کیوں جاتا ہے۔ اس نے اپنے ذہن کے جھروکے میں سے اپنے اندر جھانک کر دیکھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ اور اندھیرے میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے

پیروں تلے مکھیوں کا ایک ہمال سا اڑا اور وہ اس کے ساتھ ہی اڑنے لگا۔
بھرے شہتوتوں سے چمٹی ہوئی شہد کی مکھیاں اب اس کے ایک احساس میں اُسے
اپنے چھتے کے کسی خانے میں موسم کی دیواروں میں بند کر رہی تھیں۔

بے تحاشا بھاگتے ہوئے گھر میں آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اور
بڑی بے چینی میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ عجیب وحشت تھی۔ اس کے اندر کچھ
ہو رہا تھا۔ بڑی تیزی سے کچھ ہو رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا
ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ اس کا سر اس وقت اتنا بوجھل ہو گیا کہ اس کا
جی چاہتا تھا دیوار سے ٹکریں مار مار کر اپنا سر پھوڑے۔ خون بہنے لگے۔
بہتا چلا جائے۔ حتیٰ کہ اس کے سر میں خون کی ایک بوند بھی نہ رہے۔ پھر شاید
یہ بوجھ ہلکا ہو جائے اور اس کے سینے میں جو خونگیں سی ریگنے لگی تھیں ریگنا
بند کر دیں۔

مگر دیواریں کچی تھیں۔ برکھا کے چھینٹے پڑنے سے ان سے سوندھی سوندھی
خوشبو اڑ رہی تھی جس نے جلتی پرتیل کا کام کیا۔ وحشت اور بڑھی۔ اور بڑھی۔
وہ بے بس ہو گیا۔ اسے اپنی کوئی چیز اپنے بس میں معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ گلابی
بہار ہی میں اس کا بدن تپنے لگا تھا۔ وہ پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ اس نے
واسکٹ، قمیض اور بنیان اتار کر پھینک دی۔

دھم سے چار پائی پر گر گیا۔ ننگے بدن کو زور زور سے کھردرے بان پر
رگڑنے لگا۔ رگڑتا رہا۔ ایسا کرنے سے اس کی بے چینی کچھ کم ہو رہی تھی۔ اسے
یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بڑی تیزی سے اس کی کایا کلپ ہو رہی ہو۔ وہ پانی

کیچلی اتار رہا ہو۔ اس کی پرانی کیچلی کے نیچے سے نئی کیچلی جھانکنے لگی ہو۔ اس گوشت میں دھنسنے ہوئے نوکیلے کانٹوں کی نوکیں کوئی جھانویں اور کھرکھرے سے رگڑ رہا تھا۔ تاکہ ان کی چھین جاتی رہے اور وہ سو جائے۔ اور اسی احساس میں وہ اپنے بدن کو کھرکھرے رنگ مال سے باغ پر رگڑتے رگڑتے سو گیا۔ مختلف احساسات جن میں مختلف رنگ گھلتے ہوئے اس کے پوٹوں کو سہلانے لگے۔

مگر ادھر گوری کو نیند نہیں آرہی تھی۔ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے چاند کو منکھی لگا کر دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ بابو نے اس سے ملنا جھانکیوں چھوڑ دیا ہے؟ ابھی تو ایسی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔ کچھ بھی تو نہ ہوا تھا۔ پھر یہ اس کو کیا ہو گیا تھا؟ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا تھا؟ یہ سب کچھ کیا تھا؟ وہ سوچتی رہی۔ سوچتی رہی۔ کتنے ہی سوال۔ کتنے ہی واسے۔ کتنی ہی سوچیں اس کے ذہن میں جاگ جاگ کر سوتی چلی گئیں۔ اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوچوں بھری رات یونہی بیت گئی۔

سویرا ہوا۔ وہ گھر کے کام کاج سے جلدی جلدی فارغ ہوئی۔ پیٹھ پر جھولا لٹکایا اور ایندھن لینے کے بہانے ندی کی طرف چل دی۔ جہاں شہتوت کے پتوں میں اب ایک ادھی چکر چل رہا تھا۔ ریشم کے کیرٹے تتلیاں بن کر اڑتے جا رہے تھے۔ آئسٹ بھی وہاں موجود تھا۔ شاخوں کے سائے میں چپ چاپ کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی اس کے سامنے سات آٹھ ریشم کے غنچے پھٹے تھے۔ جیسے چوڑا باہر نکلنے سے پہلے مرغی کا اندھ پھٹتا ہے۔

بالکل ویسے ہی ریشم کا غنچہ پھٹتے ہی ایک بڑی خوشنما تلی دھنک سے پروں کو پھر پھراتے ہو امیں اڑ جاتی تھی۔

وہ چپ چاپ کھڑا یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور پھر جب ایک ایک اس نے گوری کو دے دے پاؤں اپنی طرف آتے دیکھا تو وہ ندی کے اس پار مٹی کے ٹیلے کی طرف بے تحاشا بھاگ نکلا۔ مگر گوری بھی پھر سے آج سو گند کھا کے نکلی تھی کہ اُس سے یہ پوچھ کر ہی رہے گی کہ وہ جو تم میری تصویر بنانے لگے تھے ادھوی کیوں چھوڑ دی؟ مجھ کو دیکھ کر شرما کیوں جاتے ہو؟ چھپتے کیوں پھرتے ہو؟ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے بے تحاشا بھاگنے لگی۔

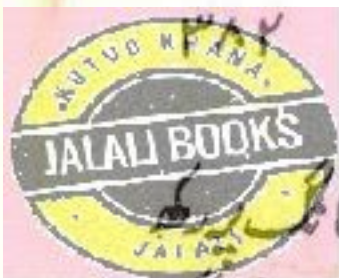
تھوڑی دور جا کر آرٹسٹ نے پچھلی طرف گھوم کر متوحش نظروں سے دیکھا تو وہ اس کے پیچھے بھاگی چلی آ رہی تھی۔ وہ اُس سے زیادہ تیز بھاگ رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ اس کے پاس پہنچ کر اُسے پکڑ لے۔

اب وہ دونوں مٹی کے ٹیلے پر آگے پیچھے چھوٹی سی پگڈنڈی پر جلدی جلدی اوپر چڑھتے جا رہے تھے۔ وہ دونوں ہانپ رہے تھے۔ پسینے پسینہ ہو رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ دھوپ تیز تیز چمک رہی تھی۔ پہلے وہ چوٹی پر پہنچا۔ سانس لینے کو رک گیا۔ راستے میں ایک جاگہ آندھی سے بیڑا کھڑک رہا تھا جسے وہ آسانی سے بھانڈ گیا۔ اس کا خیال تھا گوری کو پیچھے ہی روک دینے کو یہ رکاوٹ کافی ہوگی۔ مگر گوری تو اس وقت توپ کا گولہ ہو رہی تھی۔ زندہ تھی چلی آ رہی تھی۔ چوٹی پر ابھی اس کی چوٹی ہی ابھری کہ وہ پھر بھاگ نکلا۔ ٹیلے کی دوسری طرف یوں سیدھی ڈھلوان پر سے بدھامی میں نیچے اترنے لگا۔ اس کا

خیاں تھا ادھر کوئی راستہ نہ ہونے سے گوری ٹیلے کی چوٹی پر ہی رک جائے گی۔ مگر توپ کے گولے تو بس نشانے پر ہی رکا کرتے ہیں۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ بھی اس کے اوپر سیدھی ڈھلوان پر نیچے کو رینگ رہی تھی۔ اور اس کے کہیں زیادہ تیز۔ وہ بوکھلا گیا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ کس آفت سے پالا پڑا ہے۔ اسی بوکھلاہٹ میں اس کا توازن بگڑ گیا۔ اور وہ ڈھلوان پر سے لڑھکتے ہوئے نیچے کھیتوں میں جا پڑا۔ کچھ کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ سب کچھ وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگے آئے۔ وہ چوٹوں سے نڈھال ہو کر بیہوش ہو گیا تھا۔ لہو اور مٹی سے اس کے کپڑے لت پت ہو رہے تھے۔ اتنے میں گوری بھی وہاں پہنچ گئی۔ کسان اُسے اٹھا کر بستی کے ہسپتال میں لے گئے۔ جہاں ڈاکٹر نے پہلے اُسے ٹیکہ لگایا۔ اور پھر اس کے سر کی چوٹ پر دوائی لگا کر پٹی باندھ دی۔ بس یہی ایک چوٹ ایسی تھی جو اگرچہ زیادہ نہ تھی تو کم بھی نہ تھی۔ بہر حال خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ اُسے اسی وقت چھٹی دے دی گئی۔ مگر آتے ہی اُسے ٹیکے کا اتنا نشہ ہوا کہ دروازہ بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اور اس کے بعد تھوڑی ہی دیر میں اُسے کچھ خبر نہ رہی وہ کہاں ہے۔ اور کس حال میں ہے۔ دن ڈھلا۔ شام ہوئی۔ رات ہو گئی۔ تارے نکل آئے۔ اور گوری بھی چپکے سے گھر سے نکل آئی۔ اس کی ماں سو گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو لمبے لمبے خراٹے لیتے چھوڑ آئی تھی۔ بستی کے دھند لکوں میں ایک سائے کی طرح سرسرا تے ہوئے وہ اس کے گھر پہنچی۔ وہ اسے دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کیسا ہے؟ کہیں کوئی چوٹ اسے زیادہ دکھ تو نہیں دے رہی۔ بیچارا

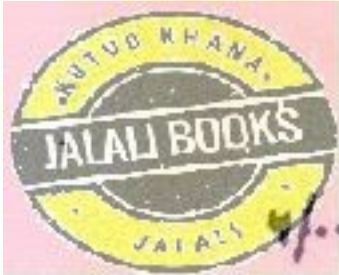
آرٹسٹ۔ کسی تنہائی میں اُگا ہوا تنہا شہنشاہ کا پیڑ۔ اکیلا ریشم کا کیرا۔
 دروازے پر پہنچ کر اس نے ہلکی سی دستک دی۔ کواڑ سے کان لگا کر
 کچھ سنتے لگی۔ کمرے میں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کو اندر
 کی طرف دھکیلا مگر اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ نیم کے پیڑ کے اس پار چاند
 نکل آیا تھا۔ جس میں پوری چمک آنے تک وہ اس کمرے میں گھس جانا چاہتی تھی۔
 تاکہ کوئی اُسے وہاں کھڑا نہ دیکھ لے۔ مگر اندر جانے کو اور کوئی راستہ نہ
 تھا۔ اس نے حافظے پر زور دیا اب کیا کرنا چاہئے تو ایک کھڑکی سی کھٹ سے
 کھلی اس کی کھوپڑی میں۔ دروازے کے اس طرف کمرے میں ایک کھڑکی بھی تھی۔
 جس کے آگے بیر کا بوٹا تھا۔ وہ چپکے سے ادھر چلی گئی۔ کھڑکی کھلی تھی۔ وہ
 مسکرائی۔ اچھل کر کھڑکی میں بیٹھ گئی۔ چاند کی روشنی میں ادھر ادھر جھانک کر
 دیکھا اور چپکے سے کمرے میں اتر گئی۔

ٹیکے کی غنودگی میں اُسے کچھ خبر نہ تھی اس کے پاس کون بیٹھا ہے کھڑکی
 سے اندر آتی ہوئی روشنی میں گوری اس کے چہرے کو بڑے غور سے دیکھتی
 رہی۔ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کا ہاتھ
 سہلاتی رہی۔ گدگداتی رہی۔ چاندنی میں کتنا پیارا دکھائی دے رہا تھا اس کا چہرہ۔
 کھڑکی سے باہر ہوا سے بیر کے بوٹے کی شاخیں ہل رہی تھیں۔ اس کا دل بھی
 اس کے سینے میں بلورے لینے لگا۔ اور اُسے بس کچھ ہو گیا۔ بیٹھے بیٹھائے
 یوں ہانپتے لگی جیسے کالے کوسوں سے بھاگتی آرہی ہو۔ وہ چپکے سے
 اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔ اس کا ہاتھ اٹھا کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اس کے



ہاتھ پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر کر وٹ بدل کر اپنی ٹانگ اس کی طرف
 دی۔ وہ سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ یہ اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں چلائے لگی۔
 کتنے ملائم اور چمکدار تھے اس کے بال۔ جیسے کہ اس کے اپنے بال ملائم اور
 چمکدار تھے۔ اور پھر ہوا کی اک لہری آئی۔ ہیر کے بوٹے کے پتے چھٹکے۔
 اور اس کی کلائی میں چوڑیاں بھی چھٹک گئیں۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ
 اپنے سینے پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اس نے ایک بار پھر اس کے سینے کو ٹٹولا۔
 اُسے جھنجھنی آگئی۔ اس کا تیز تیز چلتا ہوا سانس منجمد ہونے لگا۔ وہ کلبلائی۔
 اور کلبلائے ہوئے اس کے جسم پر ایک کر وٹ سی لے کر اس کے کھلے گویاں
 میں جھانکنے لگی۔ اس کے بند ہونٹ یکدم کھل گئے۔ رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ وحشت
 میں کھڑکی کی طرف بھاگی۔ غلغلے سے جھانکتا ہوا چاند مسکرا رہا تھا۔ ریشم کا کیراٹل
 بن چکا تھا۔

میری لائبریری کا سلسلہ عملی نفسیات



۳/۵۰	لن، یو، تانگ،	جینے کی اہمیت،
۳/۵۰	ڈیل کاریگی،	میٹھے بول میں جادو،
۲/۵۰	ڈیل کاریگی،	پریشان ہونا چھوڑیئے، جینا شروع کیجئے، ڈیل کاریگی،
۲/۵۰	ڈیل کاریگی،	ہائیں نہ مانیں،
۳/۰۰	کیفیتہ واکر، پیٹر فلیچر،	گفتگو اور تقریر کا فن،
۲/۵۰	کیفیتہ واکر،	جنس کا نفسیاتی پہلو،
۲/۲۵	۲۰ سچے واقعات،	جنس کا جسمانی پہلو،
۲/۲۵	ڈاکٹر یوسٹس میسر،	زندگی کے موڑ پر،
۲/۰۰	پروفیسر محمد اکرم طاہر،	شادی اور کامیابی،
۲/۴۵	ڈی کاریگی،	روزمرہ نفسیات،
۱/۵۰	ڈاکٹر مارڈن،	۹۳ بڑے آدمی،
۲/۰۰	۲۳ مقالات،	زندگی اور عمل،
۲/۵۰	محمد اکرم طاہر،	نفسیات اور عمل،
۲/۰۰	ڈاکٹر محمد نعمان ساجد،	دولت نامہ،
۱/۵۰	۲۴ مضامین،	ترقی کی راہیں،
۲/۵۰	جوزف اسے کینیڈیا،	نفسیات کی روشنی،
۱/۰۰	دیباچہ،	تازہ دم رہنے کے گر،
۲/۰۰	۲۴ مضامین،	ہماری عادتیں ہمارے جذبات،
۳/۰۰	سید علی ناصر زیدی،	آپ کے خواب اور ان کے حل،
۳/۴۵	عطا الدیپالوی،	بشر، بشر، شکار کی کہانیاں
۲/۲۵		معلومات کا انسائیکلو پیڈیا،
		علا ل و حرام، قرآن کی روشنی میں،

میری لائبریری میں سلسلہ طنز و مزاح

شفیق الرحمن

۱/۴۵ لہریں

۱/۴۵ پرواز

۳/۴۵ حماقتیں

۳/۰۰ مزید حماقتیں

۱/۵۰ سنگ و خشت

۱/۵۰ شیشہ و تیشہ

۱/۵۰ چمک و ریاب

۱/۵۰ گرد کارواں

۱/۵۰ نرم گرم

۱/۵۰ بال و پر

۱/۵۰ نوک نشتر

کنہیا لال کیپور

۱/۴۵ راجہ صاحب

شوکت تھانوی

۱/۵۰ گرما گرم

اشفاق احمد خان (لطیف)

۱/۰۰

شوکت محمود (کارٹون)

۱/۵۰ چراغ تلے

مشتاق احمد یوسفی

۱/۲۵ دغا باز

کارلو گولڈونی

۲/۰۰ اندیشہ شہر

احمد جمال پاشا

۵/۵۰ اردو کا بہترین انشائی ادب

ہر تہ ڈاکٹر و جید قریشی

اردو میں شخصیت نگاری

" "

اردو کا بہترین طنز و مزاح

" "